ہر گھر کی زینت

ماہنامہ

دوشیزہ

کراچی

February

2015

سالگرہ نمبر 2

باتیں ملاقاتیں

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

سالگرہ نمبر-2

انتخابِ خاص

رنگِ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......720 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی 7-OB تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

حرفِ آخر

معجزاتی اڑانوں کے اِس عہد میں بھی کچھ ایسا ہے جو اب تک بہت پراسرار ہے؟ ہاں ہے، بالکل ہے۔ یہ سمندر، یہ درخت، یہ قدیم دروازے، یہ شام کا جھٹ پٹا...... یہ منظر یکدم تبدیل ہوتے شام وسحر اور یہ نیلگوں آسماں، جھمکوں کی طرح جُھولتے جھرنے، موس میں اُگتا موسمی پیڑ۔ بل کھاتی، مڑتی، بہتی ہوئی شاخیں۔ آسماں سے گرتے ہوئے سفید سفید برف کے بیج۔ سب پراسرار ہیں۔ اب بھی قیدی بادشاہوں کی سرگوشی میں ڈوبی سسکیاں قلعوں کے منہ بند قدیم دروازوں میں گونجتی ہوئی، پراسراریت کی چادر اوڑھے بکھری پڑی ہیں۔ سب لوگ اپنے اپنے جسموں کی قبروں میں مٹی اوڑھے چل پھر رہے ہیں۔ ہیں نا یہ بھی پراسرار۔

انسان نے ماہ وانجم کو تسخیر کرلیا، مگر پراسراریت تو اب بھی باقی ہے۔ جانے کتنے ہزار نئے چاند، سورج اور ستارے آدم کے لمس کے منتظر ہیں۔ کوئی چیز بھی حرفِ آخر نہیں۔

سائنسی علم وعرفان کے اِس دور میں کوئی بھی ترقی کی رفتار نہیں روک سکتا۔ حرفِ آخر کوئی چیز نہیں۔ ہم بھی تو اِس زمین کے کسی اَن دیکھے جزیرے پر موجود ہیں۔ معلوم یا نامعلوم کچھ نہیں پتا...... لیکن آہستہ آہستہ یہ جزیرہ ایسا ہوتا جارہا ہے، جس کے چاروں طرف خون کا سمندر ہے۔ اس جزیرے کے سب پنچھی زخم زخم وجود لیے آہستہ آہستہ اجڑتے پیڑوں پہ پناہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ حرفِ آخر کچھ بھی نہیں۔

مگر کیا واقعی حرفِ آخر کچھ بھی نہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کا جواب ضرور ہر کوئی ڈھونڈ رہا ہے؟

کاشی چوہان

آغازِ سفر

منورہ نوری خلیق

زادِ راہ

ہم میں سے شاید ہی کوئی ہو گا جو یہ سطریں پڑھتا ہو گا اور اسے اچھائی اور برائی کے بارے میں معلوم نہ ہو۔ اسراف اور میانہ روی کے بارے میں معلوم نہ ہو مگر اس کے باوجود ہماری عملی زندگیاں اسلام کے ان عظیم اسباق سے خالی نظر آتی ہیں۔ آخر کیا وجہ تھی کہ......

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

آج ذرا ہم اپنی زندگیوں پر نظر دوڑائیں جینے کا مقصد صرف ایک ہی نظر آتا ہے کہ کسی طرح عالیشان مکان، کوٹھی یا بنگلہ بنا لیں اور جنہیں اللہ نے عالیشان مکان دیے ہوئے ہیں۔ وہ اس فکر میں غلطاں رہتا ہے کہ میں اس مکان کو مزید عالیشان کیسے بناؤں۔ اسراف کے دریا ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی میں ہم نے بہا رکھے ہیں۔ نافرمانی کے ماہر تیراک بنے بیٹھے ہیں۔ سوچتے سمجھتے ہیں کہ کبھی نہیں ڈوبیں گے۔

شریعت ہمیں پختہ مکان بنانے کی اجازت ضرور دیتی ہے مگر ضرورت کی حد تک مکان اور اس کی سہولیات اتنی کافی ہیں جن کے سہارے زندگی کے سرد و گرم عزت و آبرو سے کٹ سکیں بے جا آسائش و آرام اسراف کے زمرے میں آتا ہے اور اسراف سراسر ہلاکت ہے۔

اسراف پورے معاشرتی نظام کو بھی درہم برہم کرتا ہے۔ دولت کی تقسیم عدم توازن کا شکار ہوتی ہے۔ جس نمود و نمائش پر آپ خوش ہو کر اپنی شان بڑھا رہے ہوتے ہیں، اس نمائشی شان و شوکت کو دیکھ کر بہت سے محروم لوگ حسد و رقابت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

جب وہ جائز طریقوں سے ان آسائشات کو حاصل نہیں کر سکتے تو ناجائز راستے اپناتے ہیں۔ رشوت خوری ہونے لگتی ہے، چوری، ڈاکہ زنی، لوٹ مار عام ہو جاتی ہے۔ ہمارے آج کے معاشرے میں جو لوٹ کھسوٹ کا عمل عام ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ امراء اپنے مکانات اور اپنے رکھ رکھاؤ کے ذریعے مال و دولت کی بے پناہ نمائش کرتے ہیں، جس سے محروم اور غریب لوگوں میں بھی ان چیزوں کو حاصل کرنے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اس کے لیے جائز و ناجائز کو پسِ پشت ڈال کر ہر وہ طریقہ اپناتے ہیں کہ بس جس سے دولت کا حصول ہو جائے۔

ہم میں سے شاید ہی کوئی ہو گا جو یہ سطریں

پڑھتا ہوگا اور اسے اچھائی اور برائی کے بارے میں معلوم نہ ہو۔

اسراف اور میانہ روی کے بارے میں معلوم نہ ہومگراس کے باوجود ہماری عملی زندگیاں اسلام کے ان عظیم اسباق سے خالی نظر آتی ہیں۔ آخر کیا وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ ' اللہ کے رسول ﷺ بس ذرا سے خفا ہی ہو جاتے تھے تو انہیں اپنی زندگی بے کار لگنے لگتی تھی اور وہ اس بات کی جستجو کرتے تھے جس کی بنا پر حضورؐ خفا ہیں اور اگر حضورؐ کسی بات کے بارے میں منع فرما دیں تو وہ تو صحابہ کرام کے لیے پتھر پر لکیر ہو جاتی تھی۔

دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے مگر صحابہ حضورؐ کے فرمان سے بال برابر نہیں ہٹتے تھے۔ ان میں یہ حوصلہ' یہ ہمت صرف اور صرف سچی اور پاک محبت رسول ﷺ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کے دل عشق رسول ﷺ کے جذبے سے معمور تھے۔ وہ تو حضور کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کے کان ہر وقت سرگوشی رسول ﷺ سننے کے لیے بھی ہمہ وقت چوکس و تیار رہتے تھے۔ یک جنبش ابرو وہ اپنی جانیں حضور ﷺ پر نچھاور کر دیا کرتے تھے۔

ایک صحابہ حضرت زید بن دشنہ رضی اللہ تعالیٰ کو غزوۂ احد کے کچھ عرصے بعد کفارِ مکہ نے دھوکے دہی سے قید کرلیا۔ انہیں صفوان بن امیہ نے پچاس اونٹوں کے بدلے خرید لیا تا کہ وہ اپنے باپ امیر بن خلف کے بدلے میں انہیں قتل کر سکے۔ جب انہیں شہید کیا جانے لگا تو ابوسفیان نے کہا۔

''اے زید خدا کی قسم سچ کہنا' کیا تم یہ بات منظور کرتے ہو کہ تمہاری جگہ محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا جائے اور تم اپنی جان بچا کر واپس چلے جاؤ اور اپنی بیوی بچوں کے درمیان عیش و عشرت سے رہو۔'' (نعوذ باللہ)

حضرت زید بن دشنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایمان افروز جواب سنیے۔ جنہیں تاریخ نے سنہرے الفاظ سے اپنے سینے پر رقم کیا ہے۔ حضرت زیدؓ نے فرمایا۔

''تم میرے قتل کی بات کرتے ہو۔ خدا کی قسم مجھے یہ بات بھی گوارہ نہیں کہ محمد ﷺ کو ایک کانٹا بھی چبھے اور میں اپنے گھر میں آرام سے رہوں۔''

ابوسفیان یہ جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔

قریش کہنے لگے کہ محمد ﷺ کے ساتھی جتنی ان سے محبت کرتے ہیں اس کی نظیر ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ سبحان اللہ لیکن ان ظالموں نے حضرت زیدؓ کو تلواروں اور نیزوں سے چھلنی چھلنی کر کے شہید کر دیا۔ (ابوداؤد)

غزوہ احد میں مسلمان شہداء کی خبریں مدینہ کی گلیوں میں پہنچ رہی ہیں ایسے میں ایک صحابیہ خاتون دیوانہ وار دوڑی میدانِ جنگ کی طرف جاتی ہیں۔ راستے میں کوئی ملا تو اس سے پوچھتی ہیں۔

''بھائی مجھے یہ تو بتاؤ حضورؐ کیسے ہیں؟ وہ جواب دیتے ہیں تمہارے والد کو شہید کر دیا گیا ہے۔ یہ صبر سے تسبیح پڑھتی ہیں اور بے قراری سے دوبارہ حضور کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ اتنے میں کوئی انہیں بتاتا ہے کہ بی بی تمہارے شوہر بھی شہید ہو گئے ہیں۔

حضور کی یہ غلام بے قرار ہو کر پوچھتی ہے۔ میرے آقا کے بارے میں بتاؤ وہ کیسے ہیں؟ مگر ابھی تو عشق و محبت کے امتحان اور باقی ہیں کوئی بتاتا ہے کہ بی بی تمہارا بھائی اور تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا ہے۔ وہ کہتی ہیں مجھے میرے حضور کا بتاؤ' وہ کیسے ہیں۔ کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو دوڑی

دوڑی احد کے میدان میں جا پہنچتی ہیں۔ سامنے ہی حضور ﷺ کے رُخِ روشن کی زیارت ہو جاتی ہے۔ اس میدان میں ان کے باپ، ان کے شوہر، بیٹے اور بھائی راہِ خدا میں سر کٹائے پڑے ہیں یہ ان کی طرف نہیں جاتیں سیدھا دامنِ مصطفیٰ کی طرف جاتی ہیں۔

حضور کا دامن تھام کر عرض کرتی ہیں ''یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان جب آپ زندہ و سلامت ہیں تو مجھ پر کوئی تکلیف اور ہلاکت بھاری نہیں ہے۔''

(سبل الہدیٰ، تاریخ خمیس)

صحابہ کرام کی زندگیاں حضور ﷺ کی محبت سے عبارت تھیں۔ حضور جیسا جیسا فرماتے جاتے تھے ان کی زندگیاں اسی قالب میں ڈھلتی جاتی تھیں۔ آج بس اتنا ہی کہنا ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لیجیے اور اپنی زبان کا محاسبہ کیجیے جو بار بار حضور کو برملا رسول ﷺ سے محبت کرنے والا بتاتی ہے۔ اس سے پوچھیے کہ اے میری زبان کیا تو نے میرے اندر ایسا عمل بھی دیکھا ہے جو محبت رسول کا مظہر ہو۔

ایک نو مسلم اعرابی آیا اور اس نے نظر بھر کر بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرف دیکھا اور کہا ''کاش میں ان کا مالک ہوتا۔'' اسے خبر نہ تھی کہ وہ شہنشاہِ دو عالم ﷺ کی بارگاہ میں کھڑا ہے۔ رسول ﷺ نے وہ ریوڑ اس کے حوالے کر دیا۔ وہ اعرابی ہکا بکا کبھی اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھتا اور کبھی اپنی تنگ دامانی کو دیکھتا۔ آخر جب اسے یقین آ گیا کہ یک جنبشِ لب پر وہ اتنے بڑے ریوڑ کا مالک بنا دیا گیا ہے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعریف بیان کرتے ہوئے خوشی خوشی وہاں سے روانہ ہوا۔

یہ غزوہ حنین کا موقع تھا۔ اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مالِ غنیمت کی اتنی کثرت سے نہیں نوازا تھا۔ مالِ غنیمت کے ڈھیر جتنے بلند تھے ہادیٔ برحق ﷺ کا دستِ مبارک اتنی سرعت سے انہیں تقسیم کرنے میں مصروف تھا۔

اس دوران انصارِ مدینہ کے بعض نوجوانوں کو شکایت پیدا ہوئی کہ نبی کریم ﷺ مال کی تقسیم میں انہیں نظر انداز فرما رہے ہیں۔ انہیں خیال گزرا کہ چند دن قبل فتح مکہ کے بعد جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے ان کی اسلام کے لیے اتنی قربانیاں نہیں ہیں لیکن انہی نو مسلموں کو مالِ غنیمت میں سے زیادہ حصہ دیا جا رہا ہے جب کہ اسلام کے لیے ہم نے تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا لیکن ہمیں ان کے مقابلے میں بہت کم دیا گیا ہے۔ انہیں مال کے کم ملنے سے زیادہ اس بات کا احساس ہوا کہ رسول ﷺ کی نظرِ اقدس میں ان کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔

انصارِ مدینہ کو اداسی اور یاسیت نے گھیر لیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ان کی یہ کبیدہ خاطری کہاں چھپی رہ سکتی تھی چنانچہ آپ نے انصار کو بلوایا۔ جب انصار ایک جگہ جمع ہو گئے تو اللہ کے حبیب حضرت محمد ﷺ ان کے درمیان جلوہ افروز ہوئے۔

انصار کے چہروں پر اداسی نمایاں تھی۔ آپ ﷺ نے انصار کی جانب محبت پاش نظروں سے دیکھا اور فرمایا ''اے گروہ انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ تو مال و دولت کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر واپس جاؤ؟''

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہی تھے کہ انصار کی چیخیں نکل گئیں۔ شمع

رسالت کے پروانوں میں نعرۂ مستانہ بلند ہوا اور وہ زور دار ہچکیوں سے رو پڑے یہاں تک کہ ان کے داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ سب نے بے اختیار ہو کر کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہم راضی ہیں۔ (زاد المعاد جلد 3)

یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اپنے آقا و مولا ﷺ سے بے پناہ محبت کی ادنیٰ مثال ہے۔ ان کی نگاہ میں سیم و زر کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ تو محبتِ رسول ﷺ کی لازوال دولت سے مالا مال تھے۔

یہ شکایت عام سننے کو ملتی ہے کہ ہمیں اسلامی احکامات کے بارے میں علم تو ہے مگر نہیں ہو پاتا' سستی رہتی ہے۔

اسلام کے سچے اور ہدایت یافتہ احکامات پر عمل کرنے کا آسان سا نسخہ ہے اور وہ ہے کہ رسول ﷺ کی سچی محبت کو اپنے دلوں میں بسائیے۔ اس کے بعد ایسا ہو گا کہ ہر عمل کے بعد آپ کو خیال گزرے گا کہ کہیں یہ عمل میرے حضور ﷺ کو ناپسند نہ ہو' کہیں میرا یہ کام سنت کے خلاف نہ ہو جائے۔

حضور ﷺ سے محبت ہی ہماری تمام دنیاوی اور اخروی پریشانیوں سے نجات کا حل ہے۔ حضور ﷺ سے قلبی محبت کا طریقہ اہلِ طریقت کے ہاں کثرت سے درود شریف کا پڑھنا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

''جنت میں میرے سب سے قریب وہ شخص ہو گا جو کثرت سے مجھ پر درود پڑھتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ میرے اور آپ کے دل کو عشق رسول ﷺ سے روشن فرمائے' آمین بجاہِ النبی الکریم۔

☆☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ، خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 88-C II۔ خیابانِ جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

پیارے ساتھیو!

نئے سال کا آغاز جس کرب اور اذیت کے ساتھ ہوا تھا، خدا نہ کرے ایسا پھر کبھی کوئی سال کلینڈر کے سینے پہ طلوع ہو۔ سچ ہے صبر دینے والی ذات بہت طاقتور ہے۔ خدا تعالیٰ نے آرمی پبلک اسکول کے سانحے کے بعد پاکستانی قوم کو صبر تو عطا کر دیا لیکن...... بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے لڑتا ہے...... یہ نغمہ ہمارے بچوں کے حوصلوں کو چٹان اور کردار کو قوی کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ مولا اِن نونہالانِ ملت کو اپنی امان میں رکھنا کہ یہ پودے ہی کل کے تناور درخت ہیں جو پاکستان کا مستقبل ہیں۔ ماہِ فروری محبت کے مہینے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپس میں محبتوں کے گلاب اُگائیے، تعصب اور نفرت کے ببول جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اِس وقت اِس ہی عمل کی ضرورت ہے۔ محفل کا آغاز کرتے ہیں، دیکھتے ہیں اِس ماہ ہمارے ساتھیوں کی کیا خبریں ہیں۔

☆ ہماری ہر دلعزیز ساتھی شگفتہ شفیق کی صاحب زادی ڈاکٹر کنزل شفیق گزشتہ ماہ نکاح کے بندھن میں بندھ گئیں (بہت بہت مبارکاں)

☆ ہماری دیرینہ ساتھی اور سابقہ ایڈیٹر فریدہ مسرور کو 17 فروری کو سال گرہ کی بہت مبارک باد۔

☆ ہماری عزیز ساتھی لکھاری صدف آصف کو 11 جنوری کو سال گرہ مبارک۔ (دیر سے مبارک باد کے لیے معذرت)

☆ ہر دلعزیز رضوانہ کوثر کی کزن کا جواں سال بیٹا اچانک انتقال کر گیا۔ خدا سے اُن کے لیے صبر کی دُعا ہے۔

✉: مظفر گڑھ سے ہماری ہر دلعزیز لکھاری ساتھی دردانہ نوشین خان اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل میں موجود ہیں۔ لکھتی ہیں 2014ء کا اختتام (دسمبر) پاکستان کے لیے کربناک تھا۔ میری ذاتی زندگی کے لیے انتہائے آزمائش رہا۔ 23 دسمبر کو میرے شوہر ارشد حفیظ مخدوم کو ہائی شوگر کے سبب برین اور پھر ہارٹ اٹیک ہوا۔ چھ دن تک نشتر اسپتال ایڈمٹ رہے۔ میں اُن کے ساتھ رہی۔ یہ وہ دن تھے جو میرے اور بچوں کے دل و دماغ کو ہلا گئے۔ دانیال (بیٹا) لاہور اپنے آفس میں تھا جب اُس کو رشنا (میری دوسری بیٹی) نے فون پر صبح 9 بجے روتے ہوئے بتایا کہ ابی کو کچھ ہو گیا ہے۔ انہیں ایمبولینس میں لے گئے ہیں۔ دانی نے بعد میں بتایا کہ ''کچھ ہو گیا ہے'' کے لفظ نہ تھے ایک بم تھا جو میرے کانوں میں پھٹا۔ وہ آفس سے گاڑی لے کر نکلا اور چھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ملتان

اسپتال پہنچ گیا۔ بنٹی (بڑی بیٹی) اور اُس کے میاں عدیل ملتان ہوتے ہیں۔ عدیل، دانی، دانی کا دوست سمیع گیلانی اور سلمان چاروں لڑکوں نے جانفشانی سے دن ورات پاؤں پر کھڑے رہ کر تیمارداری کی۔ رشنا اور چھوٹی چینی (جو اسکول میں پڑھتی ہے) گھر پر تھیں۔ رات کو اُن کے ہم عمر خالہ زاد بہن بھائی آجاتے، دن کو ملازمہ اور بچیاں ہوتیں۔ درود تنجینا کے جگہ جگہ ہزار تسبیح والے ختم ہوئے۔ سب نے بہت اور صدق دل سے دعائیں کیں۔ ارشد کے سارے عزیز اقارب۔ دوست، بینک کولیگ چکر لگاتے رہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ روبصحت ہوئے۔ دواؤں احتیاط کی لمبی فہرست کے ساتھ گھر آگئے۔ چھ دن زندگی جیسے تھم گئی تھی۔ وقت تکون کے چوتھے کونے میں گم ہوگیا تھا۔ جتنی دُھند اور سردی باہر تھی اُتنی ہی دُھند ذہن پر تھی۔ یوں لگا کہ اصل حیات کچھ اور ہے۔ فنون لطیفہ، ادب مشاغل سب ثانوی ہیں۔ ایک زندگی وجودی زندگی ہے اور دوسری آدرشی زندگی۔ انسان وجود سے پہچانا جاتا ہے ماں کے بطن میں پرورش پاتا بچہ کوئی تشخص شناخت نہیں رکھتا۔ عبادات، جوابدہی، فرائض سب وجود سے منسلک ہیں۔ تکالیف، راحت، اذیت کا دارومدار جسم پر ہے۔ تخیل ایک حسین احساس ہے ارضی زندگی دراصل وجودی زندگی ہے۔ فینٹیسی کے سبز باغوں کو وجود کی ایک کراہ بھسم کردیتی ہے۔ انسان کے عمر کے کسی بھی حصہ میں اتنا خوبصورت، لطیف اور مصفا نہیں ہوتا جتنا وہ خود کو خیال کرتا ہے، وہ تخیل رومان فینٹیسی جسے ہم آئیڈیلائز کرتے ہیں۔ اس سے جنت Heaven کو سجایا گیا ہے۔ میں نے پڑھا تھا کہ کسی درویش نے کہا تھا کہ بندے کو بندگی کے لیے طویل عمر تھوڑی ہے۔ غور کیا جائے تو سولہ آنے سچ ہے۔ بندگی میں عبادت، عبادت کے لیے مناسب صحت، ذہنی سکون، کسبِ حلال اور اللہ کی مخلوق کی فلاح کی دُھن شامل ہے۔ یہ دُھن کیا ہے؟ یہ کبھی کبھار گداگر کو 5، 10 روپے دے دینا، ملازمہ کو اترن دے دینا یا مسجد میں چندہ دے دینا نہیں ہے۔ دُھن یہ ہے کہ بندہ اپنے مال سے حدِ آخر تک، ہاتھ پاؤں ذہن کی خدمات سے تاحد ممکن اور اخلاقیات سے ہر لمحہ...... انسانیت اور مخلوق کی فلاح کے لیے جُتا رہے، اللہ کی ولایت کی یہی پگڈنڈیاں ہیں، بات طویل ہوگئی

ہے۔ رسالے کی طرف آتی ہوں۔ دوشیزہ جنوری 2015ء ملا۔ دوشیزہ کو مکمل نہیں پڑا۔ فرزانہ آغا کا گزشتہ ماہ شائع ہونے والا ناول خوبصورت تھا۔ میں فرزانہ کو فون کر کے بتانا چاہتی تھی۔ فون کیا مگر اُدھر سے ڈسکنکٹ ہوگیا۔ نیرّ شفقت کا افسانہ 'عورت اور بلی' اقبال بانو 'ڈولی' اور فرزانہ آغا 'اک کوہ گراں' رضیہ مہدی 'قصاص' اور نگہت نسیم 'ابوپاری' پڑھے ہیں۔ الگ الگ تبصرہ ادھار رہا۔ سب ہی اچھے تھے۔ دلشاد نسیم اور نگہت نسیم کو والدہ صاحبہ کی تعزیت کے ساتھ صدق دل سے دُعائے مغفرت کرتی ہوں۔ ماں کا کوئی بدل نہیں...... مگر صبر کے سوا چارہ نہیں۔ باقی رسالہ نہیں پڑا۔ محفل میں اُم جلال بخاری صاحبہ کا مکتوب پڑھا تو جانا کہ یہ تبسم یہ تکلم تری عادت تھی جسے ہم اپنے لیے مخصوص سمجھے تھے۔ 'چشم قاتل چشم آہو'...... سب کو خوش کرتی ہیں سلامت رہیے، خوش رہیے۔ نسیم نیازی کو کتاب کی مبارکباد مگر مجھے کتاب کیوں نہیں بھجوائی؟ احمد سجاد بابر نے اپنی حمد یہ کتاب ''ردائے شب پہ ستارا جھلمل'' ارسال کیا ہے۔ اُس پر لکھنا ہے۔ ثمینہ عرفان کا خط سانحہ پشاور کے کرب سے لبریز تھا۔ پاکستان کی ساری ماؤں کا اس دُکھ پر دل خون روتا ہے۔ اللہ پاک ضرور ان دہشت گرد ظالموں، کافروں کو اس دُنیا میں رسوا اور آخرت میں جہنم واصل کرے گا، انشاء اللہ...... یہی لوگ اسفل سافلین ہیں۔ احمد سجاد بابر کا تبصرہ دبنگ تھا۔ شاہدہ ناز قاضی کی واپسی اچھی لگی۔ ایک افسانہ پہلے سے لکھا رکھا تھا بھجوا رہی ہوں۔ سانحہ پشاور پر نظم بھی ارسال ہے۔

ﻫ: دردانہ جی! آپ کے خط نے جہاں خوشی دوچند کر دی وہیں دکھ سے ہمکنار بھی کیا۔ مخدوم بھائی کی صحت یابی کے لیے دعائیں۔ یہ افسانہ تو شائع ہوا دوسرا جلد ارسال کیجیے۔

✉: کراچی سے ہماری بہت عزیز قاری ساتھی شاہدہ شکیل لکھتی ہیں۔ مدیرۂ اعلیٰ، منزّہ سہام مرزا اور مُدیر کاشی چوہان سلام اور دُعائیں۔ ابھی ابھی اسکول سے واپس لوٹی تو گھر کا دروازہ کھولتے ہی **Registered Book Post** سے 'دوشیزہ' کا سال گرہ نمبر رکھا ہوا دیکھ کر خوشی و سرشاری کی ایک لہر سی دوڑ گئی کہ مجھے 'یاد' رکھا گیا۔ 'دوشیزہ' اور 'سچی کہانیاں' کے آفس میں کام کرنے کا مختصر سا 'عرصہ' بھی میری زندگی کا سرمایۂ حیات ہے۔ تمام کارکنان کی محبت اور خلوص کی دل سے مشکور اور ان کے لیے دُعا گو ہوں۔ آفس کی تبدیلی، اللہ کرے آپ سب کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ثابت ہو۔ آمین۔ (ابھی ابھی منزّہ سے فون پر بات کر کے اپنی نیک خواہشات اور دُعائیں پہنچا چکی ہوں) کاشی بیٹا! اللہ تعالیٰ آپ سب کو ترقی کی منزلوں پر گامزن کرے اور بد نظر سے بچائے، آمین۔ منزّہ نے آفس آنے کی دعوت بھی دی ہے۔ بشرطِ زندگی، کبھی بھی آجاؤں گی۔ انشاء اللہ۔ 'دوشیزہ' کو 42 برس مکمل کرنے پر مبارکباد۔ 'اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ' کاشی بیٹا! آپ کی خالہ مرحومہ کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین۔ اس کے ساتھ ہی خوبصورت تحریروں کی مالک، دلشاد نسیم کی والدہ مرحومہ کے انتقال پر ان کے دُکھ میں شریک ہوں، رضوانہ پرنس کی والدہ مرحومہ بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اِن تمام کے دُکھ کا اندازہ مجھ سے زیادہ کون کرے گا؟

'ممنون ہوں میں، جہاں کے نشیب و فراز کی اکثر بگڑ کے خود میری حالت سنبھل گئی'

کاشی بیٹا! جیتے رہو! خوش رہو! 'دوشیزہ کی محفل'۔ رابطوں کی خوبصورت اور دلفریب محفل میں شمولیت کے ساتھ ساتھ دو تحریریں بھی بھیج رہی ہوں۔

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

جنوری 2015 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''ڈولی'' اقبال بانو

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ فروری 2015

عنوان:

قلم کار:

نام:

پتا:

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

ھ: اچھی آنٹی! آپ کی محبت کے ہم خود گواہ ہیں۔ تبصرہ پاکر جی میں بہت اچھا لگا۔ امید ہے آپ اب ہر ماہ ہمیں اس خوشی سے سرفراز کریں گی۔

✉: کراچی سے ہماری عزیز قاری اور شاعرہ ثمینہ عرفان لکھتی ہیں۔

بہت ہی محترم کاشی، خدا کرے کہ تمہارا قلم کبھی خاموش نہ ہو، تمہاری تحریر جگنوؤں کی طرح روشنی بکھیرتی رہے۔ تمہارے جذبات کا امین شعر تمہاری پوری تحریر کا حامل تھا۔ اس نئے سال اور آنے والے ہر سال تمہاری تحریر کو عروج نصیب ہو۔ تم سے فون پر بات کرکے اچھا لگا، گفتگو کی روانی میں تم اپنے ہی بھائی لگے۔ زندگی خوشیوں اور غموں کی آماجگاہ ہے۔ جو لوگ شادی کے بندھن میں بندھے ہیں اُن سب کو میری طرف سے بہت مبارک باد۔ صحنِ چمن میں کھلنے والے نئے پھولوں کی مبارک باد۔ پرانے پھول جو اپنی تحریروں سے خوشیاں اور خوشبو پھیلا رہے ہیں، ان سب کو ان کی سال گرہ پرپُر خلوص مبارک باد۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ ہم نے بھی سوچا ہے کہ اس بار ہم بھی اپنی تاریخ پیدائش بھیج دیں، تاکہ تخلیق کے پورے 9 مہینے پر ہم بھی آپ سب کی مبارک باد وصول کریں، اور یادداشت کا امتحان، کیونکہ ہم 'شاعری' والے لوگوں کی کوئی 'شنوائی' تو ہے نہیں۔ کہاں کسی کو یاد رہے گی، 5 اکتوبر۔ وہ لوگ جن کے پیارے ان سے بچھڑ گئے، ان پیاروں کے لیے خدا سے ان کی مغفرت کی دعا۔ اللہ تعالیٰ اُن کے لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ مسز نوید ہاشمی کی دلجوئی کا بہت بہت شکریہ، خطوط مختصر لکھنے کی تلقین کے ساتھ ہی محترم احمد سجاد بابر کا طویل خط پڑھ کر اچھا لگا۔ انہوں نے افسانوں پر جو تبصرے کیے ہیں وہ ایک بہترین نقاد کی صاف گوئی پر مشتمل ہیں۔ لیکن میرے محترم احمد سجاد بابر صاحب، آپ افسانے کے اس انداز کو روایتی کہیں بس، لیکن آج بھی ہمارا معاشرہ جو صرف اور صرف مردوں کا معاشرہ ہے۔ مرد کتنا ہی پڑھ لکھ جائے عورت کو دوسرے درجے کا شہری ہی گردانتا ہے۔ عورت آج بھی ظلم و زیادتی سہہ رہی ہے اور عزتِ نفس کا قتل تو صبح و شام سہتی ہے۔ ہاتھ کا زخم بھر جاتا ہے لیکن زبان کا نہیں اور یہ زخم مرد سے وابستہ ہر رشتے سے عورت کو ملتے ہیں۔ منشا پاشا کا انٹرویو اچھا لگا، زندگی گلزار ہے، میں پیاری سی بہن کا کردار بہت اچھا لگا۔ منی اسکرین کے متعلق کیا کہا جائے۔ جو تھوڑا چارم رہ گیا تھا اب م ش خ کی آمد سے پھر سے ختم ہو جائے گا۔

چپ رہتے تو دم گھٹتا اور درد سوا ہوتا
کچھ منہ سے نکل جاتا تو کوئی خفا ہوتا

جن ڈراموں کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ڈرامے ہماری تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار ہیں، تو کوئی ان سے یہ پوچھے کہ آپ اپنے ڈراموں میں جو کچھ دکھا دیتے ہیں وہ سب ہمارے ملک کے کتنے فیصد گھرانوں میں ایسا سب کچھ ہوتا ہے۔ 'م ش خ، معذرت کے ساتھ 'بے لاگ' تبصرہ محترم احمد سجاد بابر صاحب نے کیا ہے۔ ہاں! آپ کا لکھا کالم تو لگتا ہے کہ کسی نے زبردستی، جی حضوری کے لیے لکھوایا ہے۔ آپ کا پہلے بھی ڈراموں پر لکھا تبصرہ بے کار تھا اور اب بھی۔ آپ کوئی اور کام کریں۔ اقبال بانو 'ڈولی' نے مجھے اپنی 'ایفا' کی رخصتی یاد دلا دی۔ ایفا کو رخصت کرتے وقت مجھے بھی اپنی امی کی بہت یاد آئی، کہ جو احساسات اس وقت میرے ہیں، میری رخصتی کے وقت امی بھی ان ہی احساسات سے دوچار ہوئی ہوں گی۔ میں نے کافی دن پہلے ان احساسات کو ایک نظم میں سمویا تھا۔ آج بھی اس نظم کو پڑھتی ہوں تو آنسو خود بخود آنکھوں سے بہہ نکلتے ہیں۔ اقبال بانو آپ

کا افسانہ مجھے بہت اچھا لگا۔ کبھی سنتے تھے گاؤں کی معصوم دوشیزاؤں کے بارے میں کہ وہ کتنی معصوم ہوا کرتی تھیں، لیکن شاید شہر کی بڑھتی ہوئی کثافت نے ان سے بھی ان کی معصومیت چھین لی ہے اور رہی سہی کثر موبائل فون نے پوری کردی ہے۔ فرزانہ آغا کے 'اِک کوہِ گراں اور' نے دل سے تو نہیں آنکھ سے ضرور مکالمہ کیا۔ محمد عرفان رامے کے 'شجرِ ممنوعہ' نے دل اور آنکھ دونوں سے مکالمہ کیا۔ نگہت نسیم کا افسانہ 'ابو پاری' شاہد 12 سال کا ماہ نور زیبا سے دونوں سے بڑا، یوں بھی ہوسکتا تھا، اوپر تلے دو بچیوں کی پیدائش سے سلمیٰ گھر اور بچوں کی ذمے داری میں اتنی مصروف ہوگئی کہ وہ اچھی طرح سے شاہد کو وقت نہیں دے پاتی، تو سلمیٰ کی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اکثر میں تنہا ہی شاہد کو لے کر ڈاکٹر کو دکھانے چلا جاتا اور پھر جناب ملاحظہ فرمائیے۔ ماں اور بہنوں کو ایک پارٹی بنا دیا۔ ایک جملہ اس افسانے کا حاصل تھا، 'خدایا جو محبت کرنا جانتے ہیں، انہیں بولنا کیوں نہیں آتا' کاشی خط کافی طویل ہوگیا۔ چلو اب اجازت تم سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا، بہت کچھ لکھ دیا، کسی کو بھی کچھ بُرا لگے تو معافی چاہتی ہوں۔ سب کو بہت دعا اور سلام۔

ﮪ: ثمینہ جی! تبصرے کا بہت شکریہ، مگر مختصر اور جامع بات زیادہ اثر رکھتی ہے۔ اور دو شعر؟؟ کچھ تو شاعری ہم بھی جانتے ہیں؟

✉: لودھراں سے ہمارے بہت پیارے شاعر لکھاری اور 'تبصرہ نگار' احمد سجاد بابر برقی نامے کے ساتھ شاملِ محفل ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب! سلامِ محبت! سالنامہ موصول ہوا اور خوش قسمتی سے اتنی فراغت بھی نصیب ہوئی کہ مکمل پڑھا۔ اداریہ حسبِ معمول بہت عمدہ رہا۔ سانحۂ پشاور جسم و جان سے زندگی نچوڑ کر گیا ہے۔ نڈھال کر گیا ہے۔ خدا تعالیٰ ان ماؤں کو حوصلہ دے کہ جن کے لعل گھروں سے اسکول گئے اور وہیں سے سیدھا جنت کو پرواز کر گئے اور مائیں دروازے پر بیٹھی رہ گئیں، اور عمر بھی بیٹھی رہیں گی۔ رضوانہ پرنس، دلشاد نسیم اور نگہت نسیم کی والدہ کی وفات کا معلوم ہوا، بہت دکھ ہوا۔ صرف اور صرف ماں باپ ہی تو وہ واحد رشتے ہیں جو بے غرض اور بے لوث ہوتے ہیں، وہ نہ رہیں تو پھر پتا چلتا ہے کہ دھوپ کتنی شدید ہے۔ میانوالی کے جواں مرگ شاعر محمد

سانحۂ ارتحال

ہماری ہر دلعزیز لکھاری اور شاعرہ ساتھی طلعت اخلاق احمد گزشتہ ماہ گہرے صدمے سے دوچار ہوئیں۔ آپ کی والدہ شدید علالت کے باعث اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ اور یہی دُکھ گزشتہ ماہ ہماری دوست لکھاری بینا عالیہ کو بھی اٹھانا پڑا۔ آپ کی والدہ بھی اِس دارِفانی سے کوچ کر گئیں۔ ادارہ دُکھ کی ان گھڑیوں میں طلعت، بینا اور ان کے اہل وعیال کے ساتھ ہے اور مرحومین کے لیے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے لیے صبر کی دُعا کرتا ہے۔

محمود احمد نے کیا خوب کہا تھا۔

شوق سے اب میں گھر نہیں آتا
ماں کا چہرہ نظر نہیں آتا

ایک اور جگہ پر محمود احمد لکھتے ہیں۔

اتنا سچا پھر نہ کسی نے پیار دیا
ماں کی موت نے آدھا مجھ کو مار دیا

دوشیزہ کے تمام لکھاری، قارئین اور جملہ اراکین ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ خالقِ کُل مرحومین کو غریقِ رحمت فرمائے (آمین)۔ اُمِ جلال بخاری کو خوش آمدید، ان کا خط الحمرا (لاہور) میں بھی شائع ہوا ہے، جس سے ان کی ادب دوستی کا پتا چلتا ہے۔ نورالعین زہرہ، بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے لکھے کو پسند کیا، انسان تو بس کوشش ہی کرتا ہے کچھ اچھا کر دکھانے کی، لفظوں میں جان تو قادرِ کُل ہی ڈالتا ہے۔ اب ذرا پرچے کی طرف آتے ہیں۔ اقبال بانو 'ڈولی' کے ساتھ موجود تھیں جو ہر ماں کی درد کتھا تھی۔ یہ آپ بیتی نُما تحریر ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی جس میں دکھ کی فضا براہِ راست دل پر چھائے جارہی تھی۔ اندازِ بیاں کی وجہ سے اچھی لگی۔ فرزانہ آغا 'اک کوہِ گراں اور' کے ساتھ تشریف لائیں۔ اِس افسانے میں کئی سوال اٹھائے گئے ہیں۔ دورُخے چہرے، عورت کی بے بسی، بیگمات کی زندگی، عورت کی جدوجہد، عورت کا زندگی کے سامان پیدا کرنا وغیرہ، اپنے عمدہ اندازِ تحریر کے باعث متوجہ کرنے والی تحریر رہی۔ روشانے عبدالقیوم صبغت اللہ کے ساتھ پرچے میں لمبے عرصے بعد نظر آئیں۔ یہ ایک وسیع کینوس پر کاڑھی گئی رنگا رنگ تصویر تھی۔ اس کا پہلا پلس پوائنٹ روشانے کی محنت تھی جو اس نے ناول کے لیے تحقیق کی صورت میں کی، کرداروں کے مطابق ان کا ماحول، ان کے مکالمے، مکالموں کی بُنت، لفظیات سب ہی عمدہ رہے۔ دوسرا پلس پوائنٹ سسپنس اور دلچسپی قائم رکھنا تھا۔ تیسرا پلس پوائنٹ بطور رائٹر یہ آگہی رکھنا تھا کہ کہاں کون سا جملہ رکھنا ہے، یعنی چوٹ کب اور کہاں مارنی ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب رائٹر ہر سطر کو قاری بن کر محسوس کرتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ چوتھا پلس پوائنٹ کہانی کا فلو تھا جو عمدہ تھا۔ واحد کمی ناول کو سمیٹنا تھا، جو تشنگی لیے تھا۔ روشانے، ویل ڈن۔ سب سے

زیادہ متاثر نگہت نسیم کے افسانہ 'اُو یاری' نے کیا، میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس تحریر کا تجزیہ کرسکوں کیونکہ یہ تحریر اول تا آخر کمالِ فن کا شاہکار تھی۔ رُلانے والی۔ سانس جکڑنے والی، دھڑکنیں اُتھل پتھل کردینے والی۔ بہت خوب نگہت صاحبہ۔ سیما رضا ردا کا ''کینوس'' محبت کے رنگ دکھاتا افسانہ تھا۔ زیادہ متاثر کُن نہیں لگا، یہی سبق اور تھیم اس سے بہتر انداز میں بھی دیا جانا ممکن تھا۔ رضیہ مہدی ''قصاص'' کے ساتھ آئیں۔ ہمیشہ کی طرح طاقتور جملے ان کی تحریر کا سنگھار تھے۔ بہت پریکٹیکل مشاہدات پر مبنی افسانہ بہت سی سوچیں ابھار کر اداس کر گیا۔ رضیہ مہدی ان دنوں بیمار ہیں اور کافی طبی مسائل کا شکار ہیں، اللہ ان کو صحت و شفا دے، ان کے لیے خاص دعاؤں کی اپیل ہے۔ نیر شفقت کا افسانہ 'عورت اور بلی' بھی زیادہ غیر معمولی افسانہ نہیں تھا، مناسب تھا۔ راحت وفا ''محبت'' لے کر پرچے کا حصہ بنیں۔ عورت اور مرد کی محبت کو تماثیل کی مدد سے سمجھاتا افسانہ رہا۔ تحریر پر محنت کی گئی تھی۔ لیکن عورت کی محبت کو 'سردرد' سے تشبیہ دینا افسانے سے مطابقت رکھتا محسوس نہ ہوا کیونکہ رابعہ تو اپنی زندگی میں شانت ہوگئی تھی، محبت کے 'سردرد' نے اسے بے حال کیوں نہ رکھا؟؟ کاشی بھائی اب اجازت چاہوں گا۔

ھ: بہت عزیز احمد! تمہاری آمد ہمارا مان بڑھاتی ہے۔ دوشیزہ سے محبت لفظ لفظ سے جھلکتی ہے۔ سلامت رہو۔

✉: محفل میں یہ آمد ہے کراچی سے ہماری ریگولر قاری ساتھی مسز نوید ہاشمی کی۔ لکھتی ہیں، پیارے دوستوں السلام علیکم! خدا سے اُمید کرتی ہوں آپ سب لوگ خیریت سے ہوں۔ آج کل کے حالات جو چل رہے ہیں ڈر خوف ہر جگہ چھایا ہوا ہے، علم حاصل کرنا بھی موت بن گیا۔ اب ظلم کی انتہا ہوگئی ہے۔ معصوم بچے جو علم حاصل کرکے اِس ملک قوم کو اور مضبوط بنانے جارہے ہیں انہیں توڑا جارہا ہے، ڈرایا جارہا ہے۔ علم سے دور بھگایا جارہا ہے۔ آج اکثر بچے ڈر گئے ہیں۔ ماں باپ پر خوف طاری ہے۔ کیا اسکول بھیجیں؟ کچھ عزم کے ساتھ بچے اسکول جارہے ہیں۔ یہ کیسا ظلم ہورہا ہے، ایسا ظلم تو میں نے جانور میں بھی نہیں دیکھا۔ کچھ قصور ہو تب مارو ظالمو، کیا تمہارے اپنے بچے نہیں ہیں۔ کیا تم خود کسی کے بچے نہیں ہو، بند کرو یہ ظلم۔ ابھی تمہاری رسی دراز ہے مگر جب اللہ کی پکڑ میں آؤ گے تو تمہیں کوئی نہیں بچاسکے گا۔ ☆ قرآن سے کچھ حفاظت کے اسم آپ سب کے لیے تحریر کررہی ہوں۔ ان کو پڑھتے رہیے، خدا آپ سب کی حفاظت فرمائے۔ **1**-یا مُھَیْمِنُ (اے نگہبان) **2**-یا رَزّاقُ (اے روزی پہنچانے والے) **3**-یا عَظِیْمُ (اے بزرگ)۔ آج کل کے حالات کی وجہ سے میں نے قرآن پاک کی آیات کی نام اللہ کے اسم کی **Study** کی تو بے شمار آیاتِ اسم نظر کے سامنے آگئیں تو یہ سر بے اختیار اپنے خدا کے آگے جھک گیا۔ میرے خدا نے ہر ہر پریشانی کا علاج قرآن پاک میں دیا ہے اگر میں وہ ساری آیات اور اسم لکھنے بیٹھ جاتی تو دوشیزہ کے صفحے کم پڑ جاتے۔ اللہ پاک سب کو نماز کے ساتھ قرآن پاک پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔ آیت الکرسی پڑھے بغیر کوئی گھر سے نہیں نکلے۔ اپنے گھر آفس کا بھی آفس کا بھی آیت الکرسی سے حصار ضرور کریں۔ انشاء اللہ بُرے وقت بُری گھڑی بُرے لوگوں سے ضرور بچیں گے اور ایک خاص بات میرے دوستوں، میں کوئی مولوائن نہیں ہوئی بس ایک مسلمان ہوں۔ قرآن پاک کو اپنا دوست بنالیا ہے، آپ بھی دوست بنا کر دیکھیے، سکون واطمینان ضرور ملے گا۔ کاشی بھائی دوشیزہ ڈائجسٹ نہیں ملا، آج **17** تاریخ ہے، اس لیے کوئی تبصرہ نہیں کرسکتی۔ اپنا خیال رکھیے، اپنے اردگرد کا خیال رکھیے، ہوشیار اور خبردار رہیے، ہر

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم...... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

نماز کے بعد ملک کی سلامتی کی دُعا ضرور مانگیے، ہمارے ملک سے ہم ہیں، ہماری پہچان پاکستان ہے۔ خدا پاکستان کی حفاظت کرے۔ آمین۔

ھ: اچھی آپا! آپ کا بھیجا گیا محبت نامہ شائع کر دیا اور دوشیزہ نہ ملنے کی شکایت بھی متعلقہ شعبے تک پہنچا دی گئی ہے۔

✉: افشاں شہزادی کراچی سے محفل میں پہلی آمد ہے، لکھتی ہیں، محترم کاشی چوہان صاحب! السلام علیکم! میں دوشیزہ کی ایک نئی قاری ہوں۔ دیگر پرچوں کے ساتھ اس بار دوشیزہ بھی زیرِ مطالعہ رہا۔ اِس پرچے میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک بہترین میگزین میں ہونی چاہئیں۔ خطوط بھی خوبصورت تھے۔ جن میں محبت جھلکتی ہے۔ افسانے بھی اچھے تھے، مستقل سلسلے بھی بہت مزیدار، شاعری بھی خوبصورت تھی، کچن کارنر سے استفادہ ضرور حاصل کروں گی۔ بے شک دوشیزہ ایک معیاری ڈائجسٹ ہے جسے ہر گھر کی زینت بنایا جاسکتا ہے۔ یہ خط صرف آپ کی حوصلہ افزائی کے لیے ہے، میری طرف سے اتنا معیاری پرچہ پیش کرنے پر ڈھیروں مبارک باد۔ اللہ آپ کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین

ھ: اچھی افشاں! خوش آمدید، پرچے کی پسندیدگی کا بہت شکریہ لیکن گڑیا یہ پرچہ تو آپ جیسے پیارے پیارے پڑھنے والوں ہی کی وجہ سے اپنی بہاریں قائم رکھے ہوئے ہے۔ اگلے ماہ آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔

✉: محفل میں یہ آمد ہے ہماری نئی قاری سعدیہ خان کی کراچی سے، لکھتی ہیں، جنوری کا دوشیزہ سالگرہ نمبر کی صورت جلوہ گر ہوا، اُسی روایتی آب و تاب کے ساتھ۔ پچھلے کئی مہینوں سے مصروفیت کے سبب محفل میں شریک نہ ہوسکی جس کے لیے معذرت۔ اِس بار بھی تمام ہی افسانے خوبصورت تھے۔ آئینہ، عکس اور سمندر کا اختتام بھی زبردست رہا۔ عقیلہ حق صاحبہ کو مبارک باد۔ محفل میں سب نے بھرپور اظہارِ خیال کیا ہے۔ منشا پاشا سے ملاقات بھی اچھی رہی۔ زادِراہ نے ایمان تازہ کردیا۔ انتخاب خاص اور رنگِ کائنات اِس بار بھی زبردست تھے۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں خوبصورت شاعری پڑھنے کو ملی۔ خاص کر عادل حسین، معاویہ عنبر وٹو اور خولہ عرفان کی غزلیں زیادہ مزیدار لگیں۔ نظمیں تینوں ہی اچھی تھیں۔ زین کے جوابات تو ہوتے ہی زبردست ہیں۔ کچن کارنر اور بیوٹی ٹپس میرے لیے ہمیشہ ہی دلچسپ رہے ہیں۔ کاشی بھائی آپ کی محنت نظر آتی ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ اِسی طرح خوبصورت پرچہ دینے کی توفیق دے۔ کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ اب اجازت، اللہ حافظ۔

ھ: اچھی سعدیہ! خوش رہو۔ مگر بھئی محفل میں آمد کو مستقل بناؤ۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉: کراچی سے اب محفل کا حصّہ بن رہے عادل حسین۔ لکھتے ہیں۔ پیارے کاشی چوہان! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ رخسانہ آنٹی اور آپی منزہ سہام سمیت تمام لکھنے اور پڑھنے والوں کو ڈھیروں دعائیں اور سلام! آپ سب کو نیا سال مبارک! دعا ہے کہ رب العزت تمام مسلمانوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین) جنوری کے دوشیزہ میں اپنی شادی کی خبر دیکھی (شکریہ) جو کہ 30 دسمبر کو انجام پائی۔ ساتھ میں چھوٹی بہن کی شادی بھی تھی، جو 31 دسمبر کو اللہ کے فضل و کرم سے بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ اِسی مصروفیات کے سبب کچھ مہینوں دوشیزہ سے تعلق واجبی سا رہا۔ دوشیزہ کے اکاؤنٹنٹ محمد طاہر صدیقی کو شادی کی بہت مبارک باد۔ نسیم نیازی صاحبہ

ہم آپ کے منتظر ہیں

بہت عزیز قارئین!

ہمارا آپ کا ساتھ برسہا برس سے ہے

وقت بدلا، حکومتیں بدلیں، موسم بھی وہ نہ رہے

لیکن

جو چیز پاس رہ گئی

وہ ہے آپ کا اور ہمارا ساتھ

ہماری دُعا ہے کہ

محبتوں اور رابطوں کے یہ بندھن ہمیشہ قائم رہیں

ساتھیو!

ہمارے اور آپ کے رابطے کی منزل تبدیل ہوگئی ہے

ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں:

پتا: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122-35893121-021

اُمید ہے آئندہ آپ کی نگارشات اور محبت سے بھیجے گئے خطوط ہمیں اِسی پتے پر موصول ہوں گے

اور سجاد بابر صاحب کو کتاب کی اشاعت پر ڈھیروں مبارک بادیں۔ زمر نعیم کو بھتیجے کی اور بھائی سجاد بابر کو بیٹے کی بہت بہت مبارک باد۔ مسز نوید ہاشمی کو بھتیجوں کی اور رضوانہ کوثر کو بھانجی کی شادی کے ساتھ باقی سب کو سالگراؤں کی مبارکبادیں۔ محترمہ دلشاد نسیم اور نگہت نسیم صاحبہ کی والدہ کے انتقال پر اظہارِ افسوس۔ اللہ پاک مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ کاشی بھائی آپ کا اداریہ ہمیشہ ہی دلوں کو چھونے والا ہوتا ہے۔ 16 دسمبر واقعی بلیک ڈے تھا۔ اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے۔ زادِ راہ ہمیشہ کی طرح دل کو منور کر گیا۔ خطوط سب ہی زبردست تھے۔ سجاد بابر صاحب کی باتوں سے میں سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ چاپلوسی لکھنے والے کو نقصان کے سِوا کچھ نہیں دیتی۔ مومنہ بتول جی کا شکریہ۔ مسز نوید ہاشمی، اپنے بھائی کی مصروفیت تو آپ نے جان ہی لی ہوگی۔ بڑی بہن کے لیے چھوٹے بھائی کے پاس ڈھیروں دعائیں ہیں۔ آپ کے خط بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ اللہ آپ کو بھی خوش رکھے۔ ڈائجسٹ پورا نہیں پڑھ سکا ہوں تو جو چیزیں نظر سے گزریں وہیں اُن پر ہی بات کروں گا۔ منشا پاشا سے ملاقات اور مِنی اسکرین کے تبصرے دونوں ہی اچھے رہے۔ افسانوں میں محترمہ اقبال بانو صاحبہ کا ڈولی ایک خوبصورت افسانہ تھا۔ اولاد کی محبت میں ڈوبا ہوا۔ نگہت نسیم صاحبہ کا ابو پاری بھی ایک اپاہج بچے کی بے بسی کا نوحہ جس میں باپ کی بے مثال محبت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ اک کوہِ گراں اور فرزانہ آغا صاحبہ کا اور قصاص رضیہ مہدی صاحبہ کا، دونوں ہی بھلے لگے۔ کینوس، سیمار ضا ردا کا چھوٹا مگر پُراثر افسانہ تھا۔ حقیقت سے قریب تر۔ نائس۔ باقی افسانے پڑھ نہیں سکا۔ میری غزل کی اشاعت پر شکریہ! دوشیزہ گلستاں بھی اچھا ترتیب دیا ہے اسماء اعوان جی نے۔ زین کے جوابات ہمیشہ ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ اب کچن کارنر اور بیوٹی گائیڈ کے کالم بھی کام آئیں گے۔ (ہماری بیگم صاحبہ کے)۔ حکیم صاحب کے مشورے سردی کے موسم میں نہایت سودمند ہیں۔ نفسیاتی الجھنیں پر مختار بانو طاہرہ صاحبہ کو دعائیں۔ آخر میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معافی کا طلبگار ہوں اور رضوانہ پرنس صاحبہ کی والدہ کو اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اور کاشی بھائی اتنا خوبصورت سال گرہ نمبر پیش کرنے پر آپ کو بھی مبارکباد۔ اللہ حافظ۔

ھ: پیارے عادل! تبصرہ اچھا کیا لیکن لگتا ہے محبتیں تقسیم ہونا شروع ہوگئی ہیں۔

✉: کراچی سے نسیم سحر کچھ اس طرح رقم طراز ہیں، کاشی بھائی السلام علیکم۔ آپ کو اور تمام اسٹاف کو نیا سال اور ڈائجسٹ کی سال گرہ مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ترقی اور کامیابیوں سے نوازے (آمین) جنوری کا سال گرہ نمبر اس وقت میرے سامنے ہے، سب سے پہلے تو تبصروں پر تبصرہ کرنا چاہوں گی اور لودھراں کے احمد سجاد بابر صاحب سے اتفاق کروں گی، ہر کہانی کی تعریف کوئی تفصیلی اور کوئی مختصر کر رہا ہوتا ہے، یا پھر اپنی مصروفیات اور ذاتی زندگی کا احوال سنا رہا ہوتا ہے۔ البتہ بابر صاحب کی ایک بات سے اختلاف ہے کہ 'رائٹرز خط نہیں لکھتے' ارے بھائی رائٹرز کو صرف کہانیاں افسانے وغیرہ ہی لکھنا چاہئیں۔ کیونکہ کہانیوں پہ تبصرہ قارئین کا حق ہے اور قارئین کی ہی تنقید رائٹرز کو Improve کرتی ہے۔ اب اِس میں بھی دو باتیں ہیں، پہلی یہ کہ رائٹر کڑی تنقید کا متحمل نہیں ہوسکتا ورنہ وہ شماروں سے آؤٹ کر دیا جائے گا۔ دوسرے یہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نا ممکن ہے، اس لیے رائٹرز نے خط لکھنا ہے تو پھر اُس نے سب کی تعریف ہی کرنا ہے جو کہ ہر تبصرے میں نظر آتی ہے۔ اب

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

شمارہ مارچ 2015ء

پُراسرار کہانی نمبر ہوگا

ناقابلِ یقین، دہشت انگیز، خوفناک سچ بیانیاں،
جنوں، بھوتوں اور ارواح خبیثہ کی سچی داستانیں
ایسے پراثر و روحانی واقعات کا حیرت انگیز مجموعہ
شاید پہلے کبھی آپ کی نظر سے نہ گزرا ہو

گزشتہ تمام پراسرار نمبرز سے منفرد

آج ہی بک اسٹال سے اپنا شمارہ مختص کرالیں

اگر آپ کے ساتھ بھی کبھی کوئی حیرت انگیز واقعہ پیش آیا ہو یا آپ نے کسی سے ایسی کہانی سنی ہو تو ہمیں لکھ بھیجیں، نوک پلک ہم سنوار لیں گے

وقت کم ہے، مصنفین اپنی تخلیقات جلد از جلد ارسال کردیں

اطلاع عام	قارئین سے گزارش ہے کہ اپنی نگارشات اور خطوط بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں پتا: C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

کہانیوں کی بات ہو جائے، 'بلی اور عورت' نام سے شدید اختلاف ہے، انسان کو اللہ نے اشرف بنایا ہے۔ اُسے کسی جانور سے مماثل قرار دینا......؟ روشانے کی 'صبغت اللہ' ابتدا میں پیر کامل سے مشابہ لگی۔ میں امید کرتی ہوں آپ میری تنقید کا برا نہیں منائیں گے کیونکہ میں اِس شمارے کو پسند کرتی ہوں اس لیے چاہتی ہوں کہ اِس میں کوئی خرابی نہ ہو۔ منشا پاشا سے ملاقات بہت مزے کی تھی۔ فی الحال اتنا ہی۔

ھ: اچھی نسیم! احمد سجاد بابر کی تنقید کو غور سے پڑھا کریں، آپ نے صرف اپنے مطلب کی بات اخذ کی اور تنقید بھرا تبصرہ لکھ دیا۔ بتایئے اگر کڑوی گولی ہر مرض کا علاج ہوتی تو ہومیو پیتھی علاج تو کب کا The End ہو چکا ہوتا۔ تنقید کرتے ہوئے بہت دھیان کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ دنیا کا سب سے زیادہ آسان کام صرف تنقید ہی تو ہے۔ امید ہے آپ بھی بُرا نہیں منائیں گی کیونکہ مجھے اپنے تمام رائٹرز سے بہت پیار ہے۔

✉: فرح عالم، اسلام آباد سے اس ماہ مختصر تبصرے کے ساتھ محفل کا حصّہ ہیں۔ لکھتی ہیں، کاشی بھائی اسلام آباد میں سردیاں زوروں پر ہیں۔ مانا پچھلے کئی ماہ ہمارے یہاں سیاسی گرما گرمی رہی لیکن کیا ہوا...... جنوری کا دوشیزہ بہت لیٹ موصول ہوا، جب میں جناح سپر سے مکمل طور پر نا اُمید ہو چکی تھی کہ اچانک ایک دن دوشیزہ کا سالگرہ نمبر ہاتھ آ ہی گیا۔ سب سے پہلے تو آپ لوگوں کو نئے آفس میں شفٹ ہونے کی مبارک باد۔ اُمید ہے یہ تبدیلی انشاء اللہ ترقی کے لیے معاون ثابت ہوگی۔ اداریہ بلیک ڈے...... کیا لکھوں، کاشی بھائی آپ کا قلم بہت سفاک ہے اور حقیقت کی اصل تصویر کشی کرتا ہے۔ ظالمو! کچھ تو فرق رہنے دو۔ درس گاہوں میں، قتل گاہوں میں، سب کچھ اِن دو لائنوں میں بیان کر دیا۔ اِس ماہ میں تفصیلی تبصرہ کرنے قاصر ہوں۔ اِس لیے معاف کر دیجیے گا۔ عقیلہ حق کا ناول روایتی انجام کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ تیرے عشق نچایا بہتر ہے، اُمِ مریم، رحمٰن رحیم سدا سائیں کے ساتھ مکمل انصاف کر رہی ہیں۔ روشانے عبدالقیوم کا صبغت اللہ بہتر تھا مگر یادگار نہیں۔ نعمان الحق کا پرندۂ دل بس اُڑان بھر رہا ہے۔ آہستہ آہستہ چارم ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اقبال بانو، فرزانہ آغا، نگہت نسیم، رضیہ مہدی، محمد عرفان رامے کے افسانے شاندار تھے۔ انتخابِ خاص میں بانو قدسیہ کا چابی لاجواب رہا۔ خاور محمود کا کنوارہ بھی اچھا لگا۔ باقی تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح بہتر تھے اور کیا لکھوں، انشاء اللہ اگلے ماہ پوری کوشش ہوگی کہ محفل میں بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہو جاؤں۔ تمام قاری اور لکھاری بہن بھائیوں کو موسم بہار کی آمد بہت بہت مبارک ہو، دُعا کرتی ہوں کہ خدا تعالیٰ سب کی زندگیوں میں بھی بہار لے آئے۔

ھ: فرح! مختصر تبصرے میں جامع بات کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ تبصرہ واقعی شاندار رہا، آپ کے تبصرے کا تو اب باقاعدہ انتظار رہتا ہے۔ کہانی کب تک موصول ہوگی۔

لیجیے ساتھیو! اس ماہ تک کی ہماری ملاقات اختتام کو پہنچی۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا کیونکہ ہمارے لیے آپ کی اہمیت آکسیجن کی طرح ہے۔

آپ کا ساتھی
کاشی چوہان

دلشاد نسیم

ماں...... جدائی سہی نہیں جاتی

قارئین دوشیزہ کے لیے خوبصورت سوغات

''جدائی سہی نہیں جاتی''

پیاری ماں
جدائی سہنے کی پہل تُو نے کی
بچھڑنے کا عذاب پہلے تُو نے سہا
جب مجھے رخصت کیا
ماں سچ سچ بتا
دیکھ مجھ سے کچھ نہ چُھپا
چوکھٹ پہ جب تُو لوٹ کے آئی
خود کو کتنا تنہا پایا......؟

میرا بستر
میری سُونی الماری
میرا کمرہ
کتنا تڑپاتا تھا......؟
پکتے کھانوں کی خوشبو
میری چوڑی کی جھنکار
بے بات ہنسی کے لاکھوں گھنگرو
گھر میں گونجا تو کرتے ہوں گے......؟
فون پہ میری آواز کو سن کر
بے ساختہ تُو ہنس دیتی ہے...... پر
آنکھ بھر تو آتی ہوگی

اچھی ماں یہ بھی بتا
تُو یہ سب کیسے سہہ لیتی ہے
دل میں رکھ کر سارے آنسو
ہونٹوں سے کیسے مُسکا لیتی ہے
ماں......
سب کچھ مجھے سکھلایا تُو نے
جدائی بر ہن آجائے تو
اس کو کیسے برتوں میں...... سکھلا دیتی
تیری قسم...... یہ سہی نہیں جاتی

دلشاد، نگہت اور نزہت کی اپنی والدہ کے ساتھ ایک یادگار تصویر

اپنی پہلے کی لکھی نظم کو 29 نومبر کی صبح میں امی کے پیروں کے پاس بیٹھی Fb پہ شیئر کرتے ہوئے دوستوں سے دعا کے لیے کہہ رہی تھی۔ مجھے امی کی سانسیں بہت مدھم لگ رہی تھیں۔ ان کے سرہانے لگا مانیٹر کسی بھیانک خبر کی تیاری کررہا تھا۔ میں بہت خوف زدہ تھی۔

میری بدنصیبی کہ میں پاکستان میں اور میری ماں لندن میں تھیں کبھی کبھی وہ وارفتگی محبت میں کہتیں ''سارے ماجھے ساجھے لندن آجاندے نیں، توں

نیئں آندی'' پھر سوال سا کرتیں ''تیرا دل نیئں کردا'' میں کہتی آپ دعا ہی نہیں کرتیں...... اور پھر یوں ہوا کہ ان کی دعائیں رنگ لے آئیں۔ اللہ نے سن لیں اور ان ہی کی نہیں میری بھی...... میری ہر نماز کے بعد، آدھی رات جب بھی آنکھ کھل جاتی، نئے چاند کو دیکھ کے اور جانے کتنی منتیں مانیں...... مجھے وہ دن یاد ہے جب میں امی کی قدم بوسی کو لندن پہنچ ہی گئی۔ ایر پورٹ پہ شاید یہ سوال ضروری ہوتا ہو کہ آپ کیوں آئے ہیں؟

مجھ سے بھی پوچھا گیا مجھے یاد ہے میرے لہجے میں بچوں کی معصومیت اور احساس۔ تفاخر تھا کہ اپنی امی سے ملنے آئی ہوں۔ ممکن ہے میری آنکھوں میں نمی بھی آجاتی ہو۔ لندن پہنچی تو گھر کے سامنے امی کو بھائی بھابیوں، بہن اور سب بچوں کو اپنے استقبال کے لیے کھڑا پایا تو خود پر پاکستان کے سفیر ہونے کا گمان ہوا۔ امی کی خوشی دیدنی تھی ان کا چہرہ، ان کی آنکھیں ان کا بار بار مجھے دیکھ کے مسکرانا...... اُف میرے خدا! میں اس قدر خوش قسمت ہوں...... میں خود پہ نازاں تھی۔ امی جی سے ہر شخص یہی کہہ رہا تھا ''اب خوش ہیں'' اور وہ آنکھیں بند کر کے بھرپور اطمینان سے کہتیں ''بہت''

چھوٹا بھائی عاصم کہنے لگا۔ ''امی آپ کی تصویر دیکھ کر فلمی ماں کی طرح بی ہیو کرنے لگتی ہیں۔ روتی ہیں اور کہتی ہیں کہ دلشاد کو بلا دو۔'' میں نے امی کے گلے لگ کر کہا۔ ''ڈرامہ نگار کی ماں کو کم از کم فلمی تو ہونا ہی چاہیے۔'' امی کی خوبصورت مسکراہٹ میرے ذہن میں یوں نقش ہے جیسے ابھی بھی وہ میرے سامنے بیٹھیں اپنی میٹھی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے مجھے دیکھ رہی ہیں۔ ہر بیٹی کا اس کی ماں کے ساتھ روایتی مگر گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ہماری امی ایک غیر معروف گاؤں میں پیدا ہونے والی خاتون، جو پانچ جماعتوں سے آگے پڑھ بھی نہ سکیں مگر جب اخبار پڑھ کر اُس پر تبصرہ کرتیں، اُن پر کسی سیاست دان ہونے کا گمان ہوتا۔ کسی کے مسئلے کا حل بتاتیں تو مفکر سی لگتیں۔ ہماری سہیلیوں میں ہوتیں تو سہیلی بن جاتیں اور اپنی ہمجولیوں میں اُن جیسی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کبھی انہوں نے بیٹھ کر یہ بتایا کہ سچ کی طاقت کیا ہے۔ کبھی کہا ہو کہ حسنِ سلوک کس کو کہتے ہیں۔ اُن کا عمل ہی اُن کا درس تھا۔ جب میری شادی ہوئی تو سوچا اپنی ماں جیسی بہو بنوں گی۔ بچے ہوئے تو اُن جیسی ماں بننے کا ارمان ہوا۔ ابھی ساس کا مرحلہ باقی ہے۔ خواہش ہے کہ ان جیسی نہ سہی کچھ تو ان کی مجھ پر پرچھائیں رہے تاکہ دیکھنے والے محبت سے کہیں یہ رقیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ امی جی نے بھرپور اور خوبصورت زندگی گزاری مگر 2012ء میں ان کو ایک بہت بڑا دکھ ملا اور یہ دکھ ان کی آخری سانس تک ساتھ رہا۔ خالد صاحب کی دائمی جدائی نے ان کو بہت غمزدہ رکھا۔ ہم دونوں فون ملا کے بیٹھی رہتیں۔ نہ وہ کچھ بولتیں نا مجھ میں کچھ کہنے کی ہمت ہوتی۔ لیکن فون بند کرنے سے پہلے وہ یہ ضرور کہتیں۔ صبر کرو بیٹا، صبر! مگر خود دن بہ دن گھلنے لگیں۔ ایک دن کہنے لگیں۔ میں بہت مجبور ہوں بیٹی۔ اِس وقت مجھے تمہارے پاس ہونا چاہیے تھا لیکن میں آ نہیں سکتی۔ مجھے معاف کر دینا۔ اپنی اپاہجی کو انہوں نے جی کا روگ نہیں بنایا لیکن کچھ وقت ایسے ہوتے ہیں کہ مجبوری زنجیر لگتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی گھڑی تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے آنسو بہاتے، کبھی کبھی وہ سمجھاتیں۔ اِس وقت کو زندگی کا حصّہ سمجھ کر گزارنا۔ پریشان نہ ہونا۔ مجھے وہ دن یاد ہے۔ جب انہوں نے کہا۔ ''دلشاد تیرے گل لگ کے رون نوں بڑا دل کردا اے۔'' (دلشاد تمہارے گلے لگ کر رونے

کو بڑا دل کرتا ہے) میں نے امی سے کہا۔ خود تو رونے سے منع کرتی ہیں۔ کہنے لگیں کبھی کبھی رو لینا چاہیے۔ ویسے امی بہت کم روتی تھیں اور ہمیں بھی بہادری کا ہی سبق دیتی رہیں۔ زندگی کے ہر محاذ پر ہم نے ان کو لڑتے اور جیتتے ہی دیکھا۔ ایک روز جانے کس بات سے گھبرا کر میں نے اُن سے گلہ کیا۔ آپ نے سب کچھ سکھایا مگر اپنا حق مانگنا نہیں سکھایا۔ ہنس کر بولیں۔ جو کام میں نے کبھی نہ کیا تمہیں کیسے سکھاتی......

واہ امی جی!

18 ستمبر کو پاکستان آ کر بھی دھیان امی کے آس پاس ہی رہا اور دل میں جانے کیا سمائی کہ 13 نومبر کو میں پھر لندن پہنچ گئی۔ بھائیوں نے خوب مذاق کیا کہ ابھی تو راستہ بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ آپ پھر آ گئی ہیں۔ میں اور امی ہنستے رہے کیونکہ ان کو الہام ہو گیا تھا کہ میں آنے والی ہوں۔ اسی لیے تو میرے اچانک جانے کے باوجود وہ حیران نہ ہوئی تھیں۔ جانے یہ میری خوش بختی تھی یا بد قسمتی میرے پہنچنے کے تیسرے دن ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ ہاسپٹل لے کر گئے تو ڈاکٹر نے واپس نہ آنے دیا۔ ہر محاذ پر جیتنے والی میری امی حوصلہ ہار رہی تھیں۔ موت بہانا بنا چکی تھی۔ یہ اور بات کہ ہم بے خبر تھے۔

سب کہتے رہے کہ امی جی تو اس سے زیادہ بیمار ہو جاتی ہیں اور ٹھیک ہو کر واپس آ جاتی ہیں۔ میں حیران ہو ہو کر پوچھتی کہ اتنی بیماری کے باوجود بھی؟ پھر اپنی کم عقلی پر ملامت کرتی اور سوچتی۔ امی جی کی بہادری سے کچھ بھی بعید نہ تھا لیکن 29 نومبر کی صبح ویسی امید افزا نہ رہی جیسی روز ہوا کرتی تھی۔ میں ان کے پاس تنہا تھی۔ ان کی مدھم ہوتی سانسیں مجھے انجانے خوف میں مبتلا کر رہی تھیں۔ ہاسپٹل میں سکوت طاری تھا۔ رات بھر میں سو بھی نہ سکی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد دوستوں سے امی جی کی صحت کی دعا کے لیے درخواست کر رہی تھی۔ اور امی کا تعلق آہستہ آہستہ زندگی سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ہمارا اور امی کا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ احباب کی دعاؤں نے ان کا آخری سفر آسان کر دیا۔ میں اور ڈاکٹر کمرے میں تھے۔ ڈاکٹر امی کو دیکھ رہی تھیں اور میرے دل کو پنکھے لگے ہوئے تھے کہ جانے اب وہ کیا کہنے والی ہے۔ مکمل چیک اپ کے بعد وہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کے میرے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ پوچھنے لگی آپ کون ہیں؟ میں فخر سے بولی ان کی بیٹی۔ اُس نے کہا آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ ان کے آخری وقت میں ان کے پاس ہیں۔ آپ اپنے باقی رشتہ داروں کو بھی بلا لیجیے۔ میں خواب جیسی بے خبری میں اُن کی باتیں سن رہی تھی، حیران تھی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ کیسے آ گیا۔ شاید بہادر ماں کی بیٹی تھی اس لیے...... ڈاکٹر میرے کندھے کو سوری کہتی ہوئی تھپتھپا کر چلی گئی۔ میں نے گھر پر اطلاع دی۔ سب کے آنے تک میں اور امی جی اکیلے تھے۔ ہم ماں بیٹی نے بہت سی باتیں کیں۔ اُن سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگی۔ قدم بوسی کی۔ ماتھا چوما۔ مجھے یوں لگا۔ امی نے مجھے پھر سمجھایا ہے۔ یہ وقت زندگی کا حصہ سمجھ کر گزارنا۔ پریشان نہ ہونا۔

امی جی کو ان کے آخری سفر پر لے جایا جا رہا تھا۔ میں نے اُن سے وعدہ لیا کہ وہ ہم سے غافل نہ رہیں گی۔ ہمارے لیے دعا کرتی رہیں گی۔ اور مجھے یقین ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔ امی جیسی غم گسار ماں ہمیں اکیلا کیسے کر سکتی ہیں۔ 10 دسمبر کو واپس پاکستان آتے ہوئے مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے امی جی نے ہمیشہ کی طرح گلے سے لگا کر الوداع کیا ہو۔

☆☆☆

سن سے سوال

آج کے کامیاب ڈائریکٹر

”نین منیار“

ذیشان فراز

☆ وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟

♥ : نین منیار۔

☆ گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟

♥ : نین

☆ وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟

♥ : کراچی۔

☆ زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟

♥ : دلو (Leo)۔

☆ علم کی کتنی دولت کمائی؟

♥ : بی ایس سی۔

☆ کتنے بھائی، بہن ہیں۔ آپ کا نمبر؟

♥ : دو بھائی، دو بہنیں، میرا دوسرا نمبر ہے۔

☆ ہدایت کاری کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟

♥ : لازمی ہے۔ جب تک ڈائریکٹر کے اندر صبر نہ ہو، Passion نہ ہو، ڈائریکٹر نہیں بن سکتا۔

☆ : اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟

♥ : دوسرے انسان کو پہچاننا۔

☆ : کوئی ایسی خواہش جو اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟

♥ : ویسے تو اللہ کا شکر ہے سب خواہشات پوری ہوئی ہیں۔ ہاں کچھ خواہشات ایسی ہیں...... مگر وہ بھی جلد پوری ہو جائیں گی۔

☆ : اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟

♥ : نیو ٹیلنٹ کو متعارف کرانے کے بعد مجھے جو خوشی ملتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ کل ہمارے یہی لگائے ہوئے پودے قد آور درخت بنتے ہیں۔

☆ : اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟

♥ : میں دوسروں پر بہت جلد بھروسا کر لیتا ہوں۔ لوگ جھوٹ بھی بولتے ہیں تو بھی میں اعتبار کر لیتا ہوں۔ میں بہت اسٹریٹ فارورڈ ہوں۔

☆ : زندگی میں کون سے رشتوں نے دُکھ دیے؟

♥ : جس کو بھی چاہا، اُس نے دُکھ دیا۔ کسی ایسے کی تلاش ہمیشہ رہتی ہے جو زندگی کو خوشگوار بنا دے۔

☆ : لباس جگ بھاتا پہنتے ہیں یا من بھاتا؟

♥ : جو مل جائے، پہن لیتا ہوں۔

☆ : اردو والے ”سفر“ کا ذریعہ کیا ہے؟

♥: اپنی گاڑی ہے۔
☆: صبح کا آغاز کس طرح کرتے ہیں؟
♥: اللہ کا شکر ادا کر کے کیونکہ آپ کو خدا ایک نئی صبح عطا کرتا ہے۔
☆: دن کا کون سا پہر اچھا لگتا ہے؟
♥: صبح صادق اور مغرب کا وقت بہت پسند ہے۔
☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟
♥: جھوٹ۔
☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔
♥: صحت، عزت، محبت، دولت، شہرت۔
☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥: سمندر کو دیکھ کر رومینٹک ہو جاتا ہوں۔
☆: پہلی ملاقات میں ملنے والے کی کس بات سے متاثر ہوتے ہیں؟
♥: انسان کی صورت اور اندازِ گفتگو سے۔
☆: خود ستائشی کے کس حد تک قائل ہیں؟
♥: میں اس چیز کا قطعاً قائل نہیں۔
☆: یاد کا کوئی جگنو جو تنہائی میں روشنی کا باعث بنتا ہو؟
♥: جب ٹی وی پر پہلی بار میرا نام آیا تو میرے والدین بہت خوش تھے۔ مجھے آج بھی وہ وقت روزِ اول کی طرح یاد ہے۔ اور اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں جھلمل کرتے جگنو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔
☆: غصّے میں کیا کیفیت ہوتی ہے، خاموشی یا چیخ و پکار؟
♥: خاموش ہو جاتا ہوں۔ اور غصہ پی جاتا ہوں۔
☆: لوگوں کی نظر میں آپ کی شخصیت کیسی ہے، اعلیٰ، اچھی، بس ٹھیک؟
♥: لوگوں کی نظر میں بہت بارعب اور غصّے والی شخصیت ہوں۔ مگر میں اس کے بالکل برعکس ہوں۔
☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟
♥: موت تو برحق ہے۔ خوف کس بات کا، ڈر تو زندگی سے لگتا ہے۔
☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتے ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟

♥: سو فیصد۔ ہاتھ ملانے والا تو ملاقاتی ہوتا ہے۔ دوست کہاں ہوتا ہے۔

☆: کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟

♥: مجھے سارے کھانے پسند ہیں۔ جو مل جائے میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں کسی چیز کا پرہیز نہیں کرتا۔

☆: زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کے قائل ہیں یا تدبیر کے؟

♥: تقدیر کو تدبیر سے بدلا جا سکتا ہے۔

☆: کون سے الفاظ عام بات چیت میں زیادہ استعمال کرتے ہیں؟

♥: اللہ کا شکر ہے۔

☆: زندگی کا وہ کون سا پل تھا جس نے یکدم زندگی ہی تبدیل کر دی؟

♥: جب میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک پرائیویٹ اسٹوڈیو میں لے گئے اور بس میری زندگی یکدم ہی تبدیل ہونا شروع ہو گئی اور یہ طے ہو گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

☆: ویک اینڈ کیسے گزارتے ہیں؟

♥: شوبز کی دنیا میں کوئی ویک اینڈ نہیں ہوتا۔ ہم اپنا ویک اینڈ خود بناتے ہیں۔

☆: شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟

♥: کامیابی تو رحمت سے ملتی ہے۔ شہرت رحمت ہے۔

☆: کیا آپ اچھے راز داں ہیں؟

♥: بالکل۔ الحمدللہ۔

☆: اگر آپ میڈیا پر نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟

♥: اگر میں ڈائریکٹر نہ ہوتا تو میں ایک اچھا مصور ہوتا، جیسا کہ میرے والد تھے۔

☆: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

♥: آئینہ دیکھ کر اللہ کی تعریف کرتا ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں۔

☆: ''ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'' کس حد تک عمل کرتے ہیں؟

♥: اپنی بساط کے مطابق میں ہر ممکن مدد کرتا ہوں۔

☆: اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے؟ اگر ہے تو کیسی موسیقی؟

♥: بے شک۔ مجھے ہر قسم کی موسیقی پسند ہے۔ جس میں احساسات ہوں، تاثر ہو، جسے سن کر سکون محسوس کیا جائے۔

☆: زندگی کب بری محسوس ہوتی ہے؟

♥: آپ جو کرنا چاہ رہے ہوں اور وہ نہ ہو تو زندگی بہت بری محسوس ہوتی ہے لیکن بعد میں اللہ کی مصلحت کے تحت اپنی سوچ بدل دیتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

☆: محبت کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟

♥: محبت کا اظہار کرنا بہت مشکل ہے جبکہ نفرت کا اظہار خود بخود ہو جاتا ہے۔

☆: اپنے ملک کی کوئی اچھی بات؟

♥: پاکستان ہمارے لیے اللہ کا تحفہ ہے۔ ہماری شناخت، ہمارا ملک ہے۔ ہمارے ملک کی ہر چیز اچھی ہے۔ ہمیں اس نعمت پر ہر وقت خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

☆: خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟

♥: بزدل ہوتا ہے۔ جھانپو ہوتا ہے۔

☆: مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟

♥: مطالعہ ضرورت ہے۔

☆: کن چیزوں کے بغیر سفر ممکن نہیں؟

♥: ماں کی دعا کے بغیر گھر سے نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

☆: حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گے؟

♥: صرف یہ کہنا ہے کہ ہمیشہ سچ بولیں۔ جھوٹ نہ بولیں۔ جھوٹ سے زندگی میں گڑبڑ شروع ہو جاتی ہے۔

☆☆......☆☆

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

اے آر وائی کے پروگراموں کی بات کریں تو اس وقت سوپ ''میکہ اور سسرال'' کو ناظرین بہت پسند کررہے ہیں۔ مرکزی کردار میں جاوید شیخ نے کمال کی اداکاری کی ہے۔

اس سوپ کے دیگر فنکاروں میں نتاشا علی، طفور خان، نوشین شاہ اور صباحت بخاری قابلِ ذکر ہیں۔ اس سوپ کو تحریر کیا ہے ثمرہ بخاری نے جبکہ ہدایات محسن طلعت کی ہیں۔ یہ سوپ جمعہ اور ہفتہ کی رات ''اے آر وائی زندگی'' سے دکھایا جارہا ہے۔

اے آر وائی زندگی سے دکھائے جانے والے دوسرے سوپ ''بہو بیگم'' کو خواتین کی ایک بڑی تعداد بڑی باقاعدگی سے دیکھ رہی ہے۔

عتیقہ اوڈھو سوپ میں بڑے منفرد انداز میں نظر آرہی ہیں۔ اس سوپ کے فنکاروں میں دیا مغل اور پری ہاشمی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سوپ ہر جمعہ اور ہفتہ کی رات 7:30 بجے دکھایا جارہا ہے۔

سیریل ''پرورش'' میں سینئر اداکار فردوس جمال نے کمال کی اداکاری کی ہے۔

اس سیریل کی ہدایات دی ہیں محسن مرزا نے جبکہ اسے لکھا ہے میمونہ خورشید نے۔ اس کے فنکاروں میں اسفر رحمان، سدرہ بتول، انعم فیاض، محمود اختر،
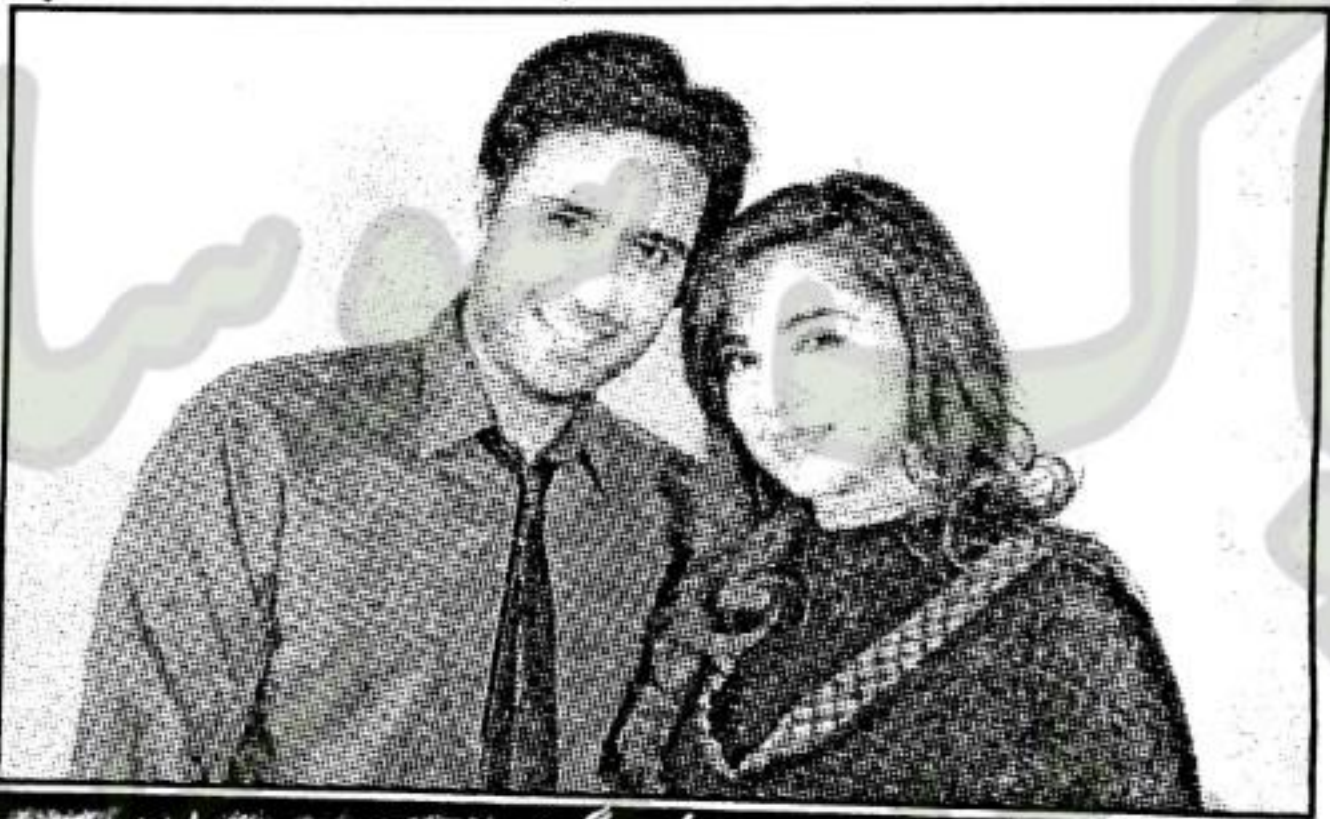
نتاشا علی اور طفور خان اے آر وائی زندگی کے سوپ میکہ اور سسرال میں

عتیقہ اوڈھو، دیا مغل اور پری ہاشمی اے آر وائی زندگی کے سوپ بہو بیگم میں

صبا فیصل، سندس طارق، بابر خان، نوید رضا اور ریمی پاشا قابلِ ذکر ہیں۔ سیریل ''پرورش'' ہر منگل کی رات 9 بجے اے آر وائی ڈیجیٹل سے دکھائی جارہی ہے۔

''بابل کی دعائیں لیتی جا'' صدیقی صاحب کی پانچ بیٹیوں کی کہانی ہے جو اپنی بہن کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔

ان کی بہن نگہت ایک تیز مزاج عورت ہے اور وہ چاہتی ہے کہ بچیوں کے والد ان بچیوں پر سختی کریں۔ یہ بچیاں پل کر کس طرح جوان ہوئیں یہ سوپ ''بابل کی دعائیں لیتی جا'' دیکھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔

یہ سوپ اے آر وائی ڈیجیٹل سے ہر پیر سے جمعرات کو 7:30 بجے دکھایا جارہا ہے۔ اس کے فنکاروں میں قاضی واجد، بنیش چوہان، شہزاد رضا، قیصر نقوی اور دیگر شامل ہیں۔ اسے تحریر کیا ہے ابن آس نے جبکہ ہدایت نین منیار کی ہیں۔

بنیش چوہان ARY ڈیجیٹل کے سوپ بابل کی دعائیں لیتی جا میں

سیریل ''میں بشرا'' اُس کہانی کا نام ہے جہاں بیٹوں کی پیدائش سے لائن لگ جائے اس سریل میں مرکزی کردار بشرا کا ہے، اسے تحریر کیا ہے صنم مہندی نے جبکہ ہدایت کار احمد بھٹی ہیں۔

مرکزی کرداروں میں صبا حمید، شہریار زیدی اور فیصل قریشی شامل ہیں۔

سریل ''میں بشرا'' ہر جمعرات کی رات 8 بجے اے آر وائی ڈیجیٹل سے دکھائی جارہی ہے۔

☆☆☆

ناول

رفعت سراج

دامِ دل

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں بے ترتیب کر دیں گی۔
رفعت سراج کے جادوگر قلم سے، نئے سلسلے وار ناول کی پہلی کڑی۔

چمن اور ثمر کی شادی کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ یہ اُن کی شادی کی تیسری سالگرہ تھی۔ بہت زیادہ مہمان نہیں تھے لگ بھگ پندرہ بیس مہمان تقریب میں شامل تھے۔ جن میں چمن کی ماں، عطیہ بیگم والد، مشکور احمد، بہن ایمن اپنی دو بچیوں، جن کی عمر بالترتیب 4 اور 6 سال تھیں، شریک تھیں۔
اس کے علاوہ ثمر کی اکلوتی بہن افشاں اور ثمر کی ماں بانو آپا۔ جو ایک طرح سے تقریب کی روح رواں تھیں۔

اور مہمانوں میں گھلتی ملتی، ہنستی مسکراتی نظر آرہی تھیں۔
بانو آپا نے ایک مہمان خاتون سے باتیں کرتے کرتے چونک کر چمن اور ثمر کو مخاطب کیا۔
''ارے بھئی اب جلدی کرو۔ کیک کاٹ بھی لو۔ اب کس کا انتظار ہے؟ مجھے تو بہت زور سے بھوک لگ رہی ہے۔''
کسی خاتون نے برجستہ ایک جملہ اُن کی طرف اُچھالا۔'' بانو آپا جب آپ کو زور کی بھوک لگتی ہے تو آپ کیک کھاتی ہیں؟'' سب ہنس پڑے۔
''بھئی کیک کھانے کے بعد ہی تو کھانا ملنے کا آسرا ہوگا ناں۔ اب یہ کیک! اِس کو دیکھ کر تو اب جان جلنے لگی ہے۔ خدا جانے کب کٹے گا۔ کب کھانا بٹے گا۔'' بانو آپا بھی مزاحیہ انداز میں بولیں۔
ایک مرتبہ سب پھر ہنس پڑے۔
ثمر نے اپنی بیوی چمن کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔'' چلو کیک کاٹتے ہیں۔ ورنہ بھوک کی وجہ سے امی کہیں تقریب کا بائیکاٹ نہ کردیں۔'' وہ یہ کہہ کر چمن کو بازو سے تھام کر اُس ٹیبل کی طرف بڑھا جہاں بڑا سا کیک سجا ہوا تھا۔ مہمان بھی اُٹھ کر اُن کے قریب آ کھڑے ہوئے۔
ثمر نے اور چمن نے مل کر کیک کاٹا۔ بے تحاشا تالیوں کی گونج میں انہوں نے ایک دوسرے کو کیک کھلایا۔ افشاں بھی بڑی پھرتی سے آگے بڑھی اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھا کر اپنے بھائی کے منہ میں ڈالا۔ ایمن نے آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھایا اور افشاں کی طرف دیکھ کر بولی۔
''میں تمہاری طرح نہیں ہوں صرف بھائی کو کیک کھلاؤں...... میں بہنوئی کو بھی کھلاؤں گی اور بہن کو بھی۔''
افشاں ایک دم جھینپ سی گئی اور بولی۔
''بھابی کو تو میں کھلانے ہی والی تھی لیکن آپ ذرا جلدی میں ہیں۔'' بانو آپا نے ایمن کی طرف دیکھا اور بولیں۔'' ارے میاں کو جو گھر پر چھوڑ کر آئی ہیں۔ جلدی میں تو ہوں گی۔''
بہرحال کیک تقسیم ہوا اور سب اپنی اپنی پلیٹیں لے کر اِدھر اُدھر بیٹھ کر کیک کھانے لگے۔
ثمر نے ایک بہت خوبصورت گفٹ پیک چمن کی طرف بڑھایا۔ اور مسکرا کر بولا۔
''آج کی تقریب کی نشانی میری طرف سے۔''
ایک خاتون مزاقاً بولیں۔
''بھئی ثمر نے تو گفٹ دے دیا ہے۔ تم نے بھی ثمر کو گفٹ دیا یا نہیں؟''
دوسری خاتون بولیں۔'' بھئی دیتے ہوئے دیکھا تو نہیں۔''
اُن کے شوہر جو بہت انہماک سے کیک پر ہاتھ صاف کر رہے تھے فوراً بولے۔
''ارے بھئی اگر دیا نہیں تو دینے کا وعدہ ہی کرلو۔'' سب ہنسنے لگے۔ کیونکہ اس جملے کے اندر بڑی گہرائی تھی جو بہت سے لوگوں نے محسوس کی تھی۔ بشمول چمن اور ثمر کے......
بانو آپا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ پھر ذرا خود کو سنبھال کر، تاکہ اُن کے لہجے کی تلخی ظاہر نہ ہو سکے، بولیں۔
''بھئی تین سال سے دلہن بیگم وعدوں پر ہی ٹرخا رہی ہیں۔ دعا کریں کہ اس سال اِن کا وعدہ پورا

ہو جائے۔"

بانو آپا کی بات سُن کر چمن کے چہرے پر جیسے اُداسی کے سائے منڈلانے لگے۔ کچھ دیر پہلے چمکتا ہوا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُسے سب مہمانوں کے سامنے کسی جرم کے سلسلے میں مجرمہ قرار دے دیا گیا ہو۔

ایک خاتون نے جو بہت سمجھدار تھیں، فوراً بات سنبھالی اور بولیں۔

"ارے بھئی بہت سارے لوگوں کے ہاں سالوں بعد اولاد ہوتی ہے۔ اب یہ تو اللہ کی طرف سے ہے۔ موقع بہت مبارک ہے۔ خوشیوں بھرا ہے۔ سب لوگ مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اِس خوبصورت جوڑے کو ایک چاند جیسا بیٹا عطا فرمائے۔"

بہت ساری آوازیں اُبھریں۔ "آمین۔"

بولنے والی خاتون بانو آپا کی گہری دوست تھیں جو بہت زیادہ Close تھیں۔ اُن کی طرف سے یہ کلمات آئے تو چمن نے ذرا حیرت سے اُن کی طرف دیکھا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا اُن خاتون کے لیے اُس کے دل میں بڑے اچھے جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ بانو آپا بولیں۔

"ہاں بھئی جب تک بچہ نہیں ہوتا سال ہی گنتے رہتے ہیں اور جب گود بھر جاتی ہے تو لگتا ہے جیسے وقت پر لگا کر اُڑ گیا۔ اور بچے جوان ہونے لگے۔" بانو آپا کی وہی دوست بولیں۔

"ارے بہن آپ نے تو بڑی تیزی دکھائی...... بچہ پیدا ہونے کی دعا کے ساتھ اُسے جوان بھی کر لیا۔"

یہ سُن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔ مگر چمن کے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ تھی۔ یوں لگا جیسے اُس کی خوشیاں ماند پڑ گئی ہوں اور چار طرف سے اُسے بے اولادی کے طعنے پڑ رہے ہوں۔

☆......☆......☆

چمن اور ثمر بیڈروم میں آ گئے تھے۔ تقریب کے اختتام کی ساری نشانیاں اُن کے چہروں سے واضح تھیں۔ ثمر کچھ زیادہ ہی تھکا تھکا دکھائی دے رہا تھا جب کہ چمن اپنی جگہ چپ چپ سی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اپنی جیولری اُتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھنے لگی۔

ثمر کو بھی جیسے محسوس ہو گیا تھا کہ چمن کچھ زیادہ ہی خاموش ہے۔ اُس نے اپنی طرف سے بات شروع کی۔

"کیا آج کا فنکشن بھی ہمیشہ کی طرح بہت شاندار رہا؟"

چمن گم صم کیفیت میں اپنی چوڑیاں اتارتے ہوئے بولی۔

"ہوں۔"

ثمر اپنا کوٹ ہینگ کرنے لگا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"جس کو بھی انوائیٹ کیا وہ آ گیا، کہنے کو چھوٹی سی تقریب تھی لیکن اچھی رہی۔" چمن اُسی طرح سر جھکائے ہوئے بولی۔

"ہوں۔"

اب ثمر اپنا کوٹ وارڈروب کی طرف لے جاتے ہوئے چونک کر چمن کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے چمن کی خاموشی بہت زیادہ محسوس ہوئی تھی۔

"یہ کیا...... ہوں...... ہوں کر رہی ہو؟ لگتا ہے تم کہیں کھوئی ہوئی ہو۔" چمن ایک دم اپنے دھیان سے چونک پڑی۔

"نہیں نہیں میں آپ کی بات سن رہی ہوں۔"

ثمر اپنا کوٹ ہینگ کر کے وارڈ روب میں لٹکانے کے بعد اُس طرف آیا جہاں گفٹ رکھے ہوئے تھے۔ پھر بچوں کی سی بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ چمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آؤ گفٹ دیکھتے ہیں۔" چمن نے بڑے تھکے تھکے انداز میں ثمر کی طرف دیکھا۔

"صبح دیکھ لیں گے ابھی تو بہت تھکن ہوگئی ہے۔ آپ کو پتا ہے میں صبح پانچ بجے سے جاگ رہی ہوں۔"

"جہاں اتنا جاگی ہو تھوڑی دیر اور سہی۔" ثمر بولا۔

"آپ بھی بالکل بچے بن رہے ہیں۔ اتنا جوش و خروش اور شوق تو بچے دکھاتے ہیں۔ اچھے ہی ہوں گے۔ ہر سال لوگ ہمیں اچھے ہی گفٹ دیتے ہیں۔"

"تمہیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟ دس پندرہ منٹ میں گفٹس دیکھ لیں گے پھر سو جائیں گے۔"

چمن نے ثمر کی طرف دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بلکہ خاصی بیزاری سے گویا ہوئی۔

کھول لیجیے۔ آپ کھول رہے ہیں، میں دیکھ رہی ہوں۔"

ثمر ایک گفٹ پیک کھولنے لگا۔ جس پر کئی تہیں چڑھی ہوئی تھیں...... کھولتے کھولتے بڑبڑانے لگا۔

"یا اللہ! یہ دردانہ آنٹی نے گفٹ دیا ہے یا پیاز؟ چھلکے پہ چھلکے اُتر رہے ہیں۔" وہ ریپر اتارتے ہوئے اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ کئی ریپر اُترنے کے بعد ایک خوبصورت سا ڈبہ برآمد ہوا۔ ڈبے کے اوپر ہی ایک بڑے سے گڈے کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

ثمر بے ساختہ ہنس پڑا اور اس نے ڈبہ کھول کر گڈا نکالا اور چمن کی طرف اچھال دیا۔

"یہ لو بھئی مائرہ آنٹی کی نئی نیک تمنائیں۔"

ثمر دوسرا پیک اٹھانے لگا تھا جب کہ چمن نے گڈا کیچ نہیں کیا تھا وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ چمن نے زمین سے گڈے کو اٹھا کر بڑے غور سے دیکھا۔ ایک اُداسی اور پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ پھر اس نے وہ گڈا ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور معنی خیز انداز میں بولی۔

"خدا جانے نیک تمنائیں ہیں یا دل آزاری......" ثمر کا موڈ ایک دم بدل گیا۔ اس نے ہلکی سی خفگی سے چمن کی طرف دیکھا۔

"بس تمہیں تو ڈپریشن میں جانے کی جلدی پڑی رہتی ہے۔ یار مذاق کو مذاق کی طرح لیتے ہیں۔" چمن جواب میں کچھ نہیں بولی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ثمر کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ثمر نے اُسے دونوں کندھوں سے تھام لیا اور بہت محبت سے بولا۔

"اِس طرح ہر بات دل پر نہیں لیتے چمن، خدانخواستہ بہت زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کتنی مثالیں تمہارے سامنے موجود ہیں۔ لوگ جب انتظار کر کے تھکنے لگے تو اللہ نے مراد پوری کی۔ اور پھر ایک کے بعد ایک بچے ہونے لگے۔ یہ تو اللہ کے کام ہیں، اس میں بندوں کا کیا قصور ہے۔ چلو اپنا موڈ ٹھیک کرو اور یہ دیکھو حمید انکل تمہارے لیے کتنی خوبصورت ساڑی لائے ہیں۔" اُس نے پیکٹ کھولتے ہوئے چمن کے سامنے کیا۔ ثمر اب

اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا کہ اُس کی باتوں کا کچھ اثر ہوا بھی کہ نہیں۔ چمن بھی اُس کا دل رکھنے کے لیے مسکرائی۔

''بہت خوبصورت ہے۔ حمید انکل ہر سال ہمیشہ بہت خوبصورت گفٹ دیتے ہیں۔ ہماری شادی پر بھی انہوں نے بہت خوبصورت گفٹ دیا تھا بلکہ سب سے اچھا گفٹ ہی ان کا تھا۔''

''اچھا تمہیں یاد ہے مجھے تو یاد نہیں؟'' ثمر نے جماہی روکتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ چمن نے گہری سانس لی اور بولی۔

''پتا نہیں یہ کوئی نفسیاتی مرض ہے یا عادت ہے بھولتی نہیں ہوں۔''

''یہ بہت خراب عادت ہے چمن، جنہیں بھولنے کی عادت نہیں ہوتی انہیں جو بھی زخم ملتا ہے۔ وہ انہیں ستاتا رہتا ہے، اور زخموں کے ساتھ زندگی بہت بوجھل ہو جاتی ہے۔ اپنی اس عادت سے چھٹکارا حاصل کرو۔ اگر میری طرف سے کوئی بات ہو تو مسئلہ ہے ناں، لیکن میں تو تمہیں کچھ نہیں کہتا۔ میں خوش ہوں۔ تم سے مجھے محبت ملی ہے۔ ہر طرح کا سکھ ملا ہے۔ اللہ نے چاہا اولاد بھی مل جائے گی۔

ثمر نے یہ کہہ کر چمن کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ چمن بھی خوبصورت مستقبل کے احساس سے بہل گئی۔

☆......☆......☆

بانو آپا اپنی کسی سہیلی سے اپنے دُکھڑے رو رہی تھیں۔ لہجے میں بڑی بے زاری اور نا اُمیدی تھی۔

''ارے بس! کیا بتائیں کیسی گزر رہی ہے۔ اللہ جانے وہ گھڑی کب آئے گی جب اِس گھر میں ثمر کے بچے کو ہنستا کھیلتا دیکھوں گی۔ اُس کی کلکاریاں سنوں گی؟؟''

دوسری طرف سے اُن کی سہیلی کہہ رہی تھی۔

''کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دو۔ ارے سال بعد ہی دکھا دینا چاہیے۔'' بانو آپا نے فوراً اُن کی بات کاٹ دی اور بڑے غصے سے بولیں۔

''ایک ڈاکٹر...... پتا نہیں کتنے ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں۔ ارے مجھے تو اِن ڈاکٹروں کا بھی اعتبار نہیں ہے۔ جس ڈاکٹر کو دکھاؤ یہی کہتا ہے۔ سب ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کسی بھی وقت اولاد ہو جائے گی۔ اب بتاؤ یہی کچھ سنتے سنتے تین سال گزر گئے۔''

بانو آپا کی سہیلی بانو آپا کی بات سُن کر بڑی تشویش بھری آواز میں کہہ رہی تھیں۔

''ارے تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی نے اُس کی کوکھ باندھ دی ہے۔'' بانو آپا ایک دم چونک پڑیں......

''کوکھ باندھ دی ہے۔ اے ہے...... کیا مطلب؟'' بانو آپا کی سہیلی بولیں۔

''بھئی مطلب وطلب کیا؟ تم اب اتنی ننھی سی بچی تو نہیں ہو۔ کوکھ باندھنے کا مطلب تمہیں نہیں پتا؟ یہ دشمنوں کی کارستانی ہوتی ہے۔ اپنی دشمنی نکالتے ہیں۔ اِس طرح سے تاکہ لوگ خوشیوں کو ترستے رہ جائیں اور دشمن بغلیں بجائیں۔''

بانو آپا نے ایک دم اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور بولیں۔ ''اے ہے، اِس طرف تو میرا دھیان بھی نہیں گیا۔ تمہیں کسی عامل کامل کا پتا ہو تو مجھے بتانا، اُسے بھی دکھا دوں گی۔ یہ تو تم نے صحیح کہا۔ ارے ایک ہی ایک بیٹا تھا میرا۔ ہر کوئی اپنی بیٹی دینے کے لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا مگر بھائی شادی تو میں نے اس کی ایک ہی کرنا تھی۔''

''میرا خیال ہے جن جن لوگوں کو مایوسی ہوئی ہے وہی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے ہیں۔'' بانو آپا کی سہیلی نے کہا۔

''اب آئی ہے تمہیں میری بات سمجھ میں حالانکہ تمہیں خود سے سمجھ جانا چاہیے تھا۔ ارے یہ دشمن بہت ظالم ہوتے ہیں۔ انہیں کوئی خوفِ خدا نہیں ہوتا۔ لوگوں کو برباد کرنے کے لیے جان تک لینے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ میں نے تو سُنا ہے سفلی علم سے تو لوگ مر جاتے ہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر......'' بانو آپا تو یہ سُن کر دھل گئیں، اور کانپتے ہوئے بولیں۔

''اے ہے، توبہ استغفار، اللہ معاف کرے، اللہ ایسے دشمنوں سے بچائے۔ میں تو اپنی بہو کو کسی عامل کے پاس آج ہی لے کر جاؤں گی۔ اگر تمہیں کسی کا پتا ہے تو مجھے بتا دو۔''

''تم کہیں ایسے ویسے عامل کامل کے پاس نہ چلی جانا۔ اتنے ڈبہ پیر بیٹھے ہوئے ہیں، لاکھوں روپے مانگتے ہیں منہ پھاڑ کر، ایک ٹکے کا کام نہیں کرتے۔ میں اِدھر اُدھر پتا کرتی ہوں۔ کوئی صحیح پیر ملتا ہے تو میں تمہیں اس کا پتا بتاتی ہوں۔'' بانو آپا کی سہیلی نے بڑی ہمدردی سے اُن کو کہا۔ بانو آپا کی ذرا تسلی ہوگئی۔

''اے ہئے خالدہ، بھول نہ جانا یاد رکھنا۔ اب تو میں اِس کا روحانی علاج ہی کرواتی ہوں۔ میرا دل بھی یہی کہہ رہا ہے کہ ضرور کسی نے کچھ کرا دیا ہے۔''

''اچھا چلو پھر تم سے بات ہوگی۔ مجھے ذرا ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ دو تین دن سے میرا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔ خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر لیا۔

☆......☆......☆

چمن کی بڑی بہن ایمن اپنی ماں عطیہ بیگم کے پاس آئی ہوئی تھی۔ عطیہ بیگم کے چہرے پر شدید اذیت اور کرب کی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ بے بسی کا وہ عالم کہ دِلاسہ دینا۔

ایمن کی کافی دیر تک سسکیاں سنتی رہیں۔ پھر شکستہ سی آواز میں بولیں۔

''بٹیا اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ایمن نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔ اور دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''امی! کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کو نہیں پتا اب اُس گھر میں چوبیس گھنٹے گزارنا ایسا لگتا ہے جیسے مجھے عمر قید ہوگئی ہے۔ ایک ایک لمحہ ایسا گزر رہا ہے آپ سوچ نہیں سکتیں۔''

عطیہ بیگم اُس کی بات سُن کر تڑپ تو گئیں لیکن خود کو سنبھال کر بڑے صبر و ضبط سے بولیں۔

''بیٹی یا بیٹے کا ہونا یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ اِس پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔''

''لیکن امی میرے سسرال والوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی انہیں کون سمجھائے؟'' ایمن پھر سسکیاں لینے لگی۔

''ناشکری کر رہے ہیں۔ اللہ نے ہر طرح سے صحت مند بیٹیاں دی ہیں۔ اولاد تو ہے۔ صحت مند اولاد سے بڑھ کر بھی کوئی نعمت ہوتی ہے کیا۔ یہ تو اُن سے پوچھو جو اولاد نہ ہونے کے دُکھ اٹھا رہے ہیں۔'' عطیہ بیگم نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا تھا۔

''امی ایک مرتبہ میں نے بھی اِس طرح کی بات کی تھی۔ گھر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ساس صاحبہ نے چیخ چیخ کر مجھے کوسنے دینے شروع کر دیے اور کہنے لگیں ایک تو بیٹیاں پیدا کر رہی ہے اوپر سے زبان بھی چلاتی ہے۔''

عطیہ بیگم نے ایک دم ایمن کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اُس کی پیشانی چوم لی۔

''اللہ تو یہی کہتا ہے بیٹی کہ صبر کرو اور رابطہ رکھو۔ بیٹا جب مشکل پڑتی ہے تو صبر کرنا پڑتا ہے۔ زہر کھا کر تو نہیں

مر جاتے۔'' ایمن فوراً بولی تھی۔

''میرا تو دل چاہتا ہے کہ زہر کھا کر ہی مر جاؤں۔''

عطیہ بیگم نے ایمن کو اپنے ساتھ لگا کر زور سے دبایا۔ اور اس کے بالوں پر اپنا چہرہ ٹکا کر بولیں۔

''کیوں دنیاداروں کے لیے اپنے منہ سے کُفر کی باتیں نکالتی ہو؟ اللہ نہ کرے، اللہ دشمن پر بھی ایسی گھڑی نہ لائے کہ وہ حرام موت مرے۔ بیٹا صبر نہ کرنے سے بڑا نقصان ہے اور صبر کرنے والے کو اگلے موڑ پر کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو حرام موت سے تو بچ جاتے ہیں۔''

''امی مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اب مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ اگر اِس مرتبہ بھی بیٹی ہوگئی تو آپ سوچ نہیں سکتیں جو میرے ساتھ ہوگا۔'' ایمن پھوٹ پھوٹ کر نئے سرے سے رونے لگی۔

''دیکھو بیٹا تم اگر ایسی حالت میں دن رات روتی رہو گی تو ہونے والے بچے کے نصیب پر، صحت پر برا اثر پڑے گا۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ ڈاکٹر بھی سمجھاتے ہیں کہ ایسی حالت میں عورت کو خوش رہنا چاہیے۔'' عطیہ بیگم سمجھانے لگیں۔

''تو پھر مجھے بتائیں امی کہ میں کیسے خوش رہوں؟ جب چاروں طرف سے طعنوں کے، ملامت کے تیر برس رہے ہوں تو مجھے بتایئے میں جان بچانے کے لیے کہاں جا کر بیٹھوں؟ اور خوش رہنے کے لیے کس راستے پر چلوں؟'' یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

عطیہ بیگم جو ایک ماں تھیں۔ اولاد کے دکھ پر اندر سے ریزہ ریزہ ہونے لگیں۔ لیکن بیٹی کو حوصلہ دینے کے لیے وہ اپنے اندر حوصلہ پیدا کرنے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

چمن حیران پریشان بانو آپا کی شکل دیکھ رہی تھی۔

''امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ ضعیف الاعتقادی کی انتہا ہے۔''

بانو آپا نے چمن کی بات سنی تو اُن کی ساری محبت اور ہمدردی ایک دم ہوا ہوگئی۔ غصے سے بھڑک کر بولیں۔

''اے ہاں ایک تم عقلمند ہو اِس دنیا میں اور سارے لوگ جو باہر پھر رہے ہیں یہ اپنے دکھوں کے علاج کے لیے۔ سارے کے سارے پاگل ہیں۔ ان کے اعتقاد خراب ہیں...... دین سے باہر ہوگئے ہیں؟''

چمن نے ایک گہری سانس لی اور ساس کے غصے کے جواب میں اُسی طرح سکون سے انہیں سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''امی جان آئے دن خبریں لگتی رہتی ہیں کہ پیروں فقیروں کے پاس جانے والی عورتوں کے ساتھ کیا کچھ ہوجاتا ہے۔ اپنا روپیہ اور وقت برباد کرتی رہتی ہیں۔''

بانو آپا ایک دم چیخ کر بولیں۔ ''اے بیوی اپنی یہ پڑھائی لکھائی اپنے ہوتوں سوتوں کے لیے اُٹھا کر رکھو۔ ہم تمہارے بھلے کی بات کر رہے ہیں۔ اللہ نہ کرے تمہارا کوئی نقصان کرنے نہیں جا رہے۔''

''امی مجھے آپ کی بات سمجھ آ رہی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ آپ یہ سب کچھ ہماری ہمدردی ہی میں کر رہی ہیں۔ لیکن میں آپ کو ایک حقیقت بتا رہی ہوں۔ آپ ٹی وی میں بھی دیکھ سکتی ہیں۔ اخباروں میں آئے دن آتا رہتا ہے۔ لوگ بتاتے رہتے ہیں کہ جگہ جگہ بیٹھے ہوئے پیر فقیر لوگوں کو خالی کر دیتے ہیں۔ آپ یہ بتایئے دیواروں پر

لکھا ہوا ہے کالے علم کی کاٹ کے ماہر اور چوبیس گھنٹے میں محبوب آپ کے قدموں میں۔ ہمارا تعویذ ایک رات میں اثر کرتا ہے۔ امی جب یہ لوگ اتنے با اثر ہیں۔ اتنے صاحبِ علم ہیں۔ تو اپنی حالت کیوں نہیں بدل لیتے؟ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بڑے بڑے بورڈ لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔'' چمن نے اب دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور صاف گوئی سے بولی۔

بانو آپا پر اُس کی بات کا کچھ اثر تو ہوا تھا۔ لیکن وہ جو سوچ جم چکی تھی، وہ ذہن سے اُکھاڑنا جیسے اُن کے اختیار میں بھی نہ تھا۔ کچھ سہیلی کا پلایا ہوا Doze اتنا طاقتور تھا کہ چمن کی دی ہوئی دوائی اُس پر اثر نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ بانو آپا فوراً بولیں۔

''بیٹا میں تمہیں یہ روڈوں پر بیٹھی ہوئی دکانوں میں نہیں لے کر جاؤں گی جب کچھ اصل ہوتا ہے تو اُس کی نقل بھی تیار ہو جاتی ہے۔ میں نے کسی بہت بڑے عامل کا پتا چلایا ہے۔ ان کے ہاں بہت رش لگا ہوا ہوتا ہے۔ اور وہ پیسے بھی زیادہ نہیں لیتے۔ سُنا ہے انہوں نے چندے کا چھوٹا بکس رکھا ہوا ہے۔ اپنی خوشی سے کوئی اُس میں دس پانچ ڈال دے تو ٹھیک ہے۔'' چمن چند لمحے سر جھکا کر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''امی ہم نے کسی کے ساتھ کیا کیا ہے، کوئی ہمارے ساتھ دشمنی کیوں کرے گا؟'' بانو آپا اب بھڑک کر بولیں۔

''ارے ہمارے کرنے کی وجہ سے لوگ ہمارے دشمن تھوڑی نا بنیں گے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ہماری خوشیوں سے جلتے ہیں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ لوگوں کو آگ لگی ہوئی ہوگی کہ وہ خوش کیوں ہے؟''

''امی جان یہ تو ہمارے اندازے ہیں ناں۔ اِن تمام باتوں کی تصدیق تو نہیں ہو سکتی۔ ہم وہم و گمان میں پریشان ہو کر کیوں اپنا وقت برباد کریں۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے تھوڑا اور سہی، سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اِن عاملوں کاملوں کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔''

بانو آپا اب غصے سے جیسے تھر تھر کانپنے لگیں۔ چمن کا صاف انکار ان کے لیے تو ایک بہت بڑا دھکا تھا۔ اُن کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ وہ تو یہ سوچ بیٹھی تھیں کہ آج سے اس کا روحانی علاج شروع ہو جائے گا، تو دس مہینے کے بعد گھر میں پوتا کھیلنے لگے گا۔ چمن نے تو جی بھر کر انہیں مایوس کر دیا تھا۔ اب تو وہ کھلم کھلا اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے لگیں اور زور سے چلا کر بولیں۔

''ارے یہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں اسی وجہ سے نامراد پھرتی ہیں کہ بڑوں کی باتوں پر کان نہیں دھرتیں۔ ہم پاگل ہیں؟ اور ہاں یہ بات بھی ذہن میں بٹھا لو کہ اولاد میاں بیوی کے بندھن کو مضبوط کرتی ہے۔ تم ایک ایسی جگہ پر کھڑی ہو جہاں آگے کنواں اور پیچھے کھائی ہے۔ مرد کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ چاہے میرا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اولاد کی خاطر اُس نے دوسری شادی کرلی۔ تو کیا کرو گی؟ پتھر پڑیں تمہاری عقل پر۔ اللہ ایک موقع دے رہا ہے مگر تم جان بوجھ کر گنوا رہی ہو۔''

چمن نے ایک دم دھل کر بانو آپا کی طرف دیکھا۔ ''دوسری شادی......؟'' بانو آپا بڑی بے نیازی سے گویا ہوئیں۔

''اے تو میں نے کون سا ایسی انوکھی نرالی بات کی ہے۔ جو دوسری شادی کرتے ہیں وہ کیا ساتویں آسمان پر رہتے ہیں؟ یہیں رہتے ہیں، اِسی دنیا میں سب کچھ یہیں ہو رہا ہے اور تم دیکھ بھی رہی ہو اپنی آنکھوں سے۔''

''امی جان میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگوں کے ہاں دس دس بارہ بارہ سال اولاد نہیں ہوتی اور پھر ہو بھی جاتی ہے۔ میری شادی کو تو ابھی تین سال ہی ہوئے ہیں۔''

''اے ہاں تو وہ بھی اِسی طرح سے توڑ کرواتے ہوں گے تو اُن کی اولاد ہوتی ہوگی۔ انہیں بہت دیر میں ہوش آتا ہے، ہم ذرا جلدی یہ کام کررہے ہیں۔ ارے بیٹا! کالے علم کی کاٹ ہو جائے گی تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔''

چمن ان کی بات سُن کر جیسے تھک سی گئی۔ اسے یوں لگا وہ کچھ بھی کہے گی بانو آپا ہار نہیں مانیں گی۔ اِس لیے اُس نے بہت آہستگی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے امی جان! آپ جہاں چاہیں مجھے لے جائیں لیکن آپ ثمر سے ضرور بات کریں۔ میں اُن کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' بانو آپا ایک دم چونک پڑیں۔ جیسے چمن نے کوئی دھماکہ سا کیا تھا۔

''ارے تمہیں میری بات ہی نہیں سمجھ آ رہی اور میری بات سُن لو، تمہاری یہ خوبیاں اور یہ تمہاری تابعداریاں زیادہ دیر تک تمہارا ساتھ نہیں دیں گی۔ آج نہیں تو کل اولاد کی خاطر ثمر دوسری شادی کرلے گا۔ بیٹھی دیکھتی رہ جانا۔ اور یہ بھی سن لو! اگر میرا بیٹا اولاد کے لیے دوسری شادی کرے گا تو میں اُس کے ساتھ کھڑی ہوں گی۔ اکیلا نہیں چھوڑوں گی اُسے۔ آج میں تم سے ہمدردی کررہی ہوں اِس لیے تم سے بات کررہی ہوں۔ اگر میں تمہاری ہمدرد نہ ہوتی تو اپنے بیٹے کو بہلا پھسلا کر دوسری شادی کی باتیں کرنا شروع کردیتی مگر تمہیں سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ پتا نہیں کس ہوا میں ہو؟'' یہ کہہ کر وہ غصے سے لاؤنج سے نکل گئی تھیں۔

چمن کے کانوں میں چاروں طرف سے دوسری شادی، دوسری شادی کی بازگشت گونج رہی تھی۔

☆......☆......☆

عطیہ بیگم ایمن کو ساتھ لے کر اُس کے گھر چھوڑنے آئی تھیں۔ ایمن کی ساس فردوس کا منہ اُسی طرح سے پھولا ہوا تھا۔ جب کہ عطیہ بیگم بہت رکھ رکھاؤ، بہت صبر و ضبط اور شائستگی سے اُن سے بات کررہی تھیں۔

''دیکھیں فردوس آپا اللہ کے کاموں میں کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ آپ لوگ انسانیت کے ناتے کچھ دیر کے لیے سوچیں، بھلا یہ بیٹا یا بیٹی پیدا کرنا عورت کے اختیار کی بات ہے؟''

''اے بہن ہم میں انسانیت ونسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو تم اپنے دماغ میں بٹھا لو اور ہم سے کوئی اچھی اُمید نہ کرنا۔ ہمیں بیٹا چاہیے۔ ہمارے ہاں زیادہ بیٹیاں پیدا کرنے کا رواج ہی نہیں ہے۔ اور پہلوٹی کا تو ہمارے ہاں ہمیشہ بیٹا ہوتا ہے۔ پورے خاندان میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میرے بیٹے کے ہاں لگاتار دو بیٹیاں ہوئی ہیں۔'' فردوس کے انداز میں اکڑ بھی تھی، تکبر بھی تھا اور قطعی پن بھی......

''ابھی تو صرف دو بیٹیاں ہیں۔ یہ معصوم خوبصورت پھول جن سے آپ کا آنگن مہک رہا ہے۔'' فردوس نے ایک دم ہاتھ اُٹھا کر عطیہ بیگم کو مزید بات کرنے سے روک دیا۔

''ہمیں نہیں چاہیے یہ مہک دہک، ہمیں تو چاند ستارے کی طرح چمکتا ہوا ایک پوتا چاہیے، بس سو کی ایک بات۔''

''تو پھر آپ اللہ سے دعا کریں۔ یہ میری بیٹی کے اختیار کی بات نہیں۔'' عطیہ بیگم اُسی طرح تحمل اور صبر و ضبط سے گویا ہوئیں۔

''اچھا اگر تمہاری بیٹی کے اختیار کی بات نہیں تو پھر میں اپنے بیٹے کا دوسرا نکاح پڑھوا دیتی ہوں۔ اِس لیے کہ مجھے تو پوتا چاہیے۔ میرا ایک ہی ایک بیٹا، خدانخواستہ اُس کے ہاں بیٹا نہ ہوا۔ سمجھو ہماری تو نسل ختم ہوگئی۔ ہمارا تو کوئی نام لینے والا نہیں ہے۔'' فردوس ایک دم چونک کر بولی تھی۔

''آپ بس اللہ سے اچھی اُمید رکھیں۔ اب بے شمار گھر ایسے ہیں جہاں پہلے بیٹیاں پیدا ہوئیں بعد میں بیٹے بھی ہوئے۔ آخر مایوسی کی کوئی وجہ تو ہو؟''

''یہ نصیحتیں فضیحتیں، اپنے پاس رکھو، جب تمہاری بیٹی میں کوئی قابلیت ہی نہیں ہے تو ظاہر ہے پھر ماں اِسی طرح نصیحتیں فضیحتیں کر کے کام چلائے گی۔ لیکن ایک گاڑی چلتی ہے ایک کھینچی جاتی ہے۔ اور کھینچی جانے والی گاڑی زیادہ دیر آگے جاتی نہیں ہے۔''

''آپ اللہ سے دعا کریں۔ سب کچھ خیریت سے ہو۔ بیٹی ہو یا بیٹا، اللہ کی دین ہے، اُس کے فیصلے ہیں۔'' عطیہ بیگم بڑی عاجزی سے سر جھکا کر بولیں۔

اس لیے کہ ایک جرم تو یہ تھا کہ وہ بیٹی کی ماں تھیں اور دوسرا جرم یہ تھا کہ اُن کی بیٹی کے ہاں ابھی تک بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا۔

فردوس ایک دم صوفے سے کھڑی ہوگئیں اور ایمن کو مخاطب کر کے بولیں۔ ''ارے اماں کو ساتھ لے کر آئی ہو ایک ٹھنڈا گلاس شربت تو پلا دو۔ بیچاری کا تقریریں کر کر کے حلق سوکھ گیا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ بڑے گھمنڈ سے چلتی ہوئی گھر کے کسی حصے کی طرف بڑھ گئیں۔ عطیہ بیگم نے چمن کی طرف دیکھا اور بولیں۔

''بیٹا! بس ہمت سے کام لو۔ میں تو تمہیں یہی کہوں گی کہ یہاں اِس دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی آزمائش سے گزر رہا ہے۔ یہ تمہارے حصے کی آزمائش ہے۔ صبر اور ہمت سے کام لوگی تو اللہ مدد کرے گا۔ ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' بولتے بولتے عطیہ بیگم کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی اُتر آئی تھی۔

☆......☆......☆

ثمر اپنے بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گود میں لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔ اپنی پوری ای میلز چیک کر رہا تھا۔ چمن اُس کے لیے کوفی لے کر آئی تھی۔ اُس کا موڈ بہت خراب تھا۔ اُس نے کوفی کا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ثمر کو متوجہ کیا۔

''ثمر یہ کوفی پی لیں۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔''

ثمر اُسی طرح مصروف انداز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ رکھ دو، پیتا ہوں۔''

''مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے۔ مجھے پانچ منٹ دے دیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' چمن اُس کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اپنا سر خود ہی دبانے لگی۔ چمن کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ثمر کو سر اٹھا کر چمن کی طرف دیکھنا پڑا۔ چمن کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی نظروں میں فکرمندی اور تشویش کا تاثر جھلکنے لگا، حیران سا ہو کر بولا۔

''تمہیں کیا ہوا؟''

''آپ کو تو اپنے کاموں سے ہی فرصت نہیں ہے۔ بتایئے مجھے، چلی جاؤں میں امی کے ساتھ اُن پیروں فقیروں کے ہاں پیسے لُٹانے کے لیے اور وقت برباد کرنے کے لیے؟'' ثمر نے ایک دم لیپ ٹاپ گود سے اٹھا کر

ذیابیطس: عہد حاضر کا انتہائی پریشان کن مسئلہ

پاکستان میں ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد 62 لاکھ سے زائد ہو چکی ہے۔ IDF کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں اس مرض کا تناسب 12 فیصد ہو چکا ہے۔ جبکہ پاکستان میں ماہرین نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر دس میں سے ایک فرد ذیابیطس کے مرض کا شکار ہے اور آئندہ سالوں میں یہ تعداد دُگنی ہو سکتی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں جسمانی ورزش یا جسمانی کھیل کود میں کمی، فاسٹ فوڈز کا بڑھتا ہوا رجحان، کولڈ ڈرنک اور آئس کریم کا بہت زیادہ استعمال، کمپیوٹر گیمز، ٹیلی وژن، ڈپریشن اور ہر وقت کی سوچ، یہ وہ تمام وجوہات ہیں جس کی بنا پر 8 سے 11 سال تک کے بچوں اور نوجوانوں میں ذیابیطس دوم تیزی سے بڑھ رہا ہے اور ماہرین نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر طرزِ زندگی میں تبدیلیاں نہ لائی گئیں تو آئندہ سالوں میں یہ مرض بچوں اور نوجوانوں میں وباء کی طرح پھیل سکتا ہے۔

شاہین صدیقی کی تحقیق سے، حجاب بٹ۔ کراچی کا انتخاب

بیڈ پر رکھ دیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ چمن کے قریب آ کر بولا۔

''بیوقوف! تم سے کون کہہ رہا ہے یہ پیروں فقیروں کے ہاں جانے کے لیے؟ کیا میں نے تم سے کبھی کوئی ایسی بات کی؟''

''آپ نہیں کر رہے، آپ کی امی تو کر رہی ہیں۔ روز صبح اُن کا یہ پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ بس میں آپ سے ذکر نہیں کرتی۔ لیکن آج تو حد ہی ہو گئی۔ لگ رہا ہے وہ ہر صورت مجھے کل لے کر جائیں گی اور میں نہیں جانا چاہتی۔'' چمن نے دوٹوک فیصلہ سُنا دیا۔

ثمر بے ساختہ مسکرا دیا اور اپنا سر جھٹک کر بولا۔

''لاحول ولاقوۃ! ارے بھئی! سمجھا دوں گا ماں کو۔ میں تو خود ان پیروں فقیروں کی باتیں سُننا پسند نہیں کرتا۔ کیا جہالت ہے، اپنی قسمت تو بدل نہیں سکتے دوسروں کی تقدیریں بدلنے بیٹھے ہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔ چمن نے سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

''جی یہی بات میں نے امی جان سے بولی تھی تو وہ پورا راشن پانی لے کر مجھ پر چڑھ دوڑیں۔'' ثمر فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

''خیر ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو میں امی جان سے بات کر لوں گا۔ زبردستی نہیں کریں گی تمہارے ساتھ۔''

''آپ کے سامنے کہہ دیں گی۔ ہاں نہیں جاؤں گی۔ صبح پھر کھڑی ہو جائیں گی اور ساتھ میں مجھے دھمکی بھی دیں گی کہ ثمر کو نہ بتانا۔ اب بتایئے میں کیا کروں؟'' ثمر یہ سب کچھ سُن کر چند لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ کیونکہ اُسے اپنی ماں کا بھی پتا تھا اور چمن کا بھی...... دوسرا یہ کہ وہ خود عاملوں کاملوں کے پاس جانے میں یقین نہیں رکھتا تھا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، اب تو امی جان سوگئی ہوں گی۔ میں صبح بات کرتا ہوں اُن سے۔''

چمن برجستہ بولی۔ ''آپ بات کریں گے پھر اُس کے بعد وہ بھی مجھ سے بات کریں گی، وہ تو میں رات تک بھگتوں گی جب تک آپ گھر واپس نہیں آتے۔ میں تو کہہ رہی ہوں اگر امی جان مجھے لے جانے کی بات کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بھی چمن کے ساتھ جاؤں گا۔'' ثمر ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''لو بھئی! میں کیوں جانے لگا؟ میں کیوں جاؤں۔ دماغ خراب ہے میرا؟''

''یہ نیا زمانہ ہے، ڈاکٹر کے پاس جاؤ اور بتاؤ کہ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہو رہی تو وہ کہتے ہیں کہ دونوں میاں بیوی اپنا ٹیسٹ کروائیں۔ اس لیے آپ امی جان کو کہیں کہ وہ جہاں پر بھی میرا چیک اپ کرانے جا رہی ہیں۔ تو پھر ہم دونوں کو ساتھ لے کر جائیں۔ اکیلے نہیں جاؤں گی میں۔''

''میں تو خیر جانے سے رہا، یہ تو تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ اور رہی یہ بات کہ امی تمہارے ساتھ زبردستی کریں گی۔ جب وہ کریں گی تو میں دیکھ لوں گا۔''

''آپ بارہ گھنٹے باہر ہوتے ہیں اور میں امی جان کے ساتھ۔ آپ کو کیا پتا مجھے کیا کچھ سُننا پڑتا ہے۔''

ثمر کوفی کا مگ اٹھا کر دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور بڑی بے زاری سے بولا۔

''ارے بھئی، پتا نہیں دنیا میں لوگ لوگوں کی کیا کیا سنتے رہتے ہیں؟ تم میری ماں کی بھی دو چار سُن لو گی تو کوئی فرق نہیں پڑ جائے گا۔ یہ سمجھ کر Avoid کر دیا کرو کہ عمر ہو گئی ہے، اب وہ اسی طرح کی باتیں کر کے باقی زندگی گزاریں گی۔ تمہیں ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔''

چمن نے گہری سانس لی بڑی بے بسی کی کیفیت تھی۔ کیونکہ ساس کے سامنے بھی بولتے بولتے تھک جاتی تھی اور ثمر کے سامنے بھی۔ یوں لگتا تھا جیسے آس پاس کوئی اُس کی بات سمجھنے والا ہی نہ ہو۔ وہ موڈ آف کیے کمرے سے باہر جانے لگی۔ اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اب وہ ثمر کے سامنے بیٹھ کر روٹین کی باتیں کرے۔ اور نہ ہی وہ ذہنی طور پر اِس قابل تھی کہ اچھی باتیں کر سکے۔ ثمر نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا تو ٹوکا۔

''اور بات سنو......'' چمن جاتے جاتے ایک دم پلٹ آئی۔ یہ سوچ کر کہ جانے ثمر نے کیا خاص بات کہنے کے لیے اُسے مخاطب کیا ہے یا کچھ بچ گیا تھا وہ دینے کے لیے روکا ہے، بولی کچھ نہیں صرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ثمر نے شہادت کی انگلی اٹھا کر وارننگ کے انداز میں کہا۔

''بات سنو! یہ جو تم ٹیسٹ ویسٹ کرانے کے چکروں میں یہاں وہاں ماری ماری پھرتی ہو ناں بہت شوق سے یہ کام کرو۔ سارے ارمان ٹھنڈے کرو۔ خبردار میرے بارے میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بالکل پرفیکٹ ہوں مجھے کسی چیک اپ، ویک اپ کی ضرورت نہیں ہے۔ گالی کی طرح لگتی ہے مجھے یہ بات۔ مت کیا کرو میرے سامنے اِس طرح کی باتیں۔'' اُس نے کوفی کا مگ پٹخنے کے انداز میں ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ چمن تو جیسے سب کچھ بھول بھال کر حیران پریشان اُس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ایمن کی ساس گھر کا سودا سلف لینے کے لیے گھر سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایمن کو بہن سے فون پر بات کرنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ اُس نے چمن کا نمبر ڈائل کیا۔ چمن کے بجائے بانو آپا نے کال ریسیو کی۔ ایمن کو طوعاً کرہاً آخر سلام تو کرنا ہی تھا۔ اُس نے سلام کیا تو بانو آپا بولیں۔

''جیتی رہو، اے خیر سے اُمید سے ہو؟ بتایا تھا مجھے چمن نے، اللہ اس مرتبہ تمہیں بیٹا دے۔ بہن سے بات کرنے کو فون کیا ہوگا۔ ابھی بلاتی ہوں چمن کو۔'' بیٹے کی دعا دینے کے ساتھ ہی وہ ایمن کو ہولڈ کرا کر چمن کو بلانے چلی گئیں۔

ایمن کے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ بیٹا، بیٹا بیٹا! یا اللہ اگر بیٹا اتنا ہی ضروری ہوتا ہے کہ بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے ایک عورت پر زندگی کا ایک ایک لمحہ بھاری ہو جائے تو پھر بیٹیاں پیدا کیوں ہوتی ہیں؟ دکھ اٹھانے کے لیے، دن رات کی اذیت اٹھانے کے لیے اور بیٹوں کے خواب دیکھنے کے لیے۔ وہ ریسیور کان سے لگائے لگائے جیسے اندھیرے راستوں میں کہیں سفر کرنے لگی تھی کہ اُس وقت اُس کی سماعت سے چمن کی آواز ٹکرائی۔

''ہیلو آپا...... کیسی ہیں؟'' ایمن نے فوراً خود کو سنبھالا۔

''میں ٹھیک ہوں چمن۔ بس وہ موقع ہی نہیں ملتا تم سے بات کرنے کا۔ ہر وقت تو ساس صاحبہ سر پر سوار رہوتی ہیں۔ پتا نہیں سمجھ ہی نہیں آتی کوئی ایک ایشو نہیں ہے۔ تیل سالن میں زیادہ ڈالتی ہوں برتن ٹھیک سے دھونے مجھے نہیں آتے، کپڑوں پر استری کرنا نہیں آتی، چائے بنانا نہیں آتی اور ایک جُرم جو سب سے بڑا ہے وہ یہ کہ بیٹا نہیں ہے۔'' چمن بہن کی روہانسی آواز سُن کر تڑپ سی گئی۔ پھر چمن ایمن کو سمجھانے لگی۔

''آپا ہر جگہ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے۔ جلدی میں کوئی ایسی بات مت کر بیٹھیے گا جو بوجھ ہلکا کرنے کے بجائے بوجھ بڑھا دے، جہاں اتنا صبر کیا ہے تھوڑا سا صبر اور کر لیں۔'' ایمن بولی۔

''چمن بار بار صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی خود کو سمجھانا شروع کر دیتی ہوں۔ لیکن آخر انسان ہوں۔''

ایمن اب بات کرنے کے قابل نہ رہی سسکیاں لینے لگی۔ چمن نے گہری اور ٹھنڈی سانس لی بہن کا دکھ اُسے تڑپا رہا تھا مگر وہ خود کو پُرسکون ظاہر کر رہی تھی۔ تاکہ حوصلہ دیکھ کر ایمن کو حوصلہ ہو۔

''آپا میں ایک دو دن میں آپ کی طرف آؤں گی پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

''ایک دو دن میں کیوں، آج ہی کیوں نہیں آ رہیں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم آؤ۔ میں تم سے بہت ساری باتیں کروں۔''

''آپا وہ مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک دم سے بتا کر گھر سے باہر جا نہیں سکتی۔ مجھے پہلے ذہنی طور پر پلاننگ کرنا پڑتی ہے پھر گھر میں بتانا پڑتا ہے۔ اور کہیں بھی جانا ہو تو ایک دن پہلے تو کم از کم مجھے بتانا ہوتا ہے۔'' چمن بہت رُک رُک کر سنبھل سنبھل کر بات کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ کہیں بانو آپا نے سُن نہ لیا ہو۔ ویسے بھی اُن کے کان ہر وقت کھڑے ہی رہتے تھے۔

''کیوں تمہاری ساس کیا تمہارے آنے جانے پر پابندی لگاتی ہیں؟'' ایمن نے بہت دکھ سے پوچھا۔

''نہیں آپا پابندی تو نہیں لگاتیں۔ لیکن...... خیر چھوڑیں۔ میں آپ کے پاس آؤں گی ناں پھر بات کرتے ہیں۔''

''ہاں میں سمجھ گئی ظاہر ہے تم اپنے گھر میں بیٹھ کر بات کر رہی ہو۔ کہیں کسی نے کچھ سُن کر اپنے طور پر معنی نکال لیے تو ایک غلطی ہو جائے گی۔ میں سب سمجھتی ہوں چمن۔ بس تم کسی طرح سے ٹائم نکال کر آ جاؤ میرے

پاس۔ پتانہیں کیوں میرا دل اب ہر وقت گھبراتا رہتا ہے۔''

''میں ضرور آؤں گی آپا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔ اور دیکھیں ہمت سے کام لیں۔ چھوٹی چھوٹی سی بچیاں ہیں، آپ کی ذمہ داری ہیں اور انہیں آپ کی توجہ، محبت، صحت سب چیزوں کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے چمن، خدا حافظ!'' ایمن کی آواز میں اِس مرتبہ تھوڑا سا حوصلہ، تھوڑی سی زندگی محسوس ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

فردوس اور ایمن کے سُسر حامد حسین دونوں بہت غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ تو ڈاکٹرنی بھی اِس کے ساتھ مل گئی۔ اِس نے ضرور اِس کو دو چار ہزار کی رشوت دی ہوگی ورنہ وہی ڈاکٹرنی ہماری کیوں نہ بن جائے؟'' فردوس غصے میں بولی تھی۔

''ارے تم زیادہ ٹینشن مت لو۔ میں اِس ڈاکٹرنی سے خود بات کرتا ہوں۔ اگر اس نے دو چار ہزار دیے ہیں میں دس ہزار دینے کو تیار ہوں۔'' حامد حسین نے بڑے پیار سے اپنی بیوی کو تسلی دی۔

''کمال کرتے ہیں آپ۔ فالتو ہیں ہمارے پاس دس ہزار، ارے دنیا ڈیڑھ ڈیڑھ سو دو دو سو دے کر الٹرا ساؤنڈ کرا کے فارغ ہو جاتی ہے۔ ہم ہزاروں روپے کو آگ لگاتے پھریں۔ آخر اتنا زور کیوں دکھا رہی ہے ہمیں۔ اتنا زور ہے اس میں۔ ہمارا مقابلہ کر سکتی ہے؟''

لو سُنو ذرا ڈاکٹرنی بھی کہہ رہی ہے۔ آپ لوگوں کو کیا ٹینشن ہے۔ بیٹا ہوگا یا بیٹی جو بھی ہوگا آپ کے سامنے آ ہی جائے گا۔ ضرور اس نے ڈاکٹرنی کو کچھ کہا ہے۔ ورنہ کوئی ڈاکٹرنی یہ بات ساس سسر سے نہیں بولتی۔ میں نے تو آج تک نہیں سُنا کہ کسی ڈاکٹرنی نے ایسا بولا ہو۔ یقیناً اس نے ایک کی دس لگائی ہیں۔ اُسے کیا خبر کیا جھوٹ سچ سُنا ہے کہ ڈاکٹرنی اُس کا پردہ رکھنے لگی؟ اب آپ رعب سے کہیں کہ وہ اس کو دس جوتے لگا کر الٹرا ساؤنڈ کے لیے لے کر جائے ورنہ......''

حامد حسین نے بیوی کی طرف دیکھا۔ ''ہاں......پھر......ورنہ......ورنہ کیا کرو گی تم؟''

''تو پھر دس جوتے میں لگا دوں گی۔'' فردوس نے بڑے کرّ و فر سے کہا۔

''ارے بیگم، یہ بہوؤں کو دس دس جوتے لگانے کا زمانہ نہیں ہے۔ ذرا دماغ کو ٹھنڈا رکھو، کچھ عقل سے کام لو۔ ابھی تو یہی نہیں پتا کہ بیٹا ہے یا بیٹی! ابھی سے مار پیٹی شروع کر دو گی تو گھر جا کر بیٹھ جائے گی اور مسئلہ ہو جائے گا۔ اور وہاں باپ کے گھر میں بیٹھ کر اگر بیٹا پیدا کر لیا تو سمجھو تمہارا بیٹا بھی تمہارے ہاتھ سے گیا۔''

فردوس تو اب ایک دم چونک پڑی تھیں انہوں نے اپنے شوہر کی طرف بڑی ستائشی نظروں سے دیکھا۔

''ٹھیک کہتے ہیں عورتیں تو بیوقوف ہوتی ہیں۔ آپ نے واقعی اِس وقت بڑی عقل کی بات کی ہے۔ لیکن الٹرا ساؤنڈ تو اُسے کرانا پڑے گا۔''

''ہاں تو میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ نہیں کرانا پڑے گا۔ ہم دوسری ترکیبیں لڑائیں گے مگر ہم اِسی ہفتے پتا چلائیں گے کہ اس مرتبہ بیٹا ہے یا بیٹی۔''

فردوس تڑ سے بولیں۔ ''ارے مجھے رات کو نیند نہیں آتی آپ کیا بات کرتے ہیں۔ ساری دنیا میں تھو تھو ہو رہی ہے ارے میری تینوں جٹھانیاں، دونوں دیورانیاں، پانچوں نندیں سب کے گھروں میں بیٹے کھیل رہے ہیں۔ ارے مجھے تو شرم آتی ہے اب اُن لوگوں کے سامنے جاتے ہوئے۔'' فردوس بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف

چل دیں۔

''ارے بیٹھو تو کہاں چل پڑیں؟''

''ارے چائے بناتی ہوں سر میں درد ہو رہا ہے۔ آپ پئیں تو بولیں آپ کے لیے بھی بنا دوں۔''

''لو نیکی اور پوچھ پوچھ، بہو کے ہوتے ہوئے خود چائے بنا رہی ہو۔ تو بھئی ہم بھی اپنی بیوی کے ہاتھ کی چائے پی لیتے ہیں۔'' حامد حسین نے طنزیہ انداز میں بڑی بلند آواز میں کہا۔ یوں جیسے کوشش کر رہے ہوں کہ اُن کی بلند آواز ایمن سُن لے۔

☆......☆......☆

ثمر گھر آ چکا تھا۔ چمن کچن میں جلدی جلدی کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی تھی۔ وہ کھانا بنانے کے دوران مسلسل ایمن کے بارے میں ہی سوچتی جا رہی تھی۔ اس لیے چہرے پر دکھ اور ملال کی کیفیت بھی تھی۔ اُسی لمحے بانو آپا نے اندر داخل ہو کر اُسے چونکا دیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ انہوں نے تو جیسے دھاوا بول دیا۔ اور بہت گرم نظروں سے اُس کو گھورتے ہوئے بولیں۔

''میں تمہارے بھلے کی بات کرتی ہوں اور تم ماں بیٹے میں جنگیں چھڑوا رہی ہو؟'' چمن یہ سن کر ایک دم خوفزدہ ہوگئی۔

''خدانہ کرے امی جان کہ میں ایسی کوئی حرکت کروں اور مجھے ضرورت کیا ہے؟'' چمن جلدی سے گھبرا کر بولی۔

''شکل کیسی معصوم بنالیتی ہو۔ کیا کہا تھا تم نے ثمر سے؟'' وہ ڈانٹنے کے انداز میں پوچھنے لگیں۔

چمن اب اور گھبرا گئی۔

''میں نے تو اُن سے کچھ بھی نہیں کہا امی۔ بس اُن سے یہی کہا تھا کہ امی کہیں کسی عامل کے پاس جانے کی بات کر رہی ہیں، تو آپ بھی ساتھ چلیں۔ کیونکہ مجھے ڈر لگتا ہے ایسی جگہوں پر اکیلے جاتے ہوئے۔''

''ایسے تو خیر تم نے نہیں کہا ہوگا۔ جتنا اِس وقت تم بن بن کر بول رہی ہو۔ اُس کا تو موڈ بہت خراب تھا۔ اُس نے مجھ پر چڑھائی کر دی۔ ایک نہیں سُنی میری۔ تم اجازت کی بات کر رہی ہو؟'' بانو آپا نے پھر گھور کر چمن کو دیکھا اور تلخ لہجے میں بولیں۔

''میں نے اُن کے سامنے ایک بات کی تھی امی جان، حالانکہ مجھے یہ عاملوں وغیرہ کے چکر خود پسند نہیں لیکن آپ کے کہنے کی وجہ سے میں نے اُن سے بات کی تھی کہ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔ ساتھ چلتے ہیں یا مجھے آپ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔''

''ارے بس چھوڑو۔ اتنا بن بن کے بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جانتی نہیں ہوں کیا میں آج کل کی لڑکیوں کو، جس طرح سے شوہروں کے کان بھرتی ہیں اور سنو میں نے منع بھی کیا تھا کہ اس کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرد کہاں مانتے ہیں اِن باتوں کو؟''

''امی جان اب دیکھیے ناں آج تک میں ثمر کو بتائے بغیر کہیں نہیں گئی حتیٰ کہ میں گھر کا سودا سلف لینے بھی جاتی ہوں تو اُن کو بتا کر جاتی ہوں کہ میں اِس وقت گھر سے باہر جا رہی ہوں اور کس کام سے جا رہی ہوں۔''

''بند کرو یہ ڈرامے بازی، ارے وہ تو میری بات سننے پر راضی ہی نہیں۔ ایسا تپا ہوا تھا کہ میری بات فوراً کاٹ دی۔ میں نے صاف کہہ دیا خبردار بزرگوں کی شان میں گستاخی کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''امی ٹھیک ہے ناں جب انہوں نے منع کر دیا ہے تو ضرورت کیا ہے۔ آپ ثمر کی ماں ہیں۔ آپ ثمر کی خوشیوں کے لیے سب کچھ کر رہی ہیں۔ اور میں ثمر کی بیوی ہوں۔ ایک عورت ہوں۔ کون سی ایسی عورت ہے جو نہیں چاہتی کہ اُس کی گود میں اُس کا اپنا بچہ ہو۔''

''ہاں بیٹھ جاؤ اب لمبی لمبی تقریریں کرنے، اتنی سی بات کرو پوری کہانی سُنانا شروع کر دیتی ہو۔ ارے بھیا آج کل کی لڑکیوں سے اللہ بچائے۔ ایسی حرفوں کی بنی ہوتی ہیں کہ توبہ۔ چاہنے والے، پیار کرنے والے رشتوں میں پھوٹ پڑوا دیتی ہیں۔ لو آج بیٹا، ماں سے اِس طرح سے بات کر رہا ہے۔ جیسے وہ عالم فاضل بزرگ بن گیا ہو۔ اور اُس کی ماں تو ذرا سی بچی ہو۔'' بانو آپا کچن سے جا چکی تھیں مگر اُن کے بڑبڑانے کی آواز ابھی تک کچن میں آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

چمن بیڈ روم میں تکیے سے ٹیک لگائے بڑی گہری سوچ میں تھی۔ ثمر اس وقت LCD اسکرین پر کوئی دلچسپ پروگرام دیکھنے میں مشغول تھا۔ جیسے ہی بریک آیا ثمر نے Mute کر دیا۔ کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔ ثمر نے گردن موڑ کر چمن کی طرف دیکھا۔

''خیریت ہے! مراقبہ ہو رہا ہے؟'' چمن ایک دم چونک پڑی اور مسکرائی۔

''نہیں، نہیں بس ویسے ہی......'' ثمر نے بہت غور سے اُس کی شکل دیکھی۔

''آج پھر امی جان نے کچھ کہہ دیا۔'' ثمر چمن کی طرف دیکھ کر بولی۔

''نہیں نہیں امی جان نے کچھ نہیں کہا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور ویسے وہ کچھ بھی کہہ دیں تو میں اگنور کر دیتی ہوں۔ اور آپ کے سامنے تو میں اِس وقت کوئی ایشو چھیڑنا پسند بھی نہیں کرتی۔ اتنا تھک کر آئے ہوئے ہوتے ہیں۔''

''تو کیا واقعی کوئی ایشو ہے۔'' ثمر نے بڑی شک بھری نظروں سے چمن کی شکل دیکھی۔ چمن نے بے اختیار ثمر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''اب چھوڑیں بھی ثمر، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سچ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس ویسے ہی ایمن آپا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''ہیں...... ایمن کے بارے میں...... خیریت...... کیا ماشاء اللہ تیسری مرتبہ بھی اب بیٹی پیدا ہوگئی ہے؟'' چمن نے ایک دم سنجیدگی سے ثمر کی طرف دیکھا اور بولی۔

''یہ آپ بھی دنیا والوں کی طرح طنزیہ انداز میں باتیں کرنے لگے ہیں۔ کم از کم آپ کو تو اِس طرح کی بات نہیں کرنا چاہیے۔''

''لو بھئی...... تم نے تو بغیر کسی وجہ کے مجھے دنیا والوں میں شامل کر لیا۔ مجھے کیا پتا دنیا والے کیا کہہ رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ بھئی میں تو اپنی بات کر رہا تھا۔''

''بھئی ہر کوئی ایمن آپا کو یہی کہتا رہتا ہے کہ اِس مرتبہ بیٹا ہونا چاہیے۔ دو بیٹیاں ہوگئی ہیں۔ اُن کے سسرال والے تو ایک بیٹی ہی نہیں مان رہے تھے۔ وہ تو کہتے تھے کہ ایک بھی بیٹی نہ ہو۔ اب تو وہ اور پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔'' ثمر نے ایک دم اپنی آنکھیں بند کر لیں جیسے اُسے یہ سب سُن کر بہت اذیت ہوئی ہو...... پھر بولا۔

''لاحول ولاقوۃ، ارے بھئی مجھے کیا ضرورت پڑی ہے طنز کرنے کی، مجھے تو بیٹے اور بیٹی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ میں تو خود اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جو بچہ بھی دے صحت مند ہو، پیارا سا ہو۔ خوش قسمت ہو۔ اور ہم اُسے دیکھ کر خوش ہوں۔ چاہے وہ بیٹی ہو چاہے بیٹا۔'' اب چمن نے ثمر کی طرف بہت محبت بھری نظروں سے دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''کاش سب لوگ آپ کی طرح سوچنے لگیں۔ تو چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں دکھائی دینے لگیں۔ اور بیٹی واقعی اللہ کی رحمت سمجھی جانے لگے۔''

''بھئی عقل کی بات ہے۔ بیٹی بھی اولاد ہوتی ہے۔ اپنے ہی وجود کا حصہ ہوتی ہے۔'' ثمر مزید بولا۔

''لیکن کچھ لوگ نہیں مانتے۔'' چمن نے آہستگی سے کہا۔ ثمر نے ریموٹ اٹھاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''دماغ خراب ہے اِن لوگوں کا مگر تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تم سوچ کیا رہی تھیں؟''

''میں تو جو سوچ رہی تھی اگر آپ کو بتادوں تو شاید آپ مائنڈ کریں۔''

''ہوسکتا ہے میں مائنڈ کرتا مگر تم اتنی احتیاط کر رہی ہو تو وعدہ کرتا ہوں مائنڈ نہیں کروں گا۔ اگر کچھ اچھا نہیں لگا تو خاموش رہوں گا۔ پرامس!''

''وہ میں سوچ رہی تھی اگر تیسری مرتبہ بھی ایمن کی بیٹی ہوئی تو میں اُسے گود لے لوں گی۔'' ثمر بری طرح چونک پڑا۔ مگر وہ خود کو بڑی مہارت سے سنبھالنے میں کامیاب ہوگیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بہت تحمل اور بردباری سے بولا۔

''دیکھو چمن! لے پالک اولاد، لے پالک ہی ہوتی ہے۔ چاہے وہ بہن کی ہو یا بھائی کی اور پھر دیکھو ناں Adopted بچے جو ہوتے ہیں ناں۔ جوان ہونے کے بعد اُن میں کچھ نفسیاتی مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور دیکھا تو یہی گیا ہے کہ کچھ اچھے نتیجے ہاتھ میں نہیں آتے۔ آئی ایم سوری! تم ایمن کی بیٹی کی بات کر رہی ہو۔ تم کسی اور کی بھی بات کرتیں تب بھی میں تمہیں یہی کہتا۔ ہم Adopted بچہ نہیں لیں گے چمن۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہمارا اپنا بچہ ہوگا اور تم آئندہ مجھ سے اِس ٹاپک پر بات نہیں کرنا۔''

ثمر کا انداز اتنا فیصلہ کُن اور دو ٹوک تھا کہ چمن سمجھ گئی کہ آگے بات کرنا فضول ہے۔ وہ لیٹ گئی اور اُس نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ جیسے سُونے کی کوشش کر رہی ہو۔ اور ساتھ ہی اعلانِ خاموشی بھی۔

☆......☆......☆

ایمن بستر پر اس طرح سے لیٹی تھی جیسے بہت سا کام کر کے تھک گئی ہو۔ تھکی تھکی، نڈھال سی جبکہ اُس کا شوہر یاور اُس کے بہت قریب کھڑا ہوا غصے سے آنکھیں نکال کر اُس سے مخاطب تھا۔

''میں مزید کوئی بکواس نہیں سُنوں گا۔'' ایمن گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی۔

''آپ اِس بات کو ختم کر دیں۔ اس لیے کہ بار بار کی تکرار سے مجھے چکر آنے لگے ہیں۔ ایک مرتبہ کہہ دیا کہ اِس مرتبہ میں الٹراساؤنڈ نہیں کراؤں گی تو نہیں کراؤں گی۔ اب آپ کی مرضی میرے دو چار ٹکڑے کر کے گھر سے باہر پھینک دیں۔''

ایمن بھی انسان تھی، صابر بھی بہت تھی لیکن لامحدود تو صرف خدا کی صفت ہے۔ انسان کے ہاں تو ہر دیے

اور ہر احساس کی ایک حد مقرر ہے۔ لیکن اِس حد کا اندازہ کسی پیانے سے نہیں کیا جا سکتا۔

''میں دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں جاؤ گی۔ تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔'' ایمن نڈھال نڈھال سے لہجے میں بولی۔

''بس باپ تک بات نہ پہنچے۔ میں آپ کے باپ کو بیچ میں لے آئی تو پھر آپ مائنڈ کریں گے۔'' یاور ایک دم غصے سے بھڑک کر بولا۔

''میرے باپ کو بیچ میں لا کر دیکھو بتاتا ہوں تمہیں اچھی طرح......''

''آپ بہت بری طرح بتاتے ہیں، چلیں آج اچھی طرح بھی بتا دیں۔''

یاور نے ایک دم مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر ایمن نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے بہت برے سلوک کے لیے ذہنی طور پر خود کو تیار کر رہی ہو۔ یاور نے اب ایک دم اپنا ہاتھ نیچے کر لیا تھا جیسے اُسے کوئی خیال آ گیا ہو بولا۔

''دیکھو امی اور ابو جان چاہتے ہیں کہ تم الٹرا ساؤنڈ کراؤ۔''

''وہ کیوں چاہتے ہیں؟ یہ اُن کا مسئلہ نہیں ہے۔''

''پھر وہی بات۔ اُن کا مسئلہ نہیں ہے۔ ارے اُن ہی کا تو مسئلہ ہے۔ پوتا چاہیے انہیں۔ وہ معلوم کرنا چاہ رہے ہیں کہ تم اِس مرتبہ کیا دے رہی ہو؟'' ایمن بولی۔

''نعوذ باللہ! نعوذ باللہ...... استغفر اللہ...... میں کون ہوتی ہوں دینے والی۔ یہ تو اللہ کا اختیار ہے۔ جس کو جو چاہے دے دے۔'' یاور نے شعلہ برساتی ہوئی نظروں سے ایمن کی طرف دیکھا تھا اور جیسے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا تھا۔

''بکواس پر بکواس کیے چلی جاتی ہے۔ تمہیں بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں تمہیں وہ کرنا ہے۔''

''یہ آپ کا بھی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور جو کچھ بھی ہوگا آپ کے سامنے آئے گا۔ کیا آپ لوگوں نے ایک بات کو اتنا بڑا ایشو بنا لیا ہے؟ خیال نہیں آتا آپ کو سارے گھر کے کام کر کے ذرا سا تھک کر لیٹتی ہوں تو برداشت نہیں ہوتا۔ اتنا آرام تو میرا حق بنتا ہے۔''

ایمن انسان تھی لامحدود تو خدا کی ذات ہے۔ انسان تو قدم قدم پر حدود کا پابند ہے۔ اُس کے احساس کی اور اختیار کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اِس حد کا تعین صرف اور صرف اللہ کی ذات ہی کر سکتی ہے۔ انسان کو خود بھی پتا نہیں ہوتا اس کی حد کہاں اور کب ختم ہو جائے گی؟

یاور نے بڑی بے بسی سے ایمن کی طرف دیکھا تھا کیونکہ واقعی اُس کی حالت بہت قابل رحم نظر آ رہی تھی۔ چند لمحے اُس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے، رات بہت ہو گئی ہے صبح تم سے بات کروں گا۔'' ایمن نے یاور کی طرف دیکھا اور جیسے اُس فوجی کی طرح بہت بہادری سے بولی۔ جو محاذ پر اکیلا کھڑا رہ گیا ہو۔ اور بندوق کی آخری گولی بھی چل چکی ہو۔

''آپ نے جو کہنا ہے ابھی کہہ لیں۔ جو حشر صبح اٹھانا ہے وہ ابھی اٹھا دیں۔ کیوں کہ صبح تک میں اس ٹینشن میں جاگتی رہوں گی کہ خدا جانے صبح کو میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

یاور نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں ایمن کی طرف دیکھا تھا۔

(اس خوبصورت ناول کی دوسری کڑی انشاء اللہ اگلے ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

دُردانہ نوشین خان

ناتمام

بہت ہمت سے خود کو آمادہ کر کے دوسری بار بھی دکان پر گئی تھی۔ اکیلی گئی، یہ بڑی جرأت تھی تب۔ میں نے اپنے کانوں سے سناوہ پردے کے پیچھے 'خط والی' کی تلاش کا حسرت سے ذکر کر رہا تھا۔ تب غصہ آیا کہ ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔ بعد میں غور سے سوچا پردے کے پیچھے تو وہ اکیلا تھا۔ شاید وہ......

ناکام حسرتوں کا نوحہ لیے، ایک یادگار افسانہ

سرمئی شفاف سڑک ہلکی برف باری میں سفید موتیوں سے جڑی نظر آنے لگی تھی۔ نومبر کی غیر متوقع برف باری سے ٹھنڈ یکدم بڑھ گئی تھی۔ ماہین بی بی آتشدان کے پاس بیٹھی کھڑکی کے شیشے کے پار دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ شیشوں پر جمتے قطروں سے باہر کی یخ بستگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ماہین بی بی کو تسلی تھی کیونکہ عقیل لالہ خشک لکڑیوں کا ذخیرہ جمع کیے رکھتا تھا۔ ستّر سالہ عقیل لالہ مستعد، دیانت دار ملازم تھا۔ دن بھر کام میں لگا رہتا، مغرب کے ساتھ اُس کی رات ہو جاتی۔

مری روڈ کے آخری سرے پر بائیں جانب نکلتی ذیلی سڑک پر واقع تنہا مکان میں بجلی کا وولٹیج اکثر کم آتا تھا۔ ہلکی پھیکی روشنی ماحول پر غنودگی طاری کر دیتی۔ ماہین بی بی نے ٹیبل لیمپ کے نیچے رکھی کتاب کو ربن لگا کر بند کیا۔ کوفی کے مگ میں چمچ پھیرتے ہوئے وال کلاک پر نگاہ پڑی۔ پونے آٹھ بج رہے تھے۔ کوفی کا مگ لیے اُس نے دھیرے سے بیرونی برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھولا۔

یخ ہوا نے استقبال کیا۔ دُھند نہیں تھی۔ پہاڑی راستے دُور تک صاف دِکھتے تھے۔ جنگلی پودوں کی خود مختار مہک فضا میں رچ رہی تھی۔ ہوا میں اعلیٰ درجے کی تازگی تھی۔

اچانک کم قامت جھاڑیوں کی اوٹ سے ایک سایہ بلند ہوتا دکھائی دیا۔ کوئی انسان تھا۔

پہاڑ کے دامن میں عمر کا ایک حصّہ گزار دینے والی ادھیڑ عمر ماہین بی بی خوفزدہ ہوئے بغیر غور سے دیکھنے لگی۔ راہ بھٹکا مسافر ہوگا۔ روشنی دیکھ کر آ رہا ہوگا۔ وہ مگ لیے اندر پلٹی اور دروازہ بند کر کے چاپ کا نادانستہ انتظار کرنے لگی۔

چاپ برآمدے کے اندر آ کر رُک گئی۔ وہ اپنے جوتے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ برآمدے میں کرسی رکھی تھی۔ وہ یقیناً بیٹھ گیا ہوگا مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو جائے گا کہ سردی سے بچنے کے لیے یہ جگہ ناکافی ہے۔ تو وہ دستک دے گا...... ایسا ہی ہو۔ دستک کے

ساتھ اُس نے مہذب الفاظ میں درخواست کی۔
''جناب مجھے پناہ چاہیے۔ مجھے رات کو کم دکھائی دیتا ہے۔ میں راہ بھٹک گیا ہوں۔ مہربانی فرما کر مجھے چند گھنٹوں کا قیام دے دیجیے۔ میں ایک ریٹائرڈ پروفیسر ہوں۔ آپ میرا شناختی کارڈ چیک کرلیجیے۔''
ماہین بی بی کا ہاتھ عقیل لالہ کو بلانے والی گھنٹی پر گیا ہی تھا کہ رُک گیا، سوچا میں دیکھ لیتی ہوں۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ذرا سا پٹ کھولا۔ وہ سایہ اوورکوٹ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ دروازے کی آواز پر کھڑا ہوا۔ لمبا قد، چھریرا بدن، تعلیم یافتہ سنجیدہ بلکہ اداس شخص کا تاثر دیتا تھا۔ سر میں سفیدی نمایاں تھی۔ خاتون کو دیکھ کر سر جھکا کر دھیمے سے کہا۔
''السلام علیکم۔''
''آپ...... اندر آجائیے۔''
''اللہ آپ کا بھلا کرے بی بی! کوشش کر رہا ہوں کہ نمبر مل جائے۔ بات ہو جائے مگر...... وہ تھکے ہوئے ہوں گے۔ موسم اچانک ٹھنڈا ہو گیا ہے، سُستی کریں گے۔'' وہ خود کلامی کے انداز میں بولتا ہوا اندر آیا اور سیدھا آتش دان کے پاس جا بیٹھا۔
ماہین بی بی نے ملحقہ کچن میں جا کر کوفی کا گرم پیالہ تیار کیا اور انٹرکام پر عقیل لالہ کو بُلا لیا۔
گرم چادر میں لپٹا عقیل لالہ حاضر ہو گیا۔ سلام کرتے ہوئے وہ آنے والے کو عقابی نظروں سے کرید رہا تھا۔ آنے والا بے ضرر لگا۔
کچھ سوال جواب پر معلوم ہوا کہ اُس کا نام سرحان شاہ ہے۔ کسی سیمینار پر مدعو تھا۔ موضوع اور اپنے قیام کا مقام بھی بتایا۔ وہاں سے چہل قدمی کرنے لگا۔ راہ بھٹک گیا۔ موسم کے تیور بھی اچانک بدلے۔ کولیگ کو فون ملاتا رہا مگر جانے سگنل کا مسئلہ تھا۔ اُس کا نمبر آف تھا۔ سرحان شاہ نے کہا کہ وہ رات کسی طرح

گزار لے، صبح خود ہی راستہ پالے گا۔ کچھ اُسے رات کو دُور دیکھنے میں مشکل ہوتی تھی۔ عقیل لالہ نے اُس کی تائید کی۔ ماہین بی بی نے عقیل لالہ کو چھوٹا کمرہ درست کر دینے کا کہا۔ سرحان شاہ کوفی کا کپ ختم کر کے نظریں جھکائے بولا۔

''میری محسنہ بی بی کی فیملی کا تعارف کیا ہے۔''

''میرا پرائیویٹ اسکول ہے فیض آباد میں۔ پرنسپل ہوں۔ عقیل لالہ سے آپ ملے ہیں۔ گلاب میرا بچہ ہے۔ اچھا نشانے باز ہے۔ ہتھیار رکھنے کا شوقین ہے۔ پڑھ رہا ہے۔'' سرحان شاہ سن کر ہلکا سا مسکرایا۔ اعتبار کی ناؤ کاغذی تھی۔

''مہربانی ہے آپ کی۔'' وہ اُٹھا، اُٹھتے اُٹھتے نظر کتابوں کی ریک پر گئی۔ کتابوں کی قطار کے عنوانات نے متوجہ کیا۔

''غیب ایک علم ہے۔''

''رویائے صادقہ۔''

"Pre-decided fate"

وہ رُک گیا۔ وہ جب بھی زیادہ بولتا تو یوں جیسے خود سے مخاطب ہو، بولا۔

''میں کبھی pre-decided fate پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ اندر کی آنکھیں کھل گئیں۔ میں آپ کو اپنی زندگی کے عجیب سلسلے کے بارے میں بتاؤں میڈم؟...... اگر آپ pre decided fate کے بارے میں متذبذب ہیں تو......'' ماہین بی بی کو غیر واضح صورتِ حال میں پا کر کہا۔

''آپ گلاب کو بلا لیجیے۔ وہ ماہر نشانہ باز بھی ہے۔'' زیرِ لب مہذب تبسم۔

''آپ تشریف رکھ سکتے ہیں۔ اپنی بات مکمل کیجیے۔'' عقیل لالہ چھوٹے کمرے میں نیا بستر لگا کر ایک پرانا لحاف اٹھائے ماہین بی بی کے کمرے میں آیا اور قالین پر لحاف لپیٹ کر لیٹتے ہوئے کہا۔

''گلاب بیٹا نے بتی جلا رکھی ہے۔ میں دو گھڑی یہیں تسبیح کر لوں۔''

ماہین بی بی سر کے اشارے سے اجازت دیتی ہوئی جی میں ہنس پڑی۔ توبہ ہے، ہمارا معاشرہ بھی...... چھپن سالہ خاتون کی حفاظت۔ چلو خیر اچھا ہے۔

سرحان شاہ نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

''میں کسی دور میں یعنی جواں عمری میں ترقی پسندوں کی اگلی صف میں ہوتا تھا۔ یہ ستر کی دہائیوں کی بات ہے۔ نوشہرہ کے گرلز کالج میں ہماری پارٹی کے منشور کا پروموشن جلسہ تھا۔ منتظم ٹیچر کے ساتھ تین طالبات تھیں۔ اُن کے نام مجھے معلوم نہیں ورنہ یاد ہوتے۔ میری یادداشت اب بھی پوری ہے۔

اُن میں سے ایک طالبہ نے ہماری پارٹی کے جھنڈے جیسا دوپٹہ لے رکھا تھا۔ اُس نے بہت شاندار لفظوں میں پارٹی کی امنگوں کی تشریح کی تھی۔ پارٹی کا ماٹو اپنی قسمت آپ بناؤ تھا اور اُس لڑکی نے تقدیر کا انحصار محنت پر بتاتے ہوئے اتنے اچھے دلائل دیے تھے کہ خود ہم کو معلوم نہ تھے۔ بعد میں چیئرمین نے اُس طالبہ کو پارٹی جوائن کرنے کی دعوت دی تھی۔ مگر یہ الگ بات ہے۔ تقریب کے بعد غیر رسمی گفتگو میں، میں نے اُسے کہا۔ ویسے محنت ہر جگہ کام نہیں آتی۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں تین سال سے ایک ہستی کو اس شہر میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ اگر جستجو سے ملتی تو اتنا بڑا شہر نہ تھا۔

میرا خیال تھا وہ مجھے رد کرے گی اور مزید دلائل دے گی۔ مگر اُس نے مجھے غور سے دیکھا اور وہ چہکتی لڑکی ایک دم چپ اور لاجواب ہو گئی۔ پھر اُس سے بھی رابطہ نہ ہوا۔ میں نے چیئرمین کا پیغام دینے کے لیے کالج فون کیا تھا۔ بتایا گیا وہ یہاں سے مائی گریٹ کر گئی ہے۔ اُس کے next کالج سے معلوم ہوا وہ وہاں نہیں آئی۔ گویا وہ بھی گئی۔ میں عمر بھر تلاش میں مبتلا

رہا۔'' گرم شال میں گٹھڑی بنی ماہین بی بی سرد آہ کھینچ کر بولی۔

''غضب ہوا...... غضب ہوا...... وقت کے سارے بال و پر جھڑ چکے۔ آج زندگی کے سوئے ہوئے سچ بولنے میں ہرج نہیں۔''

سرحان شاہ کتابوں کے ریک کے پاس بیک والے اونچے موڑھے میں بیٹھا تھا۔ وہ لمبی بات آنکھیں بند کر کے کرتا تھا۔ اور کہیں کہیں آنکھیں کھول کر وقفہ دیتا۔ اس نے ایک دفعہ بھی ماہین بی بی کو مرکزِ نگاہ نہیں بنایا تھا۔ لگتا تھا ظاہر پر اُس کی توجہ معدوم ہو چکی تھی۔ یا وہ حیا کے معنی جانتا تھا۔ عقیل لالہ اونگھ رہا تھا۔ باہر بارش کی خود انحصار آواز تھی۔ اندر عمر رواں کی کشتی سرد ساحل سے لگی تھی۔

''تب میں گیارہویں جماعت، سالِ اوّل میں تھی۔ ہم...... یعنی میں اور رملہ تیار شدہ حجاب پسند کرنے ایک ٹیلر کی شاپ پر گئے۔ فیشن ٹیلر نام تھا اُس دکان کا۔ ٹیلر ماسٹر لمبے قد کا تھا۔ جس کی سندھی اسٹائل زلفیں تھیں۔ یہ اُن دنوں مقبول فیشن تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور دکان داروں سے مختلف دِکھتا تھا۔ یا مجھے ایسے لگا تھا۔ نادان لڑکی اُس پر مر مٹی تھی، یہ کہنا اب عجیب بھی لگتا ہے۔ مگر کہانی کا سچ یہی ہے۔ اس کو خط لکھا تھا...... گم نام خط......'' ماہین بی بی خفت سے ہلکا سا ہنسی۔

سرحان شاہ کی آنکھیں ایک دم کھلیں۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھا پھر جلد ہی پلکوں کی جھالر تلے آنکھیں چھپ گئیں۔

''لکھتی میں تب بھی اچھا تھا۔ اُردو کی اساتذہ میرے اندازِ نگارش کو سراہا کرتی تھیں۔ وہ دُکان ریلوے روڈ پر تھی۔ میرے کالج کا تانگہ روز وہاں سے گزرتا، میں دُور سے کھوجنے لگتی فیشن ٹیلرز بند تو نہیں ہے۔ قریب ہوتے تو نظریں اُسے تلاش کرتیں۔ دکھائی دے جاتا تو دل یوں دھڑکتا جیسے چور پکڑا گیا ہو، نہ دکھائی دیتا تو...... دل افسردہ ہو جاتا۔ اُسی وقت سے اگلی صبح کا انتظار دھونی جمالیتا۔ بہت ہمت سے خود کو آمادہ کر کے دوسری بار بھی دکان پر گئی تھی۔ اکیلی گئی، یہ بڑی جرأت تھی تب۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا وہ پردے کے پیچھے 'خط والی' کی تلاش کا حسرت سے ذکر کر رہا تھا۔ تب غصہ آیا کہ ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔ بعد میں غور سے سوچا پردے کے پیچھے تو وہ اکیلا تھا۔ شاید وہ لاؤڈ تھنکنگ کر رہا تھا۔ پھر اُس کی حسرت کا احساس ہوا۔ پہچانے جانے کے خدشے سے میں فی الفور نکل آئی تھی...... پھر اُس کو دوسرا اور آخری خط لکھا۔ اُسے لکھا کہ تقدیر اپنے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ قسمت کو ہمارا انتظار ہوتا ہے اور ہم بیٹھ کر قسمت کا انتظار کرنے لگتے تھے...... خیر...... وقت گزرا کالج کے آخری سال مجھے تپِ دق تشخیص ہو گیا۔ اس وقت یہ لاعلاج اور مہلک مرض تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب زندگی کا ساتھ تھوڑے دنوں کا ہے۔ سینی ٹوریم آنے سے پہلے سب سے معافیاں مانگیں۔ وہ بھی یاد آیا...... ایک معافی اُس سے بھی مانگنا فرض تھا۔ ہمیشہ جھجک اور کم اعتمادی نے میرے قدم روکے مگر اب نہیں۔ سوچا آج سب بتا کر معافی مانگوں گی۔ مگر جب دُکان پر گئی...... آہ...... فیشن ٹیلر کی جگہ ضمیر الیکٹرانکس کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ میرا کالج ڈگری بننے کے بعد سال پہلے وہاں سے شفٹ ہو گیا تھا۔ سال بعد سارا منظر ہی بدل گئی۔ ہم نے بھی شہر چھوڑ دیا۔ یہاں چلی آئی۔ سینی ٹوریم میں بھی، انقلابی جماعت...... سب کچھ بہت یاد آتا تھا۔''

سرحان شاہ ایک دم ہڑ بڑا کے اٹھا۔

''بہت دیر ہو گئی...... مجھے اُدھر جانا ہے؟'' وہ چھوٹے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

عقیل لالہ کو اُس کے کمرے میں بھیج کر ماہین بی بی نے دروازے بند کیے اور اپنے بستر پر جالیٹی۔

☆☆☆

صبح ڈھلی دھلائی سبز رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ چمکیلی دھوپ نکل رہی تھی۔ کاش زندگی یوں ہوتی کہ صبح سو کر اٹھتے تو روح کے سارے بوجھ اتر چکے ہوتے۔ ہاں جنت میں ایسی ہی زندگی ہوگی، ہر طلوع تازہ تر کرے گی۔ مگر فانی زندگی ہمیشہ اپنی بدنمائیوں کو لے کر جاگتی ہے۔

عقیل لالہ نے مہمان کو ناشتا، خاطر تواضع سے نوازا۔ وہ فارغ ہو کر برآمدے کی کرسی پر بیٹھا ماہین بی بی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔ سامنے بے فکر پرندوں کے چہچے، پہاڑی راستوں پر پھول سے بچے اسکول جا رہے تھے، حسین فطرت اپنی ازلی بے نیازی کے ساتھ آشکارا تھی۔

زمانہ کی چالاکی ہے اپنے اندر بے غموں سے لاتعلق نظر آتا ہے، جیسے رعنائیوں کی ردا پھیلا کر آنسوؤں، آہوں کو چھپا دیتی ہیں، مگر غم کو سدا بہار ہے۔

ماہین بی بی گرے رنگ کا گاؤن اور سیاہ اسکارف لیے ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار برآمدے میں آئی۔ اُس کے چہرے پر اب بھی کنوارپن کی سادگی اور بچپن تھا۔ دراز قامت سرحان شاہ کھڑے ہو کر آداب بجا لایا۔ ایک بار اور پہلی بار اُس نے ماہین بی بی کو آنکھ بھر دیکھا، پھر نظر جھکائی اور کہا۔

''فیشن ٹیلرز سے بھی آپ نے گرے عبا پسند کیا تھا۔''

☆☆☆

اعتراف حقیقت کا ملبہ دھڑام سے گرا...... ایک غبار کا طوفان تھا جس کے آر کچھ تھا نہ پار۔ سچ سر عام آمنے سامنے ہو گیا تھا۔ اُس کی ہی آواز نے غبار ہٹایا۔

''اپنے ہاتھ میں قسمت ہونے کا یقین...... ہاہا...... اور آنکھوں کے سامنے قسمت ہاتھوں سے نکل گئی۔ عجب کھیل ہوا۔''

''آپ...... وہ...... ٹیلر ماسٹر۔'' ادھیڑ عمر پرنسپل سفر معکوس میں تھی۔ اُس سے پہچان تو تب بھی جدا نہ ہوئی تھی جب محنت پر ان تھک دلائل دینے کے بعد اُس لمبوترے نے اپنی جستجو کا ذکر کیا تھا۔

وہ آہستہ سے پلٹا۔ واپسی کے زینے اترتے ہوئے خود کلامی کیے جاتا تھا۔

''زندگی مختلف روپ بھرے گزری۔ ٹیلر ماسٹر۔ انقلابی رضا کار۔ کالج کا استاد بھرتی ہوا۔ اب چار سال سے ریٹائرڈ ہوں۔ میں نہیں پوچھوں گا آپ کیا تھیں؟ کیا ہیں؟ کیا ہوا؟ میں نام بھی نہیں پوچھوں گا۔ جس کے کھلونے تھے وہ کھیل چکا، کھلونے ٹوٹ چکے۔'' پھر وہ چلا، پھر کہا۔

''سوچو تو...... چہل قدمی کو نکلے...... گلیات میں بھٹکے...... اس مکان کی روشنی کو آسرا کر کے پہنچے...... خزانے کے دہانے پر جب آئے تو بازو ٹوٹ چکے تھے۔ دامن میں سمیٹنے کو کیا تھا...... کھلونے کب کھیلنے والے سے روٹھتے ہیں۔''

''سرحان شاہ۔''

ماہین بی بی نے تڑپ کر صدا دی۔

وہ وہیں فاصلے پر تھا، پلٹ کر نہ دیکھا۔

''مجھے...... معاف کر دیا؟''

اب اُس نے پلٹ کر رخ موڑا، مسکرایا، ایسی مسکراہٹ جیسے لال رنگ میں نیل گھول دو پھر تن من نیلو نیل ہو جائے۔

''میں نے...... آپ کو دو بار معاف کیا۔''

پھر وہ اونچے پودوں، باڑوں، درختوں کے پیچھے گم ہوتے ہوتے غائب ہو گیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر کیوں نہ دیکھا۔ پلٹ آنے والی گھڑی ماہین بی بی کے مقدر میں نہ تھی۔ سرمئی سڑک خالی تھی۔

☆☆☆

افسانہ

فرحت صدیقی

ایک اُلٹا، ایک سیدھا

مجھے یاد ہے۔ جب تم اس دنیا میں آئی تھیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بارش مجھے بہت پسند ہے۔ ایسا لگتا ہے بارش کی رم جھم کرتی بوندیں دل کے سونے آنگن کو موتیوں سے بھر دیتی ہیں۔ جن کی چمک آنکھوں میں اُتر آتی ہے۔ ڈاکٹر صوفیہ تمہاری شکل......

وفاؤں سے بُنی، ایک لازوال تحریر، بطور افسانہ

میری جان میری گڑیا، مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری گناہ گار ہوں ابھی ابھی تمہاری بیٹی شان زے مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

''نانو...... آپ سے پوچھنا ہے کہ آپ یہ کپڑا کیسے بُن لیتی ہیں۔'' تو مجھے ہنسی آ گئی۔

''بیٹا یہ سویٹر بُن رہی ہوں آپ کے بھائی کے لیے۔''

''نانو یہ کیا ہے۔''

"بیٹا یہ ڈیزائن ہے۔ ایک الٹا ایک سیدھا۔ ایک سیدھا دو الٹے۔" اُس کو سمجھ آئی یا نہیں۔ میرا ذہن اٹک کر رہ گیا۔

"ایک الٹا ایک سیدھا۔" میری جان ہمارے نصیب کے دھاگے بھی مقدر میں اس طرح لکھ دیے جاتے ہیں۔ ایک الٹا۔ یہ وہ دُکھ ہوتا ہے جو سدا رہتا ہے۔ ایک سیدھا یہ وہ پل ہوتا ہے جو خوشی کا ہوتا ہے اور وقت کی تیز ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم جان بوجھ کر وقت کے سیاہ بادلوں کے سامنے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ان بادلوں سے برستے ہوئے موتی روح کو زخمی کر دیتے ہیں۔ لیکن ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

میری جان، میری کانچ کی گڑیا! ماں کا رشتہ بے لوث رہنے والا محبت سے بھرا ہوتا ہے۔ تم نے کبھی "گڑ کی ڈلی" چکھی ہے۔ اس کو چوس کر دیکھنا۔ اس کی مٹھاس ماں کی محبت سے ملتی جلتی ہے۔ ٹھنڈی میٹھی روح میں اُتر جانے والی...... میری پھولوں کی شہزادی، بہاروں کے سات رنگ ہوتے ہیں۔ لیکن تمہارے تو اَن گنت رنگ تھے۔ تمہاری خوبصورتی، تمہاری ذہانت، تمہارا سلیقہ، تمہارا کردار، تمہاری گفتگو جس میں کلیوں کی مہک ہوتی تھی۔ وہ کہاں گئی میری جان، سارے رنگ پھیکے ہو گئے ہیں۔

مجھے یاد ہے۔ جب تم اس دنیا میں آئی تھیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بارش مجھے بہت پسند ہے۔ ایسا لگتا ہے بارش کی رم جھم کرتی بوندیں دل کے سونے آنگن کو موتیوں سے بھر دیتی ہیں اور جن کی چمک آنکھوں میں اُتر آتی ہے۔

ڈاکٹر صوفیہ تمہاری شکل دیکھ کر حیران کھڑی تھیں۔

"اتنی خوبصورتی، میرے ہاتھ میں پہلی بار آئی ہے۔" سارے اسپتال میں تمہارے آنے کی دھوم مچ گئی تھی سب نے تمہیں دیکھا اور مجھے مبارکباد دی۔ نجانے ایک آنسو آنکھ سے خاموشی سے نکلا اور بارش کی رم جھم میں کھو گیا۔

"کاش اس کا نصیب بھی اتنا خوبصورت ہو۔" میرے دل سے دُعا نکلی۔ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر دُعا قبول ہو۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے تمہیں سینے سے لگا لیا۔ مامتا کی رم جھم نے میرے پورے وجود کو بھگو دیا۔ کتنا انوکھا اور خوبصورت احساس ہوتا ہے۔ کائنات کا سب سے حسین روپ، ماں کی محبت میں بھی اللہ کا نور ہوتا ہے۔

میری نورا! میری جان! وقت کے سمندر میں بہت سے طوفان آتے ہیں۔ پہلا طوفان اس وقت آیا، جب تمہارے ابو تمہارا پیارا پیارا چہرہ چوم کر تمہیں "نور" کا نام دے کر گھر میں موجود تمہاری دادی اور تمہاری پانچ بہنوں کے لیے مٹھائی لینے جا رہے تھے۔ تمہارے ابو انوکھے آدمی تھے۔ ہر بیٹی کی پیدائش پر گھر جا کر سب کو مٹھائی کھلاتے اور پھر شکرانے کے نفل پڑھتے۔ انہیں کبھی بیٹے کے نہ ہونے کا افسوس نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ بیٹی کو اللہ کا انعام اور رحمت سمجھتے تھے۔ لیکن وہ گھر پہنچ نہیں سکے۔ بم دھماکے نے جہاں بہت سارے گھروں کے چراغ بجھا دیے اُن میں ایک تمہارے ابو بھی تھے۔

تمہاری دادی اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دیں بے حد بہادر اور حوصلے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے جس طرح مجھے اور تمہاری پانچ بہنوں اور تمہیں سینے سے لگا کر حوصلہ اور ہمت دی وہ ان کا ہی کام تھا۔ ہمارے آنسو پونچھ کر حوصلہ دے کر خود باتھ روم میں نہانے کے بہانے ایک ایک گھنٹہ رو دھو کر باہر آ جاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں کروشیے سے بنائے ہوئے سوئٹر کی بہت صفائی تھی۔ بہت ساری چیزیں وہ تیار کر لیتی تھیں۔ تمہاری بہنیں بھی اسکول

سے آ کر ان کا ہاتھ بٹا دیتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ بہت رحیم و کریم ہے۔ انسان اگر ہر لمحہ، ہر حالت میں اس کا شکر ادا کرتا رہے۔ تو اللہ تعالیٰ خود ہی راستے آسان کر دیتا ہے۔

میری جاب تمہارے ابو کی پینشن اور دادی اماں کے پاکیزہ ہاتھوں کی کمائی، گھر کے سارے اخراجات پورے ہوتے گئے۔

میری نور میری جان مجھے یاد ہے۔ فارغ وقت میں جب میں اون کی سلائیوں سے چھوٹے چھوٹے بچوں کے خوبصورت سیٹ بنا کر دکان پر بھجوا دیا کرتی تھی، تو تم میری گود میں بیٹھ کر اون کے گولے سے کھیلتی رہتیں۔ یا تیزی سے سوئٹر بنتی سلائیوں کو دیکھا کرتیں اور خوامخواہ خوش ہوا کرتیں۔ تم بھی اپنی بیٹی شان زے کی طرح پوچھا کرتی تھیں۔

"یہ الٹا خانہ کیوں؟ اور یہ سیدھا کیوں ہے؟ یہ آپ کس طرح بنا لیتی ہیں؟"

وقت کا کام ہے گزر جانا۔ اور وہ گزرتا گیا۔ دن بے حد مصروف ہوتا لیکن رات بے حد لمبی ہو جاتی۔ ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ میری بے چینی اور آنسو دیکھ کر تمہاری دادی بھی اُداس ہو جاتیں اور وضو کر کے جاء نماز پر کھڑی ہو جاتیں۔ اور میں بھی ایسا ہی کرتی۔ دل کو سکون آ جاتا۔ کبھی اپنے رب سے گلہ نہیں کیا۔ شکوہ نہیں کیا۔ ہر حال میں اس کا شکر ہی ادا کیا۔ اللہ کا خاص کرم تھا کہ تمہاری دادی کی زندگی میں پانچوں بچیاں خاندان میں ہی اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ ہر فیصلہ تمہاری دادی نے کیا تھا۔

فاطمہ کا ولیمہ تھا۔ تمہاری دادی رات کو بہت سکون سے سوئیں۔ اس سکون سے کہ بچی اپنے گھر بار کی ہو گئی۔ وہ صبح بہت تکلیف دہ تھی۔ کیونکہ تمہاری دادی تو ابدی نیند رات کے کسی پہر سو گئیں۔ ہم کو پتا ہی نہیں چل سکا۔

ایسا لگا کہ آج میں دوبارہ بیوہ ہو گئی ہوں۔ میرے سر سے چھت اڑ گئی ہے اور میں تپتے صحرا میں ننگے پاؤں ریت کے طوفان میں کھڑی ہوں۔ رات کو اُٹھ اُٹھ کر دروازہ دیکھتی اور تمہیں سینے سے لگا کر رو دیتی۔ بیٹیاں باری باری آ کر میرے دُکھ کو کم کرتیں اور پھر لوٹ جاتیں۔ کیونکہ سسرال کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ تمہاری دادی نے تمہاری بہنوں کو اپنوں میں بیاہ دیا تھا کہ اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔

دو بہنیں چچا کے گھر گئیں۔ ایک کو جیٹھ کے بیٹے نے اپنا لیا۔ اور دو کو تمہاری پھوپی، دونوں بیٹوں کے لیے لے گئی۔ ساری اپنے اپنے گھروں میں سکھی تھیں۔

بیٹیاں گھروں میں سکھی ہوں تو ماں کی زندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

میرے داماد ایسے تھے کہ مجھے کبھی بیٹے کی کمی محسوس نہ ہوئی اور نور تمہیں تو انہوں نے لاڈ کر کر کے بگاڑ دیا تھا، تمہاری ہر فرمائش کو پورا کرتے اور مجھ سے کہتے کہ اماں جی، نور کے ماشاء اللہ پانچ بھائی ہیں۔ آپ فکر نہ کیا کریں۔"

اور ایسے ہی ہوا،، میری راج کماری، تمہاری خالہ بیس سال بعد لندن سے واپس آ گئیں۔ خالو نے اپنا بزنس سیٹ کر لیا۔ تو تمہاری خالہ نے عادل کے لیے سوال کر دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لیکن میرے پانچوں بیٹوں نے جب اس کو اوکے کر دیا۔ UK سے MBA کر کے اس کو بینک میں آتے ہی اچھی جاب مل گئی تھی۔

میرے گھر کھانے پر سب آئے تھے۔ تو عادل کی نظریں بار بار تم پر جس طرح اٹھ رہی تھیں، اُن کو سب نے ہی محسوس کیا اور اس کے بعد تو تمہاری خالہ نے میرے گھر کی چوکھٹ ہی پکڑ لی۔

کیا دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ میرے پانچ بیٹوں نے مجھے محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ گھر میں شادی ہے۔ سارے اخراجات انہوں نے مل کر بانٹ لیے تھے۔ ساری بہنوں سے زیادہ تمہیں جہیز ملا۔ ہر چیز ہی بہت اچھی تھی۔ مگر...... نصیب...... میری جان نصیب تو لکھ دیے جاتے ہیں۔ میں کیا کرتی۔

تمہارے جانے کے بعد گھر گھر نہ رہا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ یہ بواجی جو سدا سے میرے ساتھ تھیں۔ شادی کے بعد تم عادل کے ساتھ UK ایک ماہ کے لیے چلی گئی۔ لیکن تمہارے واپس آنے پر نور میں نے تمہارے چہرے پر وہ خوشی محسوس نہ کی۔ جو تمہاری بہنوں کے چہرے پر نمایاں ہوتی تھی۔

''نور میری جان۔ تم خوش ہونا؟'' میری ماما کو چین نہ تھا۔

''ہاں ماں میں بہت خوش ہوں۔'' تمہارا لہجہ جھوٹ بول رہا تھا اور تمہاری آنکھیں خوف زدہ، عادل ہمیشہ ساتھ آتا اور تمہیں لے کر ہی جاتا۔ اگر وہ نہ آسکتا تو تمہاری خالہ ضرور ساتھ ہوتی۔ رات کو واپس لے جاتی۔ کئی بار میں نے اپنی بہن سے کہا کہ دو دن کے لیے نور کو چھوڑ جاؤ۔ مجھے بہت یاد آتی ہے۔'' تمہاری خالہ ہنس کر کہہ دیتی۔

''کیا کروں میرے عادل کو اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔'' میں چپ ہو جاتی۔

دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ میرے بالوں میں سفیدی اُتر آئی۔ لیکن ہاتھ ابھی بھی اون سلائیوں میں الجھے رہتے۔ شاید میں اپنی تنہائی کے موتی ان میں پروتی تھی۔ یا گزرے ہوئے لمحوں کی خوشیاں ان میں ٹانک دیتی۔ میں خانوں سے باتیں کرتی تھی۔ اور الٹا سیدھا، سیدھا الٹا، اور پھر سیدھا ہی سیدھا بن بن کر اپنے مقدر کی خوشیاں غم اور تنہائیاں تلاش کرتی تھی۔ تمہاری شان زے مجھے بے حد پیاری تھی۔ وہ بھی تمہاری طرح اون کے گولے سے کھیلتی رہتی جب بھی آتی۔

رابعہ آپی سے تمہارا بہت پیار تھا۔ رابعہ اکثر مجھ سے کہتی۔

''نور بہت بہادر ہے اماں۔''

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں، وہ بس ایسے ہی۔'' رابعہ کا لہجہ چغلی کھا رہا ہوتا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔

☆......☆......☆

عادل کو آفس کی طرف سے ڈنر پر جانا تھا۔ میرا گھر راستے میں تھا بچوں کو میرے پاس چھوڑ گئے۔ تمہیں عادل ساتھ لے گیا تھا۔ بچے کھیل میں مگن ہو گئے۔ اچانک شان زے کی چیخ نے مجھے متوجہ کر دیا۔ میں بھاگ کر دوسرے کمرے میں گئی وہاں میری اون اور سلائیاں رکھی تھیں احمد میری سلائی کو ہیٹر سے گرم کر کے شان زے کے بازو پر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اس سے سلائی چھینی۔

''احمد یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''نانو، ہم امی ابو کھیل رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں اندر تک لرز گئی۔

''ابو اس طرح ماما کو سگریٹ لگاتے ہیں بازو پر۔ شان زے مجھے سلائی نہیں لگانے دیتی۔'' میری روح اندر تک کانپ گئی۔

''شان زے احمد کیا کہہ رہا ہے۔'' میں بہت پریشان ہو گئی۔

''احمد بُری بات، گھر کی بات گھر میں رکھتے ہیں۔'' یہ دس سال کی شان زے تھی وہ آٹھ سال کے احمد کو کہہ رہی تھی۔

''اُف'' میں ماں ہو کر نور تمہارے اندر کی کہانی

کو نہ سمجھ سکی۔ تمہارے دُکھ کا اندازہ نہ کرسکی۔

''تڑاخ'' احمد نے زور سے چانٹا شان زے کو منہ پر دے مارا۔

''احمد'' میں نے غصے سے اس کو پرے کھینچا۔ ''دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔''

''نانو کیا ہوا۔ ابو بھی اس طرح ماما کو مارتے ہیں۔ ماما بہت روتی ہیں اور دادو ان کو چپ کرواتی ہیں۔''

''کیا دادو عادل کو منع نہیں کرتی۔''

''کرتی ہیں نانو، مگر ابو نہیں سنتے۔''

مجھے ایسا لگا کہ میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ہیں ان کا ذرہ ذرہ ہوا میں اُڑ چکا ہے۔ میری روح کی تڑپ میں ہی محسوس کرسکتی تھی۔

''اُف میری نور، میری جان...... دس سال سے یہ دُکھ سہہ رہی ہے۔ مگر میں...... میں۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بچے ٹی وی لگا کر کارٹون دیکھنے لگے۔ پتا نہیں کب میں بے ہوش ہوگئی۔ دل میں کسی نے خنجر گاڑھ دیا تھا۔

☆......☆......☆

جب ہوش آیا تو خود کو اسپتال میں پایا۔

''میری نور۔'' میں نے بازو اٹھانے کی کوشش کی۔ اُس نے اپنا ہاتھ میرے لبوں پر رکھ دیا۔ ٹھنڈا یخ سرد ہاتھ۔

''ماں...... اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ مجھے ان تین بچوں کے لیے جینا ہے۔'' اُس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''ماں، میں نے شروع میں بہت کوشش کی کہ آپ سے بات کرسکوں۔ آپ نے مجھے کبھی پھول بھی نہیں مارا تھا۔ لیکن عادل اذیت پسند تھا۔ خالہ نے اپنی عزت کے لیے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے ماں۔ رابعہ باجی نے ایک دفعہ میری گردن اور بازو پر نشان دیکھ لیے تھے۔ میں نے پورے بازو اور بٹن والے گلے پہننے شروع کردیے تھے تا کہ میرے زخموں کی کسی کو ہوا نہ لگ سکے۔''

میں برف کی طرح سرد ہوچکی تھی۔ مجھ سے بولا ہی نہیں جارہا تھا۔ چاروں طرف طوفان کی زد میں تھی۔ یہ میرے اپنے تھے نور کی دادی اماں کہتی تھیں کہ ''اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں۔ مارتے ہیں تو چھاؤں میں ڈالتے ہیں۔'' مگر میرے یہ اپنے......نہیں...... اب مزید نہیں ہوسکتا۔

''نور میرے دل کا ٹکڑا۔ میری جان اب مزید اس جہنم میں نہیں رہ سکتی۔ میں نے سوچ لیا۔

تھوڑی دیر میں بھی اکٹھے ہوگئے۔ میں نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں کسی اپنے کا بھی سامنا نہیں کرسکتی تھی خاص طور پر اپنی بہن اور اپنے بھانجے کا، رات گئے ہنگامہ ختم ہوگا۔ نور میرے سرہانے لگی ہوئی تھی۔ بچوں کو دادی گھر لے گئی تھی۔

''بس بہت ہوگیا۔ اب تم اس جہنم میں نہیں رہو گی۔'' میرے آنسو نور کے ہاتھ کو بھگو رہے تھے۔ مجھے نور کے مقدر کو اب سیدھا کرنا ہے۔ بہت سارے اُلٹے خانے گر چکے ہیں۔

''ماں...... میری پیاری ماں۔'' نور نے میرا ہاتھ آنکھوں کو لگالیا۔ میں ساری زندگی باپ کی شفقت کو ترستی رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی میرے بچے ماں کو ترسیں۔ کچھ بھی ہو، عادل میرے بچوں کا باپ ہے۔ آج نہیں تو کل میری اولاد جوان ہوجائے گی۔ میرا سہارا اور میرا ساتھ ہوگی۔ عادل اور شادی کرسکتا ہے مجھے بھی آپ کہیں نہ کہیں بیاہ دیں گی۔ اس سارے کھیل میں بچے تباہ ہوجائیں گے۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔''

میرے دماغ میں آندھیاں چلنے لگی تھی۔ ایک اُلٹا ایک سیدھا نہیں، ایک الٹا، پھر دوسرا الٹا پھر تیسرا......

☆☆......☆☆

ناولٹ

کاوش صدیقی

دوسرے کنارے پر......

انسان مثل پیاز پرت در پرت کھلتا ہے اور آنسو نکلنے لگتے ہیں۔ انتہائی مضبوط مگر اندر سے گداز۔ یہ کیا چیز بنائی اللہ میاں جی آپ نے۔ ٹیڑھی میڑھی لچکدار عجیب سی مخلوق۔ ''عورت کو ہمیشہ پامال کیا گیا۔ رشتے کے ترازو میں رکھ کر تولا گیا اور ہر بار وزن میں عورت ہی......''

محبت کا انوکھا رنگ لیے، ایک بہت خاص ناولٹ، جو مدتوں یاد رہے گا

وہ بہت دلکش تھی۔ ستواں ناک میں پڑی ننھے سے سرخ یاقوت کی چمکدار لونگ، باتیں کرتے ہوئے بعض اوقات روشنی کے کسی زاویے سے جھلملا جاتی، سیدھے ریشمی بال جو گہرے اخروٹی رنگ کے اس کے چہرے پر بار بار آ جاتے تھے، جنہیں وہ بڑی اکتاہٹ سے بار بار کبھی ہاتھوں سے، کبھی سر جھٹک کر پیچھے کر دیتی تھی۔ اس کی کالی چمک دار آنکھوں پر بے حد سیاہ خمدار پلکوں کا سایا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

مجھے وہ حقوقِ نسواں کی ایک کانفرنس میں ملی تھی۔ بہت سرسری سی ملاقات تھی۔ مگر اس کا سراپا میرے اندر کھب گیا تھا۔

وہ، میری نشست سے ایک نشست چھوڑ کر بیٹھی تھی۔ ہمارے درمیان ایک بہت ہی موٹے سے شخص حائل تھے، جنہوں نے موتن داس برانڈ ٹی روز لگا رکھا تھا، جس کی تیز خوشبو میرے نتھنوں میں خارش پیدا کر رہی تھی۔ وہ صاحب کسی ضرورت سے اٹھے تو میں اٹھ کر فوراً ہی ان کی نشست پر براجمان ہو گیا۔ میری اس حرکت پر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بے ساختہ ہنس پڑی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''گفتگو کے لیے کوئی بہانہ تو درکار تھا آپ کو، سو میں نے فراہم کر دیا۔!'' وہ مسکرائی، اس کے بھرے بھرے ہونٹوں میں بلا کی جاذبیت تھی۔

'' آپ یہاں کیا کرنے آئی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہاں تو بہت بھاری بھاری اصطلاحات سے بھری بے تکی تقریریں ہو رہی ہیں۔''

''اصغر صاحب زبردستی لے آئے ہیں، ورنہ مجھے اس قسم کی ڈرامے بازی سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' وہ بولی۔

''اصغر صاحب کون ہیں؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ مجھے اس کی بے ساختہ گفتگو اچھی لگنے لگی۔

''جن کی سیٹ پر آپ بیٹھے ہیں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”وہ جعلی ٹی روز کا اشتہار!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور کھلکھلا کے ہنس دی۔ اس کے سفید، ہموار دانت یکساں قطار میں چمکے اور ہونٹوں کے عقب میں روپوش ہو گئے۔

”وہ پورے موتن داس کو پرفیوم سپلائی کرتے ہیں“ وہ بولی۔ ”گلوں کی خوشبو کو کیمیکل میں قید کرتے ہیں!“

”کمال کا فقرہ ہے!“ میں نے بے ساختگی سے اسے داد دی اور کہا ”ایک بات پوچھوں؟“

”بالکل پوچھیے۔!“ اس نے سر ہلا کر بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ ”مگر........!“

”مگر کیا۔؟“

”چلیں خیر پہلے آپ اپنی بات مکمل کیجیے!“ وہ بڑی رسانیت سے بولی۔

”آپ کیا ان کے پاس جاب کرتی ہیں؟“

”جی ہاں!“ اس نے جواب دیا۔ ”میں اصغر صاحب کی وائف کم سیکریٹری ہوں!“

”کیا۔؟“ مارے حیرت کے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”منہ بند کر لیجیے حقیقت سمجھی جاتی ہے، کھائی نہیں جاتی۔“ اس نے میرے انداز پر بڑی رسانیت سے مجھے مشورہ دیا۔ میں نے جلدی سے منہ بند کر لیا۔

وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ پھر ہنس دی۔

میں نے کہا۔ ”آپ بے دھڑک اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔“

”دنیا میں ہر طرف تیزی ہی تیزی ہے۔ بھاگ دوڑ، جو تم بیزار، اب تو محبت بھی شارٹ کٹ ہو گئی ہے۔ فوراً ہی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ افلاطونی محبت، چلمن سے لگے بیٹھے رہیں۔ جذبات گھٹتے رہیں، امراض میں مبتلا ہوتے رہیں!“ وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولی ”کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”بالکل درست!“ میں نے ایک لمبی سانس لی۔ ”لیکن شاید سارے ہی اتنے فاسٹ ٹریک کے عادی نہیں ہوتے۔“

”پھر دوڑ میں حصہ نہ لیں ورنہ سانس پھول جائے گی اور تھک کر پیچھے رہ جائیں گے!“

”ایک بات کہوں؟“

”کہیے“

”میرا دل چاہ رہا ہے آپ سے پھر ملنے کا!“ میں نے کہا اور اسے غور سے دیکھا۔

”مل لیجیے گا مجھ میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟“ اس نے بے نیازی سے کہا ”جوڑیا بازار رام داس بلڈنگ کی پانچویں منزل پر ہم ہوتے ہیں۔“

”آپ کا سراپا اور آپ کی گفتگو دونوں نے ہی مجھے متاثر کیا ہے“ میں نے اسے جواب دیا۔ ”مجھے آپ سے باتیں کر کے اچھا لگا۔“

”معلوم نہیں کہ آپ کو کیا اچھا لگا۔“ اس نے کندھے اچکائے اور سامنے آتے ہوئے اصغر صاحب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اس کی بائیں جانب کی نشست خالی تھی۔ اصغر صاحب اُدھر ہی بیٹھ گئے اور اس سے پوچھنے لگے۔

”ہو گئی بات؟“

”ہاں جی!“ وہ مسکرائی اور میری طرف دیکھا ”مگر ہم دونوں نے ابھی تک اپنا نام ایک دوسرے سے نہیں پوچھا۔“

میں حیرت زدہ ان کی بات سن رہا تھا۔

”روشنی نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ اس سے بات کرنے کے لیے موقع ڈھونڈ رہے ہو، تو میں اٹھ گیا۔“ اصغر صاحب نے بڑی سادگی سے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے اصغر کہتے ہیں۔ 'اصغر پرفیومری کمپنی' اور

یہ روشنی ہے۔''

میں قدرے جھینپ گیا۔ ''مجھے آصف حسن کہتے ہیں۔ میرا کیٹرنگ کا بزنس ہے۔'' میں نے بھی ہاتھ بڑھادیا۔

اسی وقت ڈائس سے اعلان ہونے لگا۔ ''خواتین و حضرات چائے کے لیے تشریف لے چلیں!''

ہم بھی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے اور وہ مجھے یکسر نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

روشنی سے پہلی ملاقات نے مجھ پر ایک عجیب سا تاثر چھوڑا۔ جس کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اس کی دلکشی، بے باکی اور خوداعتمادی نے جہاں مجھے متاثر کیا تھا وہیں اس کی ایک بات میرے اندر چبھ رہی تھی۔ ''میں اصغر صاحب کی وائف کم سیکریٹری ہوں!'' کیا مطلب تھا اس جملے کا۔ اکثر دفتروں میں باس کے سیکریٹری سے نجی تعلقات ہوتے ہیں۔ مجبوری یا شوق، لالچ، ضرورت کوئی نا کوئی وجہ ان تعلقات کی بنیاد بن جاتی ہے اور پھر یہ کہ تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی ضرورت کی چڑیل آسیب بن کر دونوں پر سوار ہو جاتی ہے۔ مگر کوئی اس طرح برملا اپنے تعلق کا اظہار پہلی ہی ملاقات میں کسی اجنبی سے نہیں کرتا۔ مجھے وہ یاد آتی تھی۔ میں اس کا خیال جھٹک دیتا تھا۔ مگر دن یا رات کے کسی پہر وہ میرے خیال میں در آتی تھی۔

کیٹرنگ کا ایک بہت بڑا آرڈر ملا تھا۔ کوئی سیٹھ عبدالوہاب تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی اور مہندی مایوں سے لے کر ولیمے تک کے تمام فنکشن میرے سپرد تھے۔ ہر فنکشن میں تقریباً ہزار سے زائد مہمان مدعو تھے۔ میں سیٹھ عبدالوہاب کو نہیں جانتا تھا، ان کے سیکریٹری کا کسی ریفرنس سے فون آیا تھا اور یوں ایک مختصری میٹنگ کے بعد آرڈر فائنل ہو گیا تھا۔

میں اگر شہر میں مشہور تھا تو اس کی بنیادی وجہ ہمارے کھانوں کا ذائقہ تھا۔ ہم تھوڑے سے مہنگے ضرور تھے مگر ہمارے کلائنٹ ہم کو بہت پسند کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ بغیر کسی پبلسٹی کے ہمیں آرڈر ملتے رہتے تھے۔ مگر یہ آرڈر بہت بڑا تھا۔ اس لیے میں ہر کام پر ذاتی توجہ دے رہا تھا۔ مجھے مسالے خریدنے جوڑیا بازار جانا تھا۔ حاجی صاحب کی دوکان پر بیٹھا میں مسالے چیک کر رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

میں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔ ''حاجی صاحب رام داس بلڈنگ کہاں ہے۔''

''اے پچھواڑے تو ہے!'' حاجی صاحب نے کہا۔ ''ادھر کیا کام آپڑا؟''

''کچھ نہیں ایک دوست کا دفتر ہے ادھر۔ میں ذرا مل کر آتا ہوں۔ جب تک پیکنگ بھی ہو جائے گی۔'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں گھوم کر پچھلی گلی میں پہنچ گیا اور رام داس بلڈنگ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ 'کیا مجھے ملنا چاہیے۔ کیا کرنا چاہیے؟' میں جیسے اپنے آپ سے سوال جواب کرنے لگا۔ اتنے قریب آکر اسے دیکھنے کی خواہش اور بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

سال خوردہ بلڈنگ کے چرچراتے ہوئے لکڑی کے زینے طے کرتا ہوا میں پانچویں منزل پر پہنچا تو سامنے ہی اصغر پرفیومری کے بورڈ موجود تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ریسپشن پر ایک بڑی بی ناک پر عینک ٹکائے بڑے انہماک سے اخبار کے مطالعے میں گم تھی۔ میں نے اس کے قریب جا کر ہلکے سے ڈیسک بجایا۔ مگر اس کے انہماک پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ میں نے قدرے زور سے گاڑی کی چابی ڈیسک پر بجائیں۔ وہ اخبار نیچے رکھ کر میری طرف متوجہ ہوئی ''کاہے کو شور مچاتا پڑا ہے؟''

وہ ایک بڑی عمر کی اینگلو انڈین خاتون تھی جو اب کراچی میں خال خال ہی دکھائی دیتی ہیں۔
''مجھے مس روشنی سے ملنا ہے!'' میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑی بی کی سماعت کا مسئلہ ہے۔
''سامنے چلے جاؤ'' اس نے ہاتھ ہلا کر سمت کا اشارہ کیا اور دوبارہ اخبار میں گم ہو گئی۔
میں نے مختصر سا فاصلہ طے کیا اور چیف ایگزیکٹو کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔
''آ جائیں'' اندر سے آواز آئی۔ میں نے پہچان لیا یہ روشنی کی آواز تھی۔
میں اندر داخل ہوا تو وہ سامنے ہی بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے میز پر بہت سارے کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ ایک جانب کمپیوٹر رکھا ہوا تھا اور اس کے عقب میں دروازہ تھا جو غالباً اصغر صاحب کا کیبن ہی رہا ہو گا۔
''آپ؟'' اس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی حیرت سے کہا۔ ''آپ یہاں کیسے؟''
آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا، اس لیے آ گیا! میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''کیا آپ کو میرا آنا برا لگا؟''
''ابھی کوئی ایسا تعلق ہی کہاں ہے کہ آپ کا جانا، آنا برا لگے۔!'' وہ مسکرائی۔ ''تشریف رکھیے۔!''
''بات تو سچ ہے!'' میں نے بھی اس کے ڈھب پر آنا شروع کر دیا۔
''چائے یا کوفی؟'' اس نے پوچھا۔
''جس میں زیادہ وقت لگے!'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔
وہ میری بات سن کر ہنسی اور کوفی کے لیے انٹر کام پر کہہ دیا۔
''اصغر صاحب کہاں ہیں۔؟'' میں نے پوچھا۔
''اندر کمرے میں ہیں۔ سو رہے ہیں!'' اس نے بتایا۔
''دفتر میں سو رہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''گھر میں موقع نہیں ملتا سونے کا۔'' وہ مسکرائی۔
''چھ بچے، ایک بوڑھی ماں، چڑچڑی بیوی، دو کمروں کا فلیٹ۔''
''اتنا اثاثہ اور اتنی مختصر جگہ۔'' میں نے حیرت سے کہا۔
''یہ نہ بھولیے کہ وہ اصغر ہیں'' وہ ہنسی۔
میں نے اس کو غور سے دیکھا۔
''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پوچھا۔
''ایک بات میرے ذہن میں مسلسل چبھ رہی ہے۔!''
''کہہ دیجیے۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔'' میں برا نہیں مانتی کسی بات کا۔''
''آپ نے اس دن ایک جملہ کہا تھا کہ میں اصغر صاحب کی وائف کم سیکریٹری ہوں۔ میں اس بات کو سمجھنا چاہتا ہوں۔!'' میں نے کہا۔
''کہیں آپ مجھ سے کوئی توقع تو نہیں باندھ بیٹھے؟'' اس نے دوبارہ مجھے غور سے دیکھا۔
''ہاں آپ مجھے اچھی لگی ہیں اور اتنی اچھی کہ اس سے پہلے کوئی نہیں لگا!'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔
''اتنی جلدی توقعات وابستہ نہیں کرتے!'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''میں نے جو کہا وہ تو بہت عام سی بات ہے اور اکثر دفاتر اسی طرح چل رہے ہیں۔''
''میں نے کبھی کسی کے متعلق اپنے اندر ایسے جذبات محسوس نہیں کیے جیسے آپ کے متعلق احساسات نے جنم لیا۔ آپ وہ پہلی لڑکی ہیں کہ جس سے ملنے کی، باتیں کرنے کی شدید تڑپ پیدا ہوئی ہے۔ یقین مانیں

کہ میں نے اس سے پہلے اپنی زندگی میں خالی پن کو اس طرح محسوس نہیں کیا۔''

''کیا میں خالی جگہ پر کرنے کے لیے ہوں؟'' اس کا سوال بڑا گہرا تھا۔

''میں نے اپنے خالی پن کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کو دیکھ کر اگر خالی پن کا احساس جاگا ہے تو آپ ہی اہم ہوئیں نا۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ کچھ نا بولی بس میری طرف دیکھتی رہی۔ اتنے میں کوفی آگئی۔ بھاپ اڑاتے کپ ہمارے بیچ میں منظر کو دھندلا کرنے لگے۔

''کیا آپ کو میری باتیں بری لگ رہی ہیں؟'' اس کی مسلسل خاموشی سے تنگ آکر میں نے پوچھا۔

''میں آپ کے احساسات کی قدر کرتی ہوں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کسی توقع کے ساتھ تعلق رکھیں۔'' اس نے پوچھا اور کہا۔ ''توقعات ٹوٹ جائیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔''

''بہت مشکل سے میں نے اپنی زندگی میں سے منافقت کا عنصر کم کیا ہے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''سچ برداشت نہیں ہوتا۔ شدت کی پیاس میں چند قطرے تشنگی مٹانے کے بجائے آگ لگا دیتے ہیں۔ اس آگ کے ساتھ میں نے بڑی مشکل سے زندہ رہنے کا فن سیکھا ہے۔ آپ کیوں میری حدود میں داخل ہونا چاہتے ہیں؟''

''آپ نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''میں آپ کے دکھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو مجھے آپ سے پہلے کبھی ان احساسات کا اندازہ نہیں ہوا جو اب میرے اندر ابھرے ہیں۔ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟''

میرے انداز میں ایک عجیب سی بے بسی تھی۔

''میں بہت کڑوی ہوں آصف صاحب اتنی کڑوی کہ آپ کی ساری حیاتی زہر ہو جائے گی۔ میرا ہنسنا، میرا مسکرانا، میری ہر ادا مصنوعی ہے۔ میں مردوں سے چڑتی ہوں، ان کو جھکاتی ہوں، ترساتی ہوں، ترستی بھی ہوں۔ آپ مجھے نہیں سمجھ پائیں گے۔ اپنی زندگی کو تلخ نہ کیجیے۔ نارسائی کا کرب ابتدا میں کچوکے لگائے گا، پھر زخم پر کھرنڈ آجائے گا اور پھر بس ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا۔ آپ کوفی لیجیے۔!'' اس نے بات کے اختتام پر اچانک ہی لہجہ بدل دیا۔

''لیکن میں اگر یہ کہوں کہ میں آپ کے لیے سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں تو پھر؟'' میں نے کوفی کا ایک گھونٹ بھرا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''زندگی تین گھنٹے کی فلم نہیں اور نہ ہی ہر فلم کا اختتام دلکش ہوتا ہے۔ آپ پاکیزہ ہیں۔ منزہ ہیں۔ آرزو سے بھرے سیدھے آدمی ہیں نا۔ دھول مٹی میں اتریں، چہرہ تو چہرہ، دل بھی ٹوٹ جائے گا۔''

''آپ مجھے ڈرا رہی ہیں!''

''نہیں آپ کو سمجھا رہی ہوں۔''

''کیا آپ اپنی دنیا میں خوش ہیں؟''

''خوشی اختیاری نہیں ہوتی۔ اور نا ہی ہم اپنی دنیا تخلیق کر سکتے ہیں۔'' وہ رسانیت سے بولی۔ ''آپ کو میرے اندر ایسا کیا نظر آیا جو آپ میرے لیے یہاں تک آگئے؟''

''پتا نہیں!'' میں نے سچائی سے اعتراف کیا۔ آپ مجھے اچھی لگیں۔ آپ کی گفتگو، آپ کا سراپا، آپ کا انداز سب جیسے میرے دل میں اتر گیا۔ آپ کی ذہانت نے مجھے اسیر کر لیا!''

''آپ مجھے نوکری کی آفر کرنے تو نہیں آئے؟'' اس نے اچانک سوال کیا۔

''بالکل نہیں۔!'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''مجھے آپ کی کل وقتی ضرورت ہے جز وقتی نہیں۔''

''میں ضرورت ہوں؟'' وہ ہنسی۔ اس کے بھرے بھرے گلابی لبوں میں بلا کی جاذبیت تھی۔ بعض اوقات

زندگی میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو شاید قدرت نے اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوتے ہیں۔ نک نک سے درست اور پھر بلا کی مقناطیسیت۔

''کیا یہ سچ اچھا نہیں لگا آپ کو؟'' میں نے پوچھا۔ ''محبت، پیار، اظہار، قربت یہ سب جذبے ہمیں اپنی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں اور بقول آپ کے آپ افلاطونی محبت کی قائل نہیں!'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''آپ میرے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں نا، میرا ماضی نا میرا حال۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ آپ کو اپنے معاملاتِ دل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ کیا پتا کل مجھ سے بہتر کوئی آپ کو مل جائے اور آپ اپنے قیمتی احساسات کا تحفہ اسے پیش کر رہے ہوں!''

''شاید آپ مجھے کوئی دل پھینک قسم کا یا کوئی شوقین انسان سمجھ رہی ہیں۔ جس طرح میں آپ کے ماضی کے متعلق نہیں جانتا، اسی طرح آپ میرے متعلق نہیں جانتی ہیں۔ زندگی میں آپ سے پہلے کسی نے بھی اس طرح متاثر نہیں کیا کہ میں اس کے لیے خود کو بے بس محسوس کروں۔!''

''آپ بہت جذباتی ہیں۔''

''جذبات کے بغیر زندگی بوجھ بن جاتی ہے۔''

''میرے لیے زندگی بوجھ ہی ہے۔''

''جی ہاں۔ مگر جب تک کہ کوئی اس بوجھ کو بٹانے والا نہ ملے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ نجانے کیوں میں نے اس کی آنکھوں میں دھند سی محسوس کی۔

''آپ نے کوفی ختم نہیں کی۔ یہ تو ٹھنڈی ہوگئی ہے۔'' اس نے کہا اور ساتھ ہی انٹرکام پر بیل کر کے چائے لانے کا آرڈر دیا۔ اس کے بعد وہ کاغذوں کو اِدھر اُدھر کرنے لگی۔ میں کچھ نہیں بولا۔ بس اس کی مصنوعی مصروفیت دیکھتا رہا۔

''چائے رہنے دیجیے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اجازت دیجیے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ بس کاغذات اِدھر اُدھر کرتی رہی۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔

کمرے سے باہر نکل کر مجھے محسوس ہوا کہ میں پہلے سے زیادہ خالی ہوگیا ہوں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے خود سے پوچھا۔ مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ میں عمارت سے باہر آگیا۔

☆☆☆

سیٹھ عبدالوہاب کی بیٹی کی شادی میں مجھے وہ دونوں مسلسل نظر آئے۔ پتا چلا کہ اصغر صاحب نے ہی سیٹھ عبدالوہاب کی بیٹی کا رشتہ کروایا تھا۔ دونوں دور پرے کے رشتے دار تھے۔

کیٹرنگ کے انتظامات کے سلسلے میں وہ کئی بار میرے سامنے آئی۔ پتا نہیں کیوں اس کو دیکھ کر میرا دل بات کرنے کو نہیں چاہا۔ ایک عجیب سی سرد مہری نے مجھے گھیر لیا۔ اس نے دو چار بار میری طرف دیکھا لیکن یوں جیسے ہم اجنبی ہوں۔ شناسا اجنبی۔

☆☆☆

کافی دن گزر گئے میں نے اس سے رابطہ نہیں کیا۔ نجانے مجھے کیا دکھ تھا نظر اندازی کا، میرے جذبے کو بے ثمر کرنے کا۔ میری شخصیت میں عجیب سی اداسی نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ شاید اسی کیفیت کو شاعر کربِ نارسائی کا نام دیتے ہیں۔

''کیا بات ہے بہت الجھے ہوئے دکھائی دے رہے ہو؟'' نغمی نے پوچھا۔

''پتا نہیں!'' میں نے کندھے اچکائے۔ ''امی کہاں ہیں؟''

''وہ ابصار انکل کو دیکھنے گئی ہیں۔ کل ان کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔'' نغمی نے بتایا اور اپنی ناک پر سرک

آ ئے چشمے کو ٹھیک کیا۔
''تم اپنا چشمہ کیوں نہیں بدل لیتی ہو، شاید اس کی کمانیاں ڈھیلی ہوگئی ہیں۔'' میں نے اس کو صلاح دی۔
''ہاں کسی دن جاؤں گی تو بدل لوں گی۔ بچے فرصت کہاں لینے دیتے ہیں۔'' نغمی نے کہا۔ اس کے چار بچے تھے اور چاروں ہی غضب کے شیطان، اب پانچویں کی دنیا میں آمد آمد تھی۔ اسی لیے امی نے اس کو گھر بلالیا تھا۔
''تم بھی شادی کرلو۔'' نغمی نے مجھے دیکھا۔ ''امی چاہتی ہیں کہ جلد سے جلد تمہارا سہرا دیکھ لیں۔''
''کوئی ملے تو سہی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
''تم پسند کی شادی کرنا چاہتے ہو؟'' نغمی نے گھورا۔
''کیا حرج ہے؟'' میں نے کہا۔ ''زندگی مجھے گزارنی ہے۔''
''تو پھر امی کو جواب داری کرنا۔'' اس نے اطمینان سے کہا اور سویٹر کی سلائیاں چلانے لگی۔
نجانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں روشنی سے بات کروں۔ مگر میرے پاس اس کا نمبر نہیں تھا۔ کیا اس کے آفس جاؤں، میں نے سوچا۔ نغمی شاید میرا ہی جائزہ لے رہی تھی۔
''کوئی پریشانی ہے۔'' نغمی نے پوچھا؟ ''بتاتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟''
''کوئی خاص نہیں!'' میں نے جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے گاڑی پورچ سے نکالی اور جوڑیا بازار کا رخ کیا۔ سڑکیں خالی اور بہت معمولی سا ٹریفک تھا۔ میں روشنی کے خیال میں جوڑیا بازار پہنچ گیا۔ میں نے اس کے دفتر کے نیچے گاڑی روکی اور دیکھا ہر طرف ویرانی تھی۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا؟ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر لگے الیکٹرانک کیلنڈر کو دیکھا۔ آج اتوار تھی۔

اچانک ہی مجھے ہنسی آگئی۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ عشق کہتے ہیں جس کو خلل ہے دماغ کا۔ کسی نے جواب دیا۔ شاید یہ میرے دل و دماغ کی جنگ تھی۔
میں واپس آگیا۔

☆☆☆

بے ربط، بے مزہ دن اور سونی راتیں۔ دن بہ دن میری جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ مگر میں بے بس تھا۔ شاید ایسی بے بسی اور تشنجی کیفیت کو محبت کا آزار کہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ تب ہی ایک دن وہ مجھے زیب النساء اسٹریٹ پر سیکو واچ کے سامنے مل گئی۔ میں ایک ضروری کام سے صدر آیا تھا اور گاڑی وہیں پارک کرکے اس طرف آیا تھا کہ وہ مجھے نظر آگئی۔
''سنیے۔!'' میں تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔
اس نے رک کر مجھے دیکھا۔ ''ارے آپ!''
''کہاں تھیں آپ؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ میرا سارا چہرہ، سارا لہجہ اپنی تڑپ کی گواہی دے رہا تھا۔
''میں وہیں ہوں، جہاں تھی۔ آپ کو نہیں معلوم؟'' اس نے جواباً سوال کر دیا۔
''چلیے کہیں بیٹھتے ہیں!'' میں نے اس کا بازو تھام لیا۔
ایک لمحے کے لیے اس کا سارا بدن جھنجھنایا، جس کا ارتعاش میں نے اس کے بازو میں بھی محسوس کیا۔ خود مجھے حیرت ہوئی کہ میں نے کس طرح ایک لمحے میں ایسی جسارت کر ڈالی۔
وہ بغیر کچھ بولے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔
میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔
''سوری۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔
ہم چلتے ہوئی گاڑی کے پاس آ گئے۔ دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی میں نے کہا۔ ''کیوں نا کھانا کھالیا جائے۔''
''اچھا!'' اس نے اپنی روایتی بے نیازی سے کہا ''چلیں کھانا کھالیں۔''
میں نے پارکنگ سے گاڑی نکالی وہ گھوم کر میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا۔
''آپ کا گھر کہاں ہے؟''
''کیا گھر کا کھانا کھائیں گے۔؟'' اس نے مسکرا کے پوچھا۔
''کیا آپ واقعی میرے گھر آ جائیں گی؟'' میں نے بڑے پُر اشتیاق انداز میں کہا۔
''یہ تو آپ پر منحصر ہے!'' اس نے جواب دیا۔
''کیا میرے جذبے میں اتنی شدت ہے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا؟ ''آپ نے محسوس کیا؟''
''ہر چیز کو زیر بحث لانا ضروری ہے کیا؟'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''آپ ہر سوال کا جواب کیوں چاہتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا اور بعض اوقات تشنگی باقی رہنے سے بہت سی اذیتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔''
''دراصل میں نے گھر کا اس لیے پوچھا تھا کہ اس کے قریب ہی کھانا کھالیتے ہیں، پھر آپ کو گھر ڈراپ کردوں گا۔'' میں نے زچ آ کر کہا۔
وہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں بلا کی کشش تھی۔ کھینچ لینے والی۔ قریب کر لینے والی۔
''بہادر آباد میں رہتی ہوں۔ اس نے بتایا۔
میں نے گاڑی نمائش چورنگی کی طرف گھمالی۔
لبرٹی کے ایک خوبصورت پرسکون ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ہم نے کھانے کا آرڈر دیا۔
''آپ کو کچھ منگوانا ہے۔؟'' میں نے آرڈر لکھواتے ہوئے پوچھا۔
''میزبان کا حسن انتخاب دیکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ مسکرا کے ٹال گئی۔ تھوڑی دیر ہمارے درمیان خاموشی کی سفاک چادر تنی رہی۔
''اگر برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں۔'' میں نے اس سے کہا۔
''جی ضرور کہیے، مجھے امید ہے کہ آپ برا ماننے والی بات کریں گے ہی نہیں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔
''میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ اور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔
میری بات سن کر اس کے چہرے پر کوئی ردِ عمل ظاہر نا ہوا۔ وہ اپنے بالوں کی جس لٹ سے کھیل رہی تھی۔ بدستور اسی لٹ سے کھیلتی رہی۔
''آپ خاموش ہیں یا میری خواہش اتنی لایعنی ہے کہ اس کا جواب بھی نہیں۔'' میں نے پوچھا۔ مجھے خود محسوس ہوا کہ جیسے افسردگی کی ٹھنڈ نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔
''اگر میں کوئی عام سی گھریلو لڑکی ہوتی تو میرا چہرہ آپ کو سب کچھ بتا دیتا۔ شرمائی سی کیفیت میرے دل کا راز عیاں کر دیتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں۔ جب حصول کے تمام طریقے ناکام ہو جائیں تو یہ سب سے کارآمد حربہ ہوتا ہے۔ عشق، محبت، قربانی، سچائی سارا کچھ اس سوال میں سمٹ آتا ہے۔'' وہ دھیمے سے بولی۔
''آپ بہت اچھے ہیں لیکن میں اچھی نہیں ہوں۔ مجھے مردوں سے چڑ ہے۔''
''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' مجھے اس کی بات پر بے پناہ غصہ آیا۔ میری مردانگی اچانک ہی ایک زوردار انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔ ''آپ کی صاف گوئی اچھی بات ہے، لیکن میں نے آپ کے حصول کی واقعتاً کوئی کوشش نہیں کی۔ پتا نہیں کیوں مجھے تم اچھی

لگنے لگی ہو۔" میرے انداز میں نجانے کہاں سے بے تکلفی کا رس آگیا۔ جو ایک لمحہ پہلے میرے اندر غصے کا جوار بھاٹا اٹھا تھا وہ جیسے اچانک ہی ختم ہو گیا۔

"تمہیں مردوں سے کیوں نفرت ہے مجھے نہیں معلوم اس لیے کہ ہر فرد کے کچھ اپنے قرینے اور ضابطے ہوتے ہیں، جن کے ذریعے وہ اپنے اخلاقی معیار طے کرتا ہے۔ اس لیے میں تمہارے ماضی کا کوئی معاملہ، کوئی حوالہ، کوئی تلخی جاننا نہیں چاہتا۔"

اس نے مجھے گہری نگاہ سے دیکھا۔ ویٹر کھانا سرو کر رہا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو وہ پلیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔

"ایک بات کی وضاحت کروں کہ مجھے مردوں سے چڑ ہے، نفرت نہیں۔"

"یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ وہ سچ مچ بال کی کھال نکالنے اور گفتگو کا رخ پلٹنے کی ماہر تھی۔

"نفرت میں آپ کسی کو برداشت ہی نہیں کر سکتے، بلکہ چڑتے ہوئے آپ کو برداشت کرنے کا ہنر آ جاتا ہے۔ یہ دنیا مردوں کی ہے، لہٰذا مگر مچھ سے بیر لے کر دریا میں نہیں رہا جا سکتا۔ لیکن مگر مچھ کو دور رکھنے کے لیے جتن کیے جا سکتے ہیں۔"

"ہمارے فیصلے، ہمارے نظریات، ہمارے ماضی کی بھٹی میں تپ کر پختہ ہوتے ہیں۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔" میں نے نرمی سے کہا اور نوالہ نگلا۔

"آپ سچ مچ اس قدر ٹھہراؤ والے ہیں یا مجھے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔" اس نے مزید چاول اپنی پلیٹ میں ڈالتے کہا اور سر کو ہلکے سے جھٹکا دیا۔ ننھی سی یاقوت کی سرخ لونگ جھلملا گئی۔

"زندگی میں جب بھی کوئی مجھے اچھا لگا میں نے اس کو خوبیوں اور خامیوں سمیت اپنایا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنے بزنس میں کامیابی ملی ہے۔ آپ کے بھی مسائل ہوں گے۔ کسی نے سلجھائے ہوں گے اور کسی نے الجھائے ہوں گے، یہی زندگی کا چلن ہے۔"

"میں اچھی نہیں ہوں۔"

"کوئی بھی مکمل برا نہیں ہوتا۔"

"آپ میرے اور اصغر صاحب کے تعلق کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" اس نے تلملا کر کہا۔

"ہر تعلق ماضی بن جاتا ہے۔" میں نے رسانیت سے کہا۔ "بشرطیکہ اس کے تانے بانے دل کی تاروں اور جذبوں کی گانٹھوں سے نا گوندھے گئے ہوں۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں اصغر صاحب کی وائف کم سیکریٹری ہوں، وہ زچ ہو کر بولی۔ پھر بھی آپ میری طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔"

"میں مجبوری کو تعلق نہیں مصلحت سمجھتا ہوں۔"

"آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں بالکل بھی اچھی نہیں ہوں۔ بدتمیز ہوں۔ منہ پھٹ ہوں۔ بدلحاظ ہوں۔ پھوہڑ ہوں۔ گھر نا چلانے کے سارے گن مجھ میں ہیں۔ میں اپنی ماں سے محبت نا کر سکی، آپ کی ماں کو کیسے کوئی مقام دے سکوں گی۔" وہ جیسے پھٹ پڑی۔

انسان مثل پیاز پرت در پرت کھلتا ہے اور آنسو نکلنے لگتے ہیں۔ انتہائی مضبوط مگر اندر سے گداز۔ یہ کیا چیز بنائی اللہ میاں جی آپ نے۔ ٹیڑھی میڑھی لچکدار عجیب سی مخلوق۔

"عورت کو ہمیشہ پامال کیا گیا۔ رشتے کے ترازو میں رکھ کر تولا گیا اور ہر بار وزن میں عورت ہی ہلکی ہوتی ہے۔"

وہ دھیمے دھیمے بولنے لگی۔ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔ "اصغر صاحب بہت اچھے ہیں۔ لیکن وہ مجھ سے جسمانی تعلقات نہیں رکھتے۔ وہ ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں، چٹکیاں نوچ لیتے ہیں، کان مروڑ دیتے ہیں اور بس اس سے زیادہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں بس میں تجھ سے اسی طرح خوش ہوتا ہوں۔ آج کل چالیس ہزار کی ملازمت کہاں ملتی ہے۔ لوگ تو دس ہزار روپے

میں عقل ذہانت اور بدن چوس جاتے ہیں اور ان کی اچھی بات یہ کہ انہوں نے مجھے سہارا دیا اور انٹرویو کے دوران ہی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مجھ سے ایسی دوستی رکھیں گے اور اس سے زیادہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زانی کی بخشش نہیں انہیں موت اور عذابِ قبر سے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''عجیب آدمی ہیں'' میرے منہ سے نکلا۔''لیکن کیا یہ حرکتیں گناہ نہیں؟''

''اپنے اپنے نکتۂ نظر کی بات ہے''۔اس نے کہا اور سیون اپ کا ایک گھونٹ بھرا۔''کھانا کھا لیا، اب چلیں''

''کچھ دیر اور بیٹھیں!'' میں نے کہا۔''ایک اچھی سی کوفی پیتے ہیں''۔ میں اس کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنا چاہ رہا تھا۔

''اچھا!'' وہ مسکرائی اور پھر گنگنا کر بولی۔

''راہ پر لگا تو لائے ہیں باتوں باتوں میں۔
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں''

میں ہنس دیا۔ بلا کی قیافہ شناس لڑکی تھی وہ۔

جب میں نے اسے بہادر آباد چورنگی پر اتارا تو وہ بولی''میری مانیے اور مجھ جیسی بے تکی، بے ڈھب لڑکی سے شادی کا خیال نکال دیجیے۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ کو ایک سے ایک خوبصورت طرحدار لڑکیاں مل جائیں گی۔ نرم و نازک شرمائی شرمائی سی!''

''صحیح کہا آپ نے۔'' میں نے جواب دیا''لیکن میں کیا کروں اگر مجھے بے تکی سی، بدتمیز سی لڑکی اچھی لگنے لگے۔''

''یہ دماغ کی خرابی کی واضح نشانی ہے'' وہ مجھے گھور کر بولی اور گاڑی کا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر کے بغیر خدا حافظ کہے چل دی۔

میں چند لمحے اس کی گربہ چال دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

''اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ!'' نغمی نے مجھے مخاطب کیا۔

''کوئی بات نہیں!'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور ایک زوردار انگڑائی لی۔ ''چائے کا دل چاہ رہا ہے، زبردست سی چائے پلواؤ!''

''میں بنا کر لاتی ہوں!'' نغمی بولی۔

''بالکل نہیں، شریفاں کو آواز دے کر کہہ دو!'' میں نے منع کیا ''تمہیں زیادہ کام کرنے کی ضرورت نہیں!'' میں نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔

نغمی نے شریفاں کو چائے کا کہہ دیا اور میرے بیڈ کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھ کر مجھے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا پیٹنے کا ارادہ ہے؟'' میں نے مسکرا کے پوچھا۔

ہم دونوں بھائی بہن میں سال بھر کی چھٹائی بڑائی تھی۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹی ہونے کے باوجود مجھے خوب پیٹتی تھی۔

''بچپن میں تم مجھ سے ہر بات شیئر کرتے تھے۔ اب کیوں چھپاتے ہو؟'' اس نے گلہ کیا۔

''کوئی خاص بات نہیں''

''پھر اٹوانی کھٹوانی پر کیوں پڑے ہو، تم تو گھر پر ٹکتے ہی نہیں ہو؟'' نغمی نے جرح کی۔ ''تمہارے چہرے پر صاف لکھا ہے کہ تم کسی الجھن میں مبتلا ہو'' اتنی عزیز بہن تھی وہ کہ میرے سارے احساسات کی خبر رکھتی تھی۔ لیکن میں کیا بتاتا کہ میں ایک پہیلی کو سلجھاتے سلجھاتے خود الجھ گیا ہوں۔ ایک ایسی کہانی کا حصہ بن گیا ہوں کہ جس کے آغاز اور انجام میں بے بس ہوں۔

''کیا محبت ہو گئی ہے؟'' نغمی نے پوچھا۔

میں ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگا۔

نغمی اچانک ہنسنے لگی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم کوئی

کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔ یقیناً تم سے جذبات کا اظہار نہیں ہو پا رہا ہوگا۔ کہیں آتشِ حسن سے جل تو نہیں گئے؟''

''تم بہت بے تکی باتیں نہیں کرنے لگیں؟'' میں نے سر کھجایا۔ ''میرا خیال ہے کہ کثرتِ اولاد عقل پر اثر انداز ہو رہی ہے''

''نا چھپایا جائے گا فسانۂ عشق، اک آگ سی لگی ہے اور دھواں اٹھتا نہیں۔'' نغمی نے ہنس کر کہا۔ اسی وقت شریفاں چائے لے آئی۔ جب وہ چائے رکھ کر چلی گئی تو اپنا کپ اٹھاتے ہوئے نغمی نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے جولڑکی پسند کی ہوگی اس میں کوئی نا کوئی غیر معمولی خوبی ضرور ہوگی۔'' وہ خاموش ہو کر چائے کا گھونٹ بھرنے لگی۔

میں نے کوئی جواب دیے بغیر اپنا کپ اٹھالیا اور ہلکے ہلکے گھونٹ بھرنے لگا۔ بھاپ اڑاتی چائے کے عقب میں ننھی سی سرخ لونگ کا لشکارا پلک جھپک رہا تھا۔

☆☆☆

میں جو ایک کامیاب بزنس چلا رہا تھا۔ خوش شکل، خوش قامت تھا مگر اس پری زاد کو ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میرے پاس اس کا نمبر تک نہیں تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا لایعنی سوچوں میں گرفتار تھا۔ بعض اوقات ہم بہت کچھ سوچنے کے باوجود کچھ نہیں سوچ رہے ہوتے ہیں۔ اچانک ٹیلی فون کی بیل ہوئی۔ میں نے چونک کر فون کی طرف دیکھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھالیا۔ ''ہیلو''

''آپ بزی تو نہیں؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ وہ آواز جس کو میں قیامت کے شور میں بھی شناخت کر سکتا تھا۔

''آپ...... روشنی...... کیسی ہیں آپ؟''

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ اگر آپ فری ہیں تو میرے ایک کلائنٹ آپ سے اپنے فنکشن کے سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔'' روشنی نے بتایا۔

مجھے ایسا لگا کہ بے پناہ خوشی ایک لمحے میں کافور ہو گئی ہو۔ ''اور آپ نے صرف اس لیے فون کیا ہے؟'' اچانک میرے لہجے میں اکتاہٹ در آئی۔ ''آپ کب سے میری بزنس ایگزیکٹو بن گئیں؟''

''یہ لیجیے اسلم صاحب سے بات کیجیے'' اس نے میری بات کا جواب دیے بغیر ریسور کلائنٹ کو تھما دیا۔

''ہیلو میں اسلم بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''یار آپ لوگ کھانا بہت مزے کا پکاتے ہو۔ میرا فنکشن بھی آپ لوگ بناؤ۔ یہ اپنی مس روشنی تمہاری کارکردگی پر بڑی روشنی ڈالتی رہتی ہے۔'' اسلم نے دورانِ گفتگو پھر قہقہہ لگایا۔ غالباً اسے بات بے بات پر قہقہہ لگانے کی عادت تھی۔

''آپ نے سیٹھ عبدالوہاب کا بڑا مزے والا فنکشن کیا تھا۔ اپنے مہمان بھی کوئی آٹھ سو ہوں گے۔ تینوں دن مہندی، شادی، ولیمہ۔ کیا کریں جی۔ اپنے بیٹے کی وجہ سے سب کرنا پڑ رہا ہے۔ لڑکی والوں کا خرچہ بھی ہم نے ہی اٹھانا ہے۔ ہمارا لاڈلا پکا سوّر ہے گن گن کے بدلے لے رہا ہے ہماری کنجوسی کے......''

اسلم نے پھر قہقہہ لگایا۔ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

''لو جی آپ کی طرف سے بھی ہنسی کی آواز آ گئی ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں اکیلے ہی بک بک کیے جا رہا ہوں'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''آپ فکر نا کریں انشاء اللہ سارا انتظام آپ کی فرمائش کے مطابق ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دی اور کہا ''اگر آپ میرے دفتر آ جائیں تو مینو سلیکٹ کرنے میں آسانی ہوگی۔''

''لو جی خیر سے آپ کچھ پکواؤ شکواؤ، ہم آتے ہیں۔ یہ اپنی مس روشنی کو تو آپ کا دفتر معلوم ہے نا جی۔''

''جی ہاں'' میں نے کہا۔
''لو جی مس روشنی سے بات کرلو'' اس نے ریسیور روشنی کو تھما دیا۔
میں نے پوچھا ''میرا دفتر معلوم ہے آپ کو؟''
''جی ہاں'' وہ بولی۔ ''ڈیفنس کمرشل ایریا فیز 4''
''کمال ہے'' میں نے کہا۔ ''آپ کا انتظار کر رہا ہوں''

☆☆☆

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اسلم اور روشنی آ گئے۔ اسلم بھاری بدن کا خوش مزاج آدمی تھا۔ کھل کر لطیفے، چٹکلے سن کر اور سنا کر قہقہے لگانے والا۔ میں نے ان کے لیے باربی کیو بنوالیا تھا۔ چائے سے پہلے انہوں نے کھایا تو دونوں ہی تعریف کیے بنا، نارہ سکے۔
''کمال ہے جی'' اسلم نے کہا ''یہ کون سے مسالے ڈالتے ہو آپ۔ ایسا ذائقہ تو مجھے پہلے کبھی نہیں ملا۔ کچھ ہمیں بھی بتا دو اپنے آصف صاحب۔''
''اسی کے تو ہم پیسے لیتے ہیں اسلم صاحب۔ اب اگر یہی راز سب کو بتاتے رہے تو کچھ دنوں کے بعد یہاں تالے لگے ہوں گے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
اس کے بعد مینو فائنل ہوا۔ حساب کتاب کے بعد کل رقم کا ایڈوانس چیک کاٹ کر مجھے دے دیا گیا۔
''اچھا جی مجھے اجازت دو۔'' اسلم نے کہا اور روشنی سے پوچھا ''آپ ابھی دفتر جاؤ گی یا پھر ابھی ادھر ہی ہو؟''
''میں چلی جاؤں گی۔ میرے پاس گاڑی ہے۔'' روشنی نے جواب دیا۔
اسلم مجھ سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا۔
اسلم کے جانے کے بعد جیسے ہم دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ بالآخر میں نے کہا ''میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھے کیٹرنگ کے حوالے سے یاد رکھا۔''
''اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟ آپ جو کام کرتے ہیں اگر دوسرے کو اسی کی ضرورت ہے، تو میں نے کیا کیا؟ صرف یہی کہ دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔''
وہ مزید بولی ''کیا کوفی نہیں پلائیں گے''
''آپ کو کوفی پسند ہے؟''
''مجھے ہر تلخ چیز پسند ہے۔'' اس نے عجیب سا جواب دیا۔ ''کڑوی چیز کا ذائقہ سدا بہار ہوتا ہے۔ زبان سے حلق اور معدے تک یکساں کڑواہٹ بھر دیتا ہے''
''آپ اتنی تلخ کیوں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''میں ایسی ہی ہوں'' اس نے جواب دیا۔ ''یہی میری فطرت بن گئی ہے۔ میرے تجربات۔ مشاہدات مجھے صرف نرمی اور گداز مروت کا ریشمی احساس نہیں ہونے دیتے تو میں کیا کروں۔ وہ کیا کہتے ہیں بقول شاعر دنیا نے حوادث کی شکل میں جو کچھ دیا تھا مجھ کو، لوٹا رہا ہوں میں......'' اس کی گفتگو میں بلا کی روانی تھی۔
''شعر نامکمل ہے۔ لگتا ہے کہ آپ کچھ بھول گئی ہیں'' میں نے کہا۔
''تو کیا ہوا مافی الضمیر تو واضح ہے'' اس نے ترنت جواب دیا۔
مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ ہنستی ہوئی وہ اچھی لگتی تھی۔ اس کے رخساروں پر پڑنے والے ننھے ننھے گڑھے نمایاں ہو جاتے تھے۔ 'تم ہنستی مسکراتی رہو' میرے دل نے بہت خلوص سے اس کو دعا دی۔
''کیا دیکھ رہے ہیں آپ اتنے غور سے؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔
''پتا نہیں......'' میں نے ایک گہری سانس لی۔
''تم دن بہ دن میرے اندر سماتی جا رہی ہو۔ تم میرے اتنے قریب آ گئی ہو کہ دوری کا تصور محال ہوتا جا رہا ہے۔''

''یہ سب کتابی باتیں اور حسابی جملے ہیں۔ کون کسی کے لیے مرتا ہے؟ ہم انسان ہیں جس قدر بھی قریب ہوں اپنے اپنے بدن کے حصار میں رہتے ہیں۔''

''پتا نہیں میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔'' میں سچ مچ بے بس ہو گیا تھا اس کے سامنے۔ مگر وہ عجیب پتھر دل لڑکی تھی۔ میرے جذبے کے سارے رس اس کی پتھریلی روح پر خشک ہوئے جاتے تھے۔

''میں آپ سے کہتی ہوں کہ آپ کسی اچھی سی، پیاری سی لڑکی سے شادی کر لیں'' وہ مجھے سمجھانے لگی۔

''میں اچھی نہیں ہوں۔ میرے اندر جذبے کی کرنیں نہیں پھوٹتی ہیں۔ میرا نام روشنی ہے۔ لیکن میرے اندر بہت اندھیرا ہے۔''

''اتنی دلکش گفتگو کرتی ہو۔ مگر احساس میں پتھر ہو'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتی ہو۔''

''آپ کوفی تو پی لیں، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' اس نے میرے کپ کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے کپ اٹھا کر ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اچانک ہی مسکرا دی۔

''اصل میں مجھے مردوں پر اعتبار ہی نہیں۔ مجھے ان سے چڑ ہے، میں نے ہر مرد کو لالچ کے کیچڑے سے بھرا ہوا پایا ہے۔ بچپن، لڑکپن، جوانی ہر مرحلے پر ان کے پنجے گوشت نوچنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔'' وہ دھیمے دھیمے کہنے لگی۔ ''میرے دل میں محبت کی کوئی کونپل نہیں پھوٹتی۔ کیونکہ میں اسے پھوٹنے سے پہلے ہی بے حسی کے تیزاب سے جلا دیتی ہوں۔ میں اپنے دکھوں، اپنے زخموں کا، اپنے آپ کا کسی سے بیان کیوں کروں۔ ہمدردی کی طلبگار کیوں بنوں؟ صرف اس لیے کہ ایک اور شکاری مجھے تاک لے؟'' وہ چپ ہو گئی۔

''کیا میں ابھی تک تمہارے لیے صرف 'کسی' تک محدود ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''زندگی کا سفر بہت تیز ہے آصف صاحب! یہاں تو ملتے ہی بچھڑ جانے کے لیے ہیں۔ وہ کون سا رشتہ ہے جو سدابہار ہے؟ جس کی تابناکی، جس کی گرمی، جس کے تعلق کی حرارت دل کو چھوئے۔ کوئی نہیں آصف صاحب۔ ہمیں اپنے اپنے دائرے میں زندگی بتانے کی عادت ڈالنی چاہیے ورنہ تھپیڑے ہمارا مقدر بن جاتے ہیں'' وہ چپ ہو گئی۔ میں بھی خاموش تھا۔ کمرے کی فضا جیسے بے حسی سے ہمیں گھور رہی تھی۔

☆☆☆

کافی دن ہو گئے تھے روشنی سے کوئی بات، کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس کو بھول گیا تھا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میری کوئی شب ایسی نہیں گزری تھی جو اس کے خواب، اس کی آرزو سے پُر نہ ہو۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اس سے رابطے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دکھوں کا بہت بڑا بوجھ اپنے بدن، اپنی روح پر اٹھائے ہوئے تھی۔ اس کے اندر بلیک ہول جیسی کشش تھی۔ جو اپنے اردگرد کی ساری توانائی اپنی مہیب کشش میں نگل جاتے ہیں۔

میں آرڈر کے سلسلے میں مسالے لینے حاجی صاحب کی طرف جوڑیا بازار آیا ہوا تھا کہ اچانک نجانے کیوں اور کیسے میرے قدم رام داس بلڈنگ کی طرف اٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں، میں اصغر پرفیومری کے دفتر کے سامنے کھڑا تھا۔ میں دستک دے کر اندر پہنچا۔ اینگلو انڈین خاتون کا ڈیسک خالی تھا۔ میں چند لمحوں کے لیے رکا۔ پھر اندر چلا گیا۔ روشنی کی میز پر کوئی دوسری لڑکی موجود تھی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''مس روشنی کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو چلی گئیں!''

''کیا......؟'' میں پریشان ہوگیا'' کب اور کہاں ......کیوں چلی گئیں؟''

''معلوم نہیں!'' اس نے کندھے اچکائے۔'' مجھے تو ایک ہفتہ ہوا ہے جوائن کیے ہوئے۔''

''اصغر صاحب ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہیں، آپ کا نام......؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

مگر میں کوئی جواب دیے بغیر اصغر کے کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ میں بغیر دستک اندر پہنچ گیا۔ اصغر کسی فائل پر جھکا ہوا بڑے انہماک سے کام کر رہا تھا۔

''اصغر صاحب۔'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''ارے آپ آصف صاحب!'' اس نے سر اٹھا کر مجھ پر نظر پڑتے ہی بڑے تپاک سے کہا۔ ''آؤ......آؤ بیٹھو۔ کیا پیو گے چائے یا کوفی!''

''کچھ نہیں!'' میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''مس روشنی کہاں چلی گئیں؟''

''وہ تو چھوڑ کر چلی گئی۔ بہت بیمار ہے وہ۔'' اصغر نے کہا'' بڑی پیاری لڑکی ہے۔ مگر ہم کسی کو زبردستی روک تو نہیں سکتے۔'' اس نے گویا بڑی بیچارگی سے کہا۔

''کیا بیمار ہے وہ؟'' میں نے پوچھا۔'' کہاں ہے گھر پر یا ہاسپٹل میں؟''

''ہاسپٹل میں ہے!'' اصغر نے مجھے ہاسپٹل کا نام بتایا۔'' وہ بہت بیمار ہے مگر بہت ضدی ہے۔ کسی کی نہیں سنتی''

''کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں'' اصغر نے جواب دیا۔'' مجھے آٹھ ماہ پہلے ایک این جی او کے دفتر میں ملی تھی۔ وہ لوگ اس کو چھ سات ہزار دے رہے تھے۔ مجھے اچھی لگی تو میرے پاس آ گئی۔ چند ہی دنوں میں سارا کام سنبھال لیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کو ڈرائیونگ آتی ہے تو میں نے اس کو آلٹو دے دی۔''

''جاب کیوں چھوڑ دی؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ کہنے لگی اب دل نہیں لگتا۔ میں جا رہی ہوں۔ اب جانے والے اگر خود جانے کا فیصلہ کر لیں تو پھر انہیں کون روک سکتا ہے۔'' اصغر نے کہا۔

اس کا کہنا منطقی اعتبار سے درست تھا۔ میں اسے خدا حافظ کہہ کر نیچے اتر آیا۔

☆☆☆

میں بڑی تیزی سے ہاسپٹل پہنچا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑی تھی۔ گلابی رخسار خزاں رسیدہ تھے۔ سیاہ لمبی خمدار پلکیں، موٹی چمکتی کالی آنکھوں کو چھپائے پڑی تھیں۔ میں مبہوت اس کو دیکھتا رہا۔ روشنی جس نے میری زندگی کو، میرے احساسات کو محبت کی نئی جہت سے آشنا کیا تھا۔ جس کی کڑوی کسیلی باتوں میں مجھے امرت محسوس ہوتا تھا۔ جس کے خیال، جس کے خواب نے مجھے راتوں کو بے قرار اور میرے دنوں کو بے چین کیا تھا، وہ کس حال میں تھی۔ میرا دل کٹ کے رہ گیا۔ میں اس کے سرہانے پڑے اسٹول پر بیٹھ گیا اور اس کو غور سے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کا ہاتھ سرد ہو رہا تھا۔

''آپ آ گئے!'' اس کی مدھم سی آواز نکلی۔ میں اس کے چہرے پر نظر جمائے تھا۔ اس نے آنکھیں نیم وا بھی نہیں کی تھیں پھر بھی اس کو معلوم ہو گیا۔

''تم......!'' میں نے جواب دیا۔'' یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا لی۔ کیا ہوا تم کو؟ مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' میرا لہجہ جذباتی تھا۔ میرے ہاتھوں کی گرفت اس کے ہاتھ پر اتنی سخت ہو گئی کہ اس کی کراہ نکل گئی۔ میں نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔

''روشنی آنکھیں کھولو!'' میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا'' یہ تم نے کیا کیا؟''

''کچھ نہیں!'' اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ ''آپ نے مجھے مار دیا!'' دو آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل پڑے۔

''اپنے آپ کو ہلکان مت کرو۔'' میں نے نرمی سے کہا ''تم ایک بار مجھے آواز تو دے لیتیں، میرے تو سارے جذبے تمہارے لیے وقف ہیں!'' میں نے گلہ کیا۔

''اسی نے تو مجھے مار دیا۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''اب جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے تو جانا پڑ رہا ہے۔ جانے خدا کو مجھ بے تکی، بے ڈھب بدسلیقہ سے کیا کام پڑ گیا۔'' اس کے گِلے کے انداز نرالے تھے۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ بیماری اور صحت آگے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ تم جیسی بہادر لڑکی کو دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''آپ نہیں جانتے!'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''زندگی سے بھی بڑی حقیقت موت ہے۔ بعض اوقات ہم موت کی خواہش کرتے رہتے ہیں مگر موت نہیں ملتی اور جب موت سے روٹھ کر زندگی کی آرزو پیدا کرتے ہیں تو موت اپنا حق جتانے آجاتی ہے!''

''کیا موت، موت کی رٹ لگا رکھی ہے۔'' میں نے اسے دھیمے سے ڈانٹا۔ ''فضول باتیں بند کرو۔''

''مجھے کچھ کہنے دیں'' اس نے میری طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔ ''مجھے معاف کر دیں کہ میں آپ کے کسی جذبے کی پذیرائی نہیں کر سکی کیونکہ میں خوفزدہ تھی۔ لیکن جب دل نے آپ پر یقین کرنے کا فیصلہ کیا تو پھر منزل ہی بدل گئی۔''

وہ ذرا رکی اور پانی کی بوتل کی طرف دیکھا۔ میں نے بوتل سے پانی گلاس میں ڈال کر دیا۔ اس نے چند قطرے لیے جس سے بمشکل اس کی زبان تر ہوئی ہو گی۔

''تمہارے ڈاکٹر کا کیا نام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر شکیب'' وہ مسکرائی۔

''کیا وہ ڈیوٹی پر ہیں۔ میں ذرا ان سے مل لوں!''

''آپ میرے پاس بیٹھیں!'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''میں ابھی آتا ہوں ذرا ان سے مل لوں۔'' میں نے دھیرے سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''بیکار وقت ضائع کریں گے۔'' وہ ہنسی۔

میں کوئی جواب دیے بغیر کمرے سے باہر نکلا۔ اگلی راہداری کے اختتام پر ہی ایک کمرے کے باہر ڈاکٹر شکیب کے نام کی تختی لگی دیکھ کر میں دستک دے کر اندر داخل ہوگیا۔

''السلام علیکم!'' میں ان سے ہاتھ ملا کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''میں روشنی کی بیماری کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔''

''آپ ان کے کون ہیں؟'' ڈاکٹر شکیب نے سوالیہ نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔

''میں ان کا دوست ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں پہلی بار آپ سے مل رہا ہوں۔'' ڈاکٹر شکیب نے کہا۔ ''کہیں آپ آصف حسن تو نہیں؟''

''جی بالکل۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''آپ نے بہت دیر کر دی آصف حسن۔'' ڈاکٹر شکیب کا لہجہ پُرتاسف ہوگیا۔ ''روشنی بجھ رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''روشنی جگر کے کینسر کی آخری اسٹیج پر ہے۔'' ڈاکٹر شکیب نے جواب دیا۔ ''اس کے پاس چند دن کی مہلت ہے۔ اگر آپ اس کے یہ آخری چند دن اپنی توجہ سے آسان کر سکیں تو.....'' ڈاکٹر شکیب چپ ہو گئے۔

مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی زبردست آندھی نے مجھے

اکھاڑ دیا ہو۔ میرا وجود جیسے یکا یک منوں وزنی ہو گیا ہو۔ اتنی دلکش، شاندار، اتنی پیاری لڑکی موت کو پیاری ہو رہی ہے۔

''لیکن کیوں......؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''اب تو بہت جدید علاج آ گئے ہیں، جگر ٹرانسپلانٹ ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا بہترین علاج ہو رہا ہے۔ پھر آپ کیوں اتنے مایوس ہو رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں، لیکن روشنی نے کوئی توجہ نہیں دی، میں دو سال سے اس کا معالج ہوں۔ اس نے سخت لاپروائی کی ہے۔ کہتی ہے کہ میں جینا نہیں چاہتی۔ اس کے لیے جیوں جب اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ مرد ہوتی تو اپنا ایک گھر بنا لیتی، عورت ہوں وہ بھی تنہا۔ میرا گھر کہاں بنے گا!''

''ڈاکٹر صاحب آپ کے پاس اس کی ساری رپورٹس ہیں۔ آپ کے علم میں کوئی ڈونر ایجنسی ہو جس سے جگر کا عطیہ مل سکے۔ پیسوں کی آپ پروا نا کریں۔ جو بھی ہو گا مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔''

''اس کا فائدہ نہیں!'' ڈاکٹر شکیب نے افسردگی سے کہا ''ان سارے معاملات میں کم از کم ایک سے دو ماہ درکار ہوتے ہیں اور روشنی اگر دو چار دن بھی گزار لے تو معجزہ ہو گا۔ اب تک اس نے اپنی ہمت اور ضد سے خود کو بچائے رکھا لیکن اب ممکن نہیں۔ باڈی پارٹس صرف ہمت سے نہیں چلتے ہیں ان کے لیے ان کا اپنا صحت مند ہونا ضروری ہوتا ہے!''

میں ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اسی وقت انٹرکام پر کسی نے ڈاکٹر شکیب کو کوئی پیغام دیا۔ وہ معذرت کر کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

میں بہت مشکل سے اٹھا اور روشنی کے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں روشنی کے پاس نہیں جا رہا بلکہ پھانسی گھاٹ کی طرف جا رہا ہوں۔ میں روشنی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ مسکرائی۔ میں اس کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''تم نے مجھ سے اپنی بیماری کیوں چھپائی؟''

''کیا ضروری ہے کہ دوستوں کو پریشان کیا جائے۔ ہر شخص اپنے مسائل کے انبار تلے دبا ہے۔'' اس کے انداز میں پھر وہی بے نیازی چھلک آئی جس نے مجھے اس کا اسیر کر دیا تھا۔

''لیکن میں نے تو تمھیں چاہا ہے۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''میں تھک گئی ہوں اب سونا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی ''مجھے اس دنیا سے ملا ہی کیا ہے؟ میں نے خدا سے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ لیکن ایک بات خدا سے جا کر پوچھوں گی۔ اگر وہ عادل ہے تو مجھے اتنا تو بتا دے کہ جنہیں دنیا میں اکیلا رہنا ہوتا ہے تو انہیں خوبصورتی کیوں عطا کرتا ہے۔ اتنا بدصورت تو بنا دے کہ لوگ اس کو چین سے جینے دیں!''

''اپنے دکھ مجھے دے دو۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''دکھ!'' وہ ہنسی ''وہ اپنے قمر جلالوی صاحب فرماتے ہیں کہ اب نزع کا عالم ہے مجھ پر، تم اپنی محبت واپس لو، جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں۔ آپ بھی اپنی محبت واپس لے لیں۔ میں اتنا بوجھ نہیں سہار سکتی!''

اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔

''تم کہتی رہو۔ میں سنتا رہوں!'' میں نے اس کا ہاتھ سہلایا۔

''میں بہت چھوٹی تھی۔ دو ڈھائی سال کی، جب ابا مر گئے۔ اماں بھائی کے گھر چلی گئیں۔ بہت تیز مزاج تھیں اماں۔ نانی نے ان کی شادی وہاں نہیں کی تھی جہاں وہ چاہتی تھیں بلکہ ابا سے کی تھی۔ ابا معمولی

نقوش کے حامل تھے۔ مگر اماں بہت خوبصورت تھیں۔ ایک تو حسن کا زعم، دوسرے ناکام محبت۔ پھر معمولی شکل وصورت کے ابا۔ پھر میں اَن چاہی اولاد۔ اوپر سے ابا کا انتقال ہوگیا۔ ہر چیز کی ذمہ دار میں بن گئی۔ اماں مجھ سے لاپرواتھیں۔ میں گھر میں اکلوتی چھوٹی بچی تھی، سب میرے نازنخروں میں لگے رہتے تھے۔ پھر اچانک ایک معمولی سی بیماری میں مبتلا ہوکر نانی مر گئیں۔ گھر میں صرف چار ماموں اور امی رہ گئیں۔ میں چھوٹے ماموں کے پاس سوتی تھی۔ وہ مجھے نہلاتے دھلاتے تھے۔ میں سات برس کی تھی وہ دس گیارہ برس کے۔ پھر انہوں نے مجھ سے کھیلنا شروع کر دیا۔ مجھے الجھن ہوتی تھی۔ کبھی وہ مجھ کو ڈانٹتے تھے، خبردار کچھ جو باجی سے کہا۔ گھر سے نکلوا دوں گا۔ اس گیارہ برس کے لڑکے سے میں بہت خوفزدہ ہوگئی۔ پھر ایک دن اماں نے دیکھ لیا۔ اماں نے ماموں کو کھینچ کر ایک طرف کیا اور مجھے لے کر کمرے میں آگئیں۔ پھر وہ مجھے اپنے پاس ہی سلانے لگیں۔

ایک دن اماں نے مجھے نہلایا، دھلایا اور بولیں ''روشنی اب تُو بچی نہیں رہی، مجھے زندگی گزارنی ہے۔ میں شادی کر رہی ہوں مگر وہ تجھے نہیں ساتھ رکھے گا۔ میں تجھے سکول میں داخل کرا دیتی ہوں۔ وہیں پڑھنا، وہیں رہنا۔''

''مگر اماں میں اکیلی کیسے رہوں گی؟'' میں نے ڈر کر پوچھا۔

''وہاں بہت ساری لڑکیاں لڑکے ہوں گے۔ ڈر کاہے کا؟'' اماں نے ناگواری سے کہا۔

''آپ ملنے آئیں گی مجھ سے؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' اماں نے پیار سے کہا۔ میں چپ ہوگئی۔

اماں نے مجھے جس اسکول میں داخل کرایا تھا وہ اسکول نہیں تھا بلکہ ایک یتیم خانہ تھا۔ یتیم خانے کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ یہ دن رات کتنے سفاک ہوتے ہیں میں بتا نہیں سکتی۔ یتیم خانے میں ایک خاتون آیا کرتی تھیں جب انہوں نے مجھے دیکھا تو بڑے پیار سے اپنے پاس بلایا اور میرے بدن کو چھونے لگیں۔

''اے نجمی صاحب یہ لڑکی تو بڑے گدرائے بدن کی ہے۔ قیامت ڈھائے گی۔''

''تو پھر آپ سرپرستی فرمائیں'' نجمی صاحب نے بڑے نخرے سے کہا۔ وہ یتیم خانے کے منتظم تھے۔

''مجھے دے دیں میں بیٹی بنالوں گی'' انہوں نے کہا۔

''ضرور ...... ضرور ...... ریشم میڈم!'' آپ یہ فارم سائن کردیں اور ان کو لے جائیں۔''

نجمی صاحب نے دراز سے ایک فارم نکالا ''ذرا ڈونیشن بھی عنایت کیجیے گا۔ یہ سب آپ لوگوں کی سرپرستی میں ہی چل رہا ہے۔'' انہوں نے بتیسی نکالتے ہوئے کہا۔

میڈم ریشم نے ایک موٹی سی گڈی روپوں کی نکال کر میز پر رکھی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔ ''روشنی چلو میرے گھر، تمہیں بہت آگے جانا ہے'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کا گھر شہر کے ایک معروف علاقے میں تھا۔ انتہائی خوبصورت، دلکش۔ مجھے وہاں علیحدہ کمرہ ملا۔ نئے ملبوسات، نئے جوتے۔ میری زندگی بدل گئی۔ میڈم ریشم نے مجھے ایک بہت اچھے انگریزی سکول میں داخل کرا دیا۔ زندگی کے شب وروز ایک نئی ڈگر پر چلنے لگے۔ میں آٹھویں میں تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ میڈم ریشم ماڈرن زمانے کی نائیکہ ہیں۔ ایک میں ہی نہیں کئی لڑکیاں ان کے زیرِ سایہ مستقبل کے تحفظ کے لیے پالی جا رہی تھیں۔''

روشنی سانس لینے کو تھمی۔ اس کا چہرہ اندرونی حدّت سے سرخ ہو رہا تھا۔

میں دم بخود اس کی داستان سن رہا تھا۔

''بہترین انگریزی۔ اٹھنے بیٹھنے کے آداب، مجلسی آداب، سلیقہ مندی کا اظہار، گفتگو کا قرینہ، مردوں سے مرعوب نا ہونے کی تعلیم ہمیں دی جاتی رہی۔ میں نے انٹر کرلیا تھا۔ جب ایک دن میڈم ریشم نے مجھے بلایا اور پاس بٹھا کر بولیں۔

''روشنی اب تم سمجھ دار اور جوان ہوگئی ہو۔ میں کیا کرتی ہوں یہ شاید تم سے پوشیدہ نہیں۔ میں جو کرتی ہوں اس میں کوئی زور زبردستی نہیں۔ اب تک میرے تم پر دس لاکھ روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ اگر تم میرے دھندے میں شامل ہونا چاہتی ہو تو تمہیں دو لاکھ روپے ماہانہ ملیں گے۔ اس کے بعد تمہیں ملنے والی تمام رقم میری ہوگی۔ اگر تم میرے دھندے میں شامل نہیں ہونا چاہتی تو پھر مجھے بیس لاکھ ادا کر دو اور میرے کسی ادارے میں ملازمت کرلو یا کہو گی تو میں تمہیں ملازمت دلوادوں گی۔''

''لیکن میڈم......'' میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے روک دیا۔ ''دیکھو روشنی میں وعدے، رونے دھونے، اخلاقیات پر لیکچر سننا نہیں چاہتی۔ میں زبردستی نہیں کرتی۔ سوچنے کا موقع دیتی ہوں۔ تم حسین ہو، دلکش ہو، اپنی اداؤں سے دنیا فتح کرلو۔ مردوں کی دنیا میں خود کو منوالو!''

پھر میں نے خود کو منوانے کا فیصلہ کیا۔ میڈم سے دو دن سوچنے کی مہلت مانگی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ میرے کلاس فیلوز بہت امیر گھرانوں کے تھے۔ ارب پتی لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کی اولاد کن منزلوں کی مسافر ہے۔ میں نے ان ہی لوگوں سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دوستوں سے فون پر بات کی تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کے خیالات میرے بارے میں کس قدر رنگین و سنگین تھے۔ ان میں سے ایک لڑکا بہت بے تاب تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ روشنی تم کہو تو چاند تارے بچھا دوں تمہارے قدموں میں۔ تم مجھے ایک بار ملنے کا موقع تو دو۔'' اس نے پہلی ہی ملاقات میں پانچ لاکھ روپے پیش کیے۔ بولا ''مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں کیا پسند ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی پسند سے کوئی تحفہ خرید لو!''

میں نے پیسے اپنے پرس میں رکھے اور اس سے کہا ''اگر تحفہ ہی دینا چاہتے ہو تو مجھے کرولا لے دو۔ مجھے بہت شوق ہے۔''

''اچھا۔ وہ مسکرایا۔ ''کل دس بجے تمہارے گھر آؤں گا۔''

میں نے سر ہلایا۔ وہ مجھے گھر ڈراپ کر کے چلا گیا۔

میں نے میڈم کو ساری صورت حال بتائی۔ اور کہا ''آپ نے مجھ سے بیس لاکھ کا کہا تھا لیکن میں آپ کو پچیس لاکھ دوں گی؟''

''کیوں؟'' انہوں نے ابرو چڑھا کے پوچھا۔

''اس لیے کہ جو تربیت، جو تعلیم میری ماں نے دینا تھی وہ آپ نے دی۔ میری ماں نے میرے سامنے کوئی چناؤ نہیں رکھا مگر آپ نے بہت کھلے دل سے مجھے فیصلے کی آزادی دی۔ میں آپ کی دل سے عزت کرتی ہوں۔ آپ نے مجھے زندگی کا سلیقہ دیا۔ میری روح، میری فطرت اس دھندے کو قبول نہیں کرتی۔ مجھے معاف کر دیجیے!'' میں ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

میڈم ریشم نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ ''تم بہت پیاری ہو۔ میں نے اپنی زندگی بہت مشکل سے گزاری ہے۔ میں اس دھندے سے بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اس لیے اس دھندے کو اصول دیے اپنی حد تک!''

میڈم ریشم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے پہلی بار انہیں روتا ہوا دیکھا تھا۔

دوسرے دن دس بجے اللہ ڈنو آگیا۔ وہ مجھے اپنی نئی گاڑی میں ایک بہت بڑے شوروم پر لے گیا جہاں پچاسوں نئی چم چماتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے

کرولا پسند کی۔ وہ ساڑھے چوبیس لاکھ کی تھی۔ اس نے میرے نام سے گاڑی خریدی اور میرا پتا دے کر کہا گاڑی اس پتے پر پہنچادی جائے۔

اس کے بعد ہم شوروم سے نکل آئے۔ اللہ ڈنو نے مجھ ایک شاندار لنچ کرایا اور مجھے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ اللہ ڈنو سندھ کے ایک بہت بڑے زمیندار اور سیاستدان کا بیٹا تھا۔ جاتے ہوئے وہ کہہ گیا تھا کہ اگلے ہفتے آؤں گا میرے کچھ دوست آئے ہیں، انہیں زمینوں پر لے کر جانا ہے شکار کریں گے پھر آئیں گے تمہارے پاس۔''

میں نے کار کے کاغذات اور چابی میڈم کے سپرد کردی۔ انہوں نے گاڑی کے کاغذات اور چابی لے لی اور مجھے پانچ لاکھ روپے واپس کردیے۔

''تم میرے پاس رہو روشنی'' میڈم نے کہا ''تمہارے اندر دنیا فتح کرنے کی صلاحیت ہے۔''

☆☆☆

وہ بول رہی تھی۔ میں مبہوت بیٹھا سن رہا تھا۔

''اب آپ ہی بتایئے میں آپ سے شادی کیسے کرسکتی ہوں۔ ؟ آپ مشہور باعزت فرد ہیں اس معاشرے کے اور میں ٹھہری شب تاریک کی مسافر۔ میرے ساتھ چلنے میں، پھرنے میں، رہنے میں آپ کی عزت میں فرق آجائے گا۔ آصف حسن!۔ جن سے محبت ہوتی ہے ان کو بدنام نہیں کیا جاسکتا اور نا ہی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔'' وہ دھیمے سے بولی۔ ''جگر کے کینسر کا بوجھ اٹھائے پھر رہی ہوں۔ ایک چھوٹا سا گھر اتا بنایا ہے۔ جس میں کچھ بچیاں رہتی ہیں۔ جن کا کوئی والی وارث نہیں۔ ان کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ اب میرے بعد وہ سب دیکھ بھال ڈاکٹر شکیب کریں گے۔ یہ سارا پیسہ میں نے اکٹھا کیا اس کو ان پر لگا دیا۔ اپنا گزارہ میں نے تنخواہ سے کیا۔''

''روشنی!'' میں نے کہا ''تم کیوں فکر کرتی ہو۔ تم ٹھیک ہوجاؤ گی!''

''کیوں بچوں کی طرح تسلیاں دیتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے پاس دو چار دن ہیں۔ آپ کو میوا شاہ قبرستان معلوم ہے۔'' اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولی ''وہاں بابا ذہین شاہ تاجی کا مزار ہے۔ اس مزار سے کچھ آگے ایک قبر کی جگہ ہے۔ اس پر سرخ رنگ کا سیمنٹ لگا ہوا ہے، وہی میری جگہ ہے۔ میں اپنی قبر خرید چکی ہوں۔''

''کیا ہو تم ؟''

''ایک مسلمان کو اپنی موت یاد رکھنی چاہیے اور اکیلے آدمی کو زندگی کا سامان بعد میں، موت کا سامان پہلے کرنا چاہیے۔'' وہ بولی۔ ''میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے بھی آپ سے محبت ہوگئی ہے۔ آپ کی محبت نے مجھے مار دیا۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے پھر رواں ہوگئے ''ذرا نرس کو بلا دیں۔''

میں نے نرس کو بلایا۔ اس نے نرس سے کہا۔ ''سسٹر ذرا مجھے پین کلر انجکشن دے دیں۔ میں کراہنا نہیں چاہتی!''

نرس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سائیڈ ٹیبل پر سے میڈیسن اٹھا کر سرنج بھر کر انجکشن لگا دیا۔

روشنی کے ماتھے پر پسینہ ابھر آیا۔

میں حیرت سے اس مضبوط لڑکی کو دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر میں اس کی حالت سنبھل گئی۔

''کچھ کھاؤ گی!؟'' میں نے پوچھا ''کیا لاؤں؟''

''کچھ نہیں۔ بس ذرا سا پانی پلا دیں'' اس نے بڑی نقاہت سے کہا۔ وہ مسلسل بولتے بولتے تھک گئی تھی۔ میں نے اسے پانی پلایا۔

''مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ کبھی میں آپ کے سامنے اس بے بسی سے پڑی ہوں گی!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کو میرے حالات جان کر مجھ سے نفرت ہو رہی ہوگی!'' اس نے مجھے دیکھا۔

''پہلے تم سے محبت تھی، اب تمہارے حالات جان کر عقیدت بھی ہوگئی ہے!'' میں نے کہا۔
اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ ''آپ سچ کہہ رہے ہیں!'' اس کی آواز میں بچوں کا سا اشتیاق جھلک آیا۔
''ہاں سچ!'' میں نے جواب دیا۔ ''محبت کی نہیں جاتی۔ ہو جاتی ہے۔ اس کے ہونے کی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ جب ہی محبت کو نامرادی تو ملتی ہے لیکن شکست نہیں ہوتی ہے۔''
''آپ کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔'' وہ ہنسی۔
اس لمحے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ موت کی دہلیز پر قدم رکھے کھڑی ہے۔
میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے پوچھوں کہ اس کے کوئی رشتہ دار ہیں یا نہیں۔ میڈم ریشم کے متعلق ہی پوچھ لوں۔ مگر میری ہمت نا پڑی کہ اس کو پھر ماضی کی یاد دلا کر تکلیف دوں۔
''اب کوئی نہیں ہے!'' وہ میری طرف دیکھ کر بولی ''میڈم ایک بم دھماکے میں موت کا شکار ہوگئیں۔ یوں ایک محبت کرنے والی شفیق خاتون سے محروم ہو گئی۔ پھر تنہائی راس آگئی۔''
''گھر کہاں ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔
''اب گھر کہاں۔'' وہ مسکرائی۔ فلیٹ تھا۔ بیچ کر پیسے بچیوں کے لیے محفوظ کر دیے۔ تھوڑے سے کفن دفن کے لیے ڈاکٹر شکیب کے پاس ہیں۔ یہیں سے مر کر جاؤں گی اور کہاں جانا ہے ہمیں!''
''مرنا تو نصیب ہے!'' میں نے کہا ''میرا بھی تمہارا بھی۔ لیکن اگر تم مجھے اتنی سی اجازت دے دو کہ میرے گھر چلو۔ میرے پاس رہو، جتنی بھی تمہاری سانسیں ہیں میرے ہمراہ گزریں۔ اتنی سی تو بات مان لو میری!'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا ''کیا اتنا حق بھی نہیں دے سکتی ہو؟''
''کیا اٹھائیں گے اتنی زحمت؟'' وہ بولی۔ ''اس دنیا میں مجھ جیسی نا جانے کتنی جانیں روزانہ دی جاتی ہوں گی۔ پھر ہر ایک آرزو، امید بھری ہوئی ہوگی لیکن سب کی پوری کہاں ہوتی ہیں۔ میں تو ویسے بھی ان چاہی اولاد تھی۔ پھر میرے لیے دنیا میں کیا ہونا تھا۔ یہ بھی بہت ہے جو مل گئی اور پھر سب سے قیمتی چیز آپ کی محبت لے کر جا رہی ہوں۔''
''تم بہت ضدی ہو۔ مگر میری یہ بات مان لو!'' میں نے کہا ''کم از کم میرا دل ہی رکھ لو۔''
''اچھا!'' وہ مسکرائی۔ ''آپ ایسا کریں پھر مجھے صبح گھر لے چلیے گا۔'' اس نے حامی بھر لی۔
''سچ کہہ رہی ہو نا؟'' میں نے پوچھا۔
''آپ سے کیا جھوٹ بولنا۔ گھر ہی تو جانا ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ کے ساتھ کوفی پیوں''
''میں ابھی لاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور تیزی سے اٹھ کر نیچے آیا۔ ہاسپٹل کی کینٹین سے میں نے دو کپ کوفی بنوائی اور اس کے پاس آگیا۔
نرس اسے سہارا دے کر بٹھا رہی تھی۔ میں نے ٹیبل آگے کی۔ اس پر کوفی کا ایک کپ اور کوکیز رکھے اور اس کے پاس ہی بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔
''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔
''تم نے بے وجہ کے اندیشوں میں مجھ سے دوری اختیار کی۔ محبت بہت ایثار کی قوت رکھتی ہے۔''
''محبت کو مشروط نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ مسکرائی ''جیسے دریا کی روانی، نسیم صبح، دلکش حسن فطرت، یہ سب غیر مشروط ہوتے ہیں۔'' وہ بولی۔
''تم سے بحث میں کوئی نہیں جیت سکتا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
اس نے چند گھونٹ کوفی لے کر کپ رکھ دیا۔ میں

نے اپنی کونی ختم کر لی۔ وہ مجھے دیکھتی رہی۔ پھر بولی ''آپ صبح آئیں گے نا۔ میں انتظار کروں گی۔ آپ کے ساتھ گھر جانے کا، تھک گئی ہوں۔'' اس کے انداز میں تھکے مسافر کا تاثر تھا۔

''میں صبح آؤں گا!'' میں نے اٹھ کر اس سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کے پوچھا۔ ''ایک بات کہوں؟''

''جی!''

''میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں تمہیں دل و روح سے پیار کرتا ہوں۔ غیر مشروط، یہ بات یاد رکھنا، اگر ہم یہاں نہیں ملے تو حشر میں ملیں گے۔''

''وعدہ۔'' وہ مسکرائی اور آہستگی سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

میں اسے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

☆☆☆

صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی میں ہاسپٹل پہنچ گیا۔ اس کے بیڈ پر نظر پڑتے ہی میں چکرا گیا۔ اس کا بیڈ خالی تھا۔ کل والی نرس بستر کی چادر ٹھیک کر رہی تھی۔

''روشنی کہاں ہے؟'' میں نے چیخ کر پوچھا۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

''آپ ڈاکٹر شکیب کے کمرے میں چلے جائیں۔'' نرس نے کہا۔

میں بھاگتا ہوا ڈاکٹر شکیب کے کمرے میں گیا۔ ڈاکٹر شکیب خاموش بیٹھے تھے۔ میں ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل سکا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر بولے

''آصف حسن صاحب رات تین بجے اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی نماز جنازہ ہاسپٹل کی مسجد میں ادا کی جائے گی اور یہیں سے جنازہ قبرستان پہنچایا جائے گا۔ بہت پُرسکون موت تھی اس کی۔ ڈھائی بجے طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور تین بجے وہ انتقال کر گئی۔ اس کی وصیت تھی کہ آپ کا انتظار کیا جائے اور آپ ہی اس کو قبر میں اتاریں۔ چلیں جنازہ تیار ہے۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔'' ڈاکٹر شکیب کا لہجہ بے حد سپاٹ تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کیا کیا، کیسے دفنایا گیا۔ بس یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سحر زدہ ہوں اور کسی روبوٹ کی طرح چل رہا ہوں۔

قبرستان سے واپسی پر ڈاکٹر شکیب نے مجھے ایک خط دیا۔ ''یہ روشنی نے آپ کے لیے دیا تھا۔''

میں نے گاڑی میں بیٹھ کر خط پڑھا۔ روشنی نے لکھا تھا:

''زندگی کی گہما گہمی سے دور جا رہی ہوں۔ موت وحیات حقیقت کے دو کنارے ہیں۔ کیا ہوا اگر ہم اس کنارے نہیں مل سکے، دوسرا کنارا تو ہمارا ہوگا۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ کیا تم یاد رکھو گے؟

روشنی۔

تمہارے ہونے کی منتظر!''

☆☆☆

''پاپا...... پاپا......'' میری بیٹی نے پیچھے سے آ کر میرے گلے میں باہیں حمائل کر دیں۔ ''دیکھ لیں میں فرسٹ آئی ہوں!''

''اچھا......!'' میں نے اسے پیار سے اپنے قریب کر لیا۔ ''میری روشنی بیٹی نے اپنی کلاس میں یقیناً ٹاپ کیا ہوگا؟'' میں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

اگر آپ میری بیٹی کو دیکھیں گے اور روشنی کے حلیے کے خدوخال کو یاد کریں گے تو آپ حیران ہو جائیں گے کہ میری بیٹی روشنی سے مکمل مماثلت رکھتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ظلم وتشدد، بے حسی کی تاریک دنیا میں روشنی کو مرنے نہیں دینا چاہیے۔

میں نے روشنی کو مرنے نہیں دیا۔ نا اِس کنارے پر...... نا دوسرے کنارے پر!

☆☆☆

افسانہ

بشریٰ سعید احمد

اتالیقِ اعظم

''ارے بھئی کون اڈاپٹڈ ہے؟'' بھیا نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہاری چھوٹی بہن۔'' اماں نے جل کر جواب دیا۔ دو دو بیٹیوں کی موجودگی میں تیسری اڈاپٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی، اگر کرنا ہی تھا تو ایک بیٹا اڈاپٹ کرلیتیں۔ بھیا نے ہنستے ہوئے کہا۔ میرا دماغ......

محبت سے گندھا، ایک حسّاس افسانہ

''اب اُٹھ بھی جاؤ لبنیٰ۔'' اماں نے تیسری بار آ کر میرا کمبل کھینچا تو وہ غصے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اُف اماں کیا ہے! چھٹی کے دن بھی نیند پوری نہیں کرنے دیتیں۔''

''چھٹی کا مطلب کیا آدھے دن تک سونا ہوتا ہے۔ چل اُٹھ شاباش نماز پڑھ لے، قضا ہوجائے گی۔'' اماں نے اُسے دوبارہ کمبل میں گھستے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''تو قضا پڑھ لوں گی۔'' اماں پلیز آج سو لینے دیں۔'' اس نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

''نا بچے فجر کے وقت فرشتے تمہارے حصے کا رزق لے کر آتے ہیں۔'' اماں نے پیار سے کہا۔

''تو پھر آپ بھیا سے کہیں وہ لے لیں میرے حصے کا رزق، ویسے بھی میرے حصے کا سارا رزق تو آپ بھیا کو ہی کھلاتی ہیں۔'' اُس کے جواب پر اماں کو غصہ آ گیا اور وہ اُس کا کمبل کھینچ کر تہہ کرتے ہوئے بولیں۔

''چل اُٹھ جا اب۔ صبح صبح فضول بکواس کر کے مجھے غصہ نہ دلا۔

اب اُٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''اب سونا مت، قرآن پاک پڑھو اور مجھے بھی چائے بنا دینا۔'' اماں نے اُسے جاء نماز تہہ کرتے دیکھ کر فوراً کہا۔ جیسے انہوں نے اُس کا دماغ پڑھ لیا ہو۔ اماں میں ضرور کوئی ایسی طاقت تھی جس سے وہ ہمیشہ اُس کا دماغ پڑھ لیتیں۔

''زرا لان میں بھی چکر لگا لینا شاید اخبار والا اخبار پھینک گیا ہو۔'' اماں نے سورۃ یٰسین اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ہماری طرح پورا ملک پاگل نہیں ہے جو صبح صبح ہی اُٹھ جائے۔ اخبار والا آٹھ بجے آتا ہے۔'' اُس نے بھی اپنا غصہ اخبار والے پر اُتارا اور تسبیح اُٹھا کر لان کی طرف نکل آئی۔

باہر زبردست نظارہ تھا۔ پو پھٹنی شروع ہوگئی تھی۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ اپنا الگ سماں پیش کر رہی

تھی۔ اُسے ایک پل کو شرمندگی سی محسوس ہوئی کہ خدا کی یہ ننھی سی مخلوق صبح صبح اُس کی حمد و ثناء شروع کردیتی ہے۔ اور ہم اشرف المخلوقات نرم گرم بستروں میں خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہتے ہیں۔

تھوڑی دیر تک وہ چہل قدمی کرتی رہی۔ پھر لان ہی میں پڑے ہوئے بڑے سے جھولے میں بیٹھ گئی اور درود شریف کی تسبیح کرنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے وہ ماحول سے بالکل غافل سی ہوگئی تھی کہ بابا کی آواز پر آنکھیں کھولیں۔

''سوگئی ہو یا کھوگئی ہو۔'' بابا نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اور اخبار دیکھنے لگے۔

''نہیں بابا سو نہیں رہی درود شریف پڑھ رہی تھی لیکن صبح صبح اتنی خاموشی، اتنا سکون ہے کہ مجھے اپنی زبان کے ساتھ ساتھ دل کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔'' اُس نے جواب دیا۔

''دیکھا صبح سویرے اُٹھنے کے فائدے، صحت تو اچھی ہوتی ہی ہے عبادت کا مزا بھی آتا ہے اور دل کو سکون بھی ملتا ہے۔'' بابا نے مسکرا کر اخبار اپنے سامنے کھول لیا۔

''لیکن بابا پورے ہفتے میں چھٹی کا ایک دن تو آتا ہے۔ اُس دن بندے کو روٹین سے ہٹ کر کچھ کرنا چاہیے۔'' اُس نے بابا کے پاس بیٹھ کر کہا۔

''کیوں کیا چھٹی کے دن قدرت اپنی روٹین سے ہٹ کر کچھ کرتی ہے۔ کیا سورج مغرب سے طلوع اور مشرق سے غروب ہوتا ہے۔ کیا تم کھانا پینا چھوڑ دیتی ہو، جو سونے جاگنے کے اوقات بدل جائیں۔'' بابا نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''جی بالکل ٹھیک، آپ کو تو اماں کا ہر کام ٹھیک ہی لگتا ہے۔ آپ کو پتا ہے نہ کہ انہوں نے ہی صبح سویرے اُٹھنے کی روٹین بنائی ہے، اس لیے آپ کو ٹھیک ہی لگے گا۔'' وہ منہ بسور کر بولی تھی۔

''میری بھولی بیٹی تمہاری ماں کا کام مجھے ٹھیک نہیں لگتا بلکہ وہ ہر کام ٹھیک کرتی ہیں۔'' ابا نے مسکرا کر بیٹی کے سر پر چپت لگائی۔

''اچھا تو پھر بھیا کو کیوں نہیں اٹھاتیں صبح صبح۔'' وہ جل کر بولی۔

''اسے کیوں اٹھائیں، وہ تو خود ہی میرے ساتھ اُٹھ کر نماز پڑھنے مسجد میں جاتا ہے۔ اور پھر مارننگ واک پر، دیکھو ہے اُس کی گاڑی۔'' بابا نے گیراج کی طرف اشارہ کیا جہاں سچ میں بھیا کی گاڑی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ میں شرمندہ ہوتی بولی۔

''چائے پیں گے آپ۔''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' بابا ہنستے ہوئے بولے۔

☆......☆......☆

وہ کچن میں آئی تو پورا بیسن گندے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُسے اپنی کوتاہی پر غصہ آیا۔ حالانکہ اماں نے رات بار بار کہا تھا کہ کچن صاف کرکے سونا مگر بھیا نئی مووی لے آئے۔ بس اُس کو دیکھنے کی جلدی میں وہ کچن گندا ہی چھوڑ گئی۔

''غصہ آرہا ہے نا اپنی کوتاہی پر۔'' اماں نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم رات میں کچن صاف کرکے سوتیں تو صبح اپنی کارکردگی پر فخر محسوس کرتی۔''

''اماں۔'' اُس نے بے بسی سے اماں کی طرف دیکھا۔

''لیکچر نہیں، صبح صبح تو بالکل بھی نہیں۔'' اُسے ایک دم سے بے بسی کا احساس ہونے لگا۔

''بے وقوف لڑکی ہمارے بڑوں کے یہ لیکچر ہی ہیں جو ہماری غلطیوں کی نشاندہی کرکے ہمیں

سنوارنے کا موقع دیتے ہیں۔ یاد رکھو ہمیں سمجھانے والے، نصیحت کرنے والے سدا نہیں رہتے۔ ایک وقت آتا ہے جب ہم اپنی غلطیوں سمیت تنہا رہ جاتے ہیں، تب ہاتھ ملنے اور آنکھیں ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔'' اماں نے تھوڑے سے غصے سے کہا تو اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اچھا! آج معاف کر دیں دوبارہ ایسا نہیں ہوگا، اب یہ بتائیں پہلے کیا کروں برتن دھوؤں یا ناشتا بناؤں۔'' اُس نے پوچھا۔

''تم برتن دھولو میں ناشتا بنالیتی ہوں۔'' اماں کو شاید اُس کی حالت پر رحم آ گیا۔

''اماں ایک بات پوچھوں۔'' اُس نے برتن دھوتے دھوتے اماں سے سوال کیا۔

''ہاں پوچھو۔'' اماں پراٹھے بیلتی ہوئی بولیں۔

''کیا آپ عظمیٰ باجی اور حمنہ باجی کے ساتھ بھی اتنا ہی ظلم کرتی تھیں؟'' اس نے دل کی بھڑاس نکالی۔

''تم پر میں کون سا ظلم کرتی ہوں؟ پہلے اِس بات کا جواب دو۔'' اماں اُس کا مطلب فوراً سمجھ گئیں۔

''اتنا تو ظلم کرتی ہیں آپ، صبح سویرے جگا دیتی ہیں۔ چھٹی والے دن بھی نیند پوری نہیں کرنے دیتیں۔ رات کو کچن صاف کرو، بابا اور بھائی کے کپڑے جیسے ہی سوکھیں فوراً استری کر کے الماری میں لٹکاؤ۔ بچپن سے آج تک آپ نے کبھی مجھے میری مرضی نہیں کرنے دی۔ یہاں تک کہ مجھے میری مرضی کی کبھی کوئی چیز تک نہیں لینے دی۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے آپ نے مجھے اڈاپٹ کیا ہے۔'' بات کرتے کرتے اپنی بے بسی پر اُسے خود ہی رونا آ گیا۔ اس کے آنسو دیکھ کر بجائے یہ کہ اماں دکھی ہوتیں وہ اور بھی غصے میں آ گئیں۔

''نیند چھٹی والے دن ہی کیوں روز پوری کرو۔ رات کو جلدی سو جاؤ تو صبح سویرے خود بخود آنکھ کھل جائے گی۔ نیند بھی پوری ہو جائے گی اور طبیعت بھی ٹھیک رہے گی۔ بابا اور بھائی کے کپڑے سوکھنے کے ساتھ ہی اس لیے استری کرواتی ہوں تا کہ دو تین گھنٹے کی محنت پورے ہفتے کا آرام دیتی ہے۔ پورا ہفتہ گھر کے مرد آرام سے اپنے دفتر جاتے ہیں اور خواتین کو بھی ہر روز کپڑے استری نہیں کرنے پڑتے۔ رات کو کچن اس لیے صاف کرواتی ہوں کہ ایک تو ساری رات برتنوں پر کاکروچ اور چھپکلیاں نہ پھریں۔ دوسرا صبح صبح صاف کچن دیکھ کر سکون اور اطمینان ہوتا ہے۔ باقی رہی اپنی مرضی کرنے کی بات تو تمہیں تو ابھی تک صحیح اور غلط کی پہچان تک نہیں ہوئی۔ سردیوں میں گرمیوں کے کپڑے نکال کر بیٹھ جاتی ہو اور گرمیوں میں سردیوں کے۔ مان لیا کہ محبت اندھی ہوتی ہے مگر اماں تو اندھی نہیں ہوتی کہ بچہ آگ مانگے تو ماں جلتا کوئلہ اس کے ہاتھ پر رکھ دے۔ یہ سب باتیں جو آج تمہیں مصیبت لگتی ہیں یہی سب آگے جا کر رحمت بن جائیں گی۔ میں یہ سب تمہارے بھلے کے لیے ہی کرتی ہوں، اگر پھر بھی تمہیں لگتا ہے کہ تم اڈاپٹڈ ہو تو یونہی سہی۔'' اماں نے اس کی بات کے جواب میں لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا۔

''ارے بھئی کون اڈاپٹڈ ہے؟'' بھیا نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری چھوٹی بہن۔'' اماں نے جل کر جواب دیا۔

''دو دو بیٹیوں کی موجودگی میں تیسری اڈاپٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی، اگر کرنا ہی تھا تو ایک بیٹا اڈاپٹ کر لیتیں۔'' بھیا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میرا دماغ نہیں خراب، اللہ کا شکر ہے اُس

نے جتنی اولاد دی۔ یہ تو اِس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ تم ناشتا کرو میں تمہارے بابا کو چائے دے کر آتی ہوں۔'' اماں غصے میں بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

''کیا ہوا ہڈحرام لڑکی۔'' بھیا نے اُس کا مذاق اُڑایا۔

''سارا دن تو کام کرتی ہوں بھیا، پھر بھی آپ سب خوش نہیں ہوتے، جب میں اپنے گھر چلی جاؤں گی تب یاد کرنا۔'' وہ اب باقاعدہ رونے لگی۔

''اپنے گھر! بے وقوف لڑکی یہ گھر کیا تمہارا اپنا نہیں ہے۔ بیٹی تو جہاں چلی جائے وہی گھر اُس کا ہوجاتا ہے۔ ماں باپ کے گھر پر تو زیادہ حق ہے۔ یہاں کام کرو گی تو تعریف اور محبت پاؤ گی اور سسرال میں تو اسے ڈیوٹی کہا جائے گا، اسٹوپڈ!'' بھیا نے پیار سے ڈانٹا تو وہ آنسو صاف کر کے بولی۔

''بس میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ بی اے کے پیپرز دے کر میں مکمل آرام کروں گی۔'' وہ فیصلہ کُن انداز میں بولی تھی۔

''مگر اماں تو کچھ اور سوچ کے بیٹھی ہیں۔'' بھیا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' وہ ایک دم گھبرائی۔

''نا بابا نا میں نہ بولوں گا، منہ نہ کھولوں گا۔ اماں کا راز اماں ہی بتائیں۔''

بھیا چائے کا کپ لے کر باہر بھاگ گئے اور اس کے اردگرد گھنٹیاں بلکہ خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس نے دل ہی میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنی زندگی کے اتنے بڑے معاملے میں اماں کو من مانی نہیں کرنے دے گی، جلد ہی دونوں باجیوں میں سے کسی ایک کو اپنا ہمراز بنالے گی۔ وہ من ہی من میں اپنی خالہ کے بیٹے جبران کو چاہنے لگی تھی۔ اگرچہ ابھی دونوں طرف اظہار نہیں ہوا تھا لیکن ایک دوسرے کی حالت سے دونوں آگاہ تھے۔

اپنے جیون ساتھی کے روپ میں صرف اور صرف جبران......

وہ فیصلہ کر کے فون لے کر اپنے کمرے میں آ گئی اور عظمیٰ باجی کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

☆......☆......☆

پھر اسی پریشانی اور اماں کی ڈانٹ کے دوران امتحانات آ کر گزرے اور ایک ہفتہ بعد ہی رات کو اماں وہ خطرناک موضوع لے کر آ گئیں جس کی گھنٹیاں کئی دنوں سے اُس کے دماغ میں بج رہی تھیں۔

''لبنیٰ تمہارے لیے دو پروپوزل آئے ہیں۔ ایک تو تمہاری خالہ کا بیٹا جبران اور دوسرا تمہارے بابا کے دوست انکل اسد کا بیٹا فرحان ہے۔ مجھے عظمیٰ نے بتایا تھا کہ تمہارا رجحان جبران کی طرف ہے جبکہ میرے خیال میں فرحان تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ میں دونوں کو اُن کے بچپن سے جانتی ہوں۔ جبران ضدی اور غصے کا تیز ہے۔ تمہارے جیسی حساس لڑکی کا گزارا اُس کے ساتھ مشکل ہوگا۔ جبکہ فرحان بہت نرم مزاج اور حساس لڑکا ہے۔ میرے خیال میں وہ تمہارے لیے اچھا جیون ساتھی ثابت ہوگا۔'' وہی ہوا جس کا ڈر تھا اماں نے یہاں بھی اپنی مرضی چلانا شروع کردی۔

''اماں یہ میری زندگی ہے کم از کم اس بار تو مجھے فیصلے کا حق دیں۔'' اُس نے مکمل بے بسی سے کہا۔

''زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق...... بے وقوف لڑکی تم نے ابھی زندگی کو ٹھیک طرح سے دیکھا ہی کب ہے، جو تم زندگی کی اونچ نیچ کو سمجھ سکو۔ کبھی کبھی جو دور سے دکھائی دیتا ہے ویسا ہوتا نہیں ہے۔ تم اتنی

سمجھدار ہوتیں تو میں کبھی اتنی پریشان نہ ہوتی۔'' اماں نے کہا تو وہ اماں کی سنگ دلی پر رونے لگی۔

''تو ٹھیک ہے میں پاگل ہوں بے وقوف ہوں، مجھے صحیح غلط کی پہچان نہیں ہے۔ تو آپ کا جو دل چاہتا ہے وہ کریں۔ ویسے بھی ساری زندگی میں نے کون سا اپنی مرضی کرلی ہے جواب کرلوں گی۔'' اُس نے تیز آواز میں رونا شروع کردیا۔ اُس کا خیال تھا اماں اُس کی حالت دیکھ کر شاید اُس کی بات مان لیں گی۔ مگر وہ تو اُلٹا اُسے ''شاباش'' دے کر چلی گئیں۔ اور وہ دو تین گھنٹے بیٹھی روتی رہی۔

☆......☆......☆

پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ جبران کی محبت کے مزار پر اُس نے فرحان کے نام کے شیش محل کی بنیاد رکھی۔ منگنی کی جگہ انہوں نے نکاح کیا کیونکہ فرحان امریکہ میں رہتا تھا۔ نکاح کے بعد ویزا لینا آسان ہوجاتا ہے۔ یوں شادی کے فوراً بعد اُس کا امریکہ جانا طے پاگیا۔

نکاح کے چھ ماہ بعد شادی طے پائی۔ شادی تک وہ مسلسل روتی رہی، اپنی بے بسی پر اور اتنی دور جانے کے خیال سے۔ لیکن اماں کو اُس کی پروا نہ تھی۔ وہ مہمانوں میں مگن تھیں۔ اب اُسے یقین ہوگیا تھا کہ اماں اُسے بالکل پیار نہیں کرتیں بلکہ ایک بوجھ سمجھتی ہیں۔

شادی سے ایک دن پہلے جب وہ صبح صبح فجر کی نماز پڑھ کر لان میں چہل قدمی کے لیے آئی تو اماں کو لیونگ روم میں جاء نماز پر بیٹھی بری طرح روتے ہوئے دیکھا۔ ایک پل کو اُس کا دل تڑپ اٹھا۔ لیکن دوسرے پل اُس نے سوچا کہ اماں اس لیے رو رہی ہیں کیونکہ شادی پر اتنا خرچہ ہوگیا یا شاید یہ سوچ کر رو رہی ہیں کہ اب کام کون کرے گا۔ اُس کے ہزار بار کہنے کے باوجود اماں نے کام والی نہ رکھی، صرف ایک صفائی والی کام کرجاتی باقی سارے کام وہ اور اماں مل کر کرتے تھے۔ اماں کہتی تھیں زندگی میں کبھی کبھی ایسے حالات بھی آتے ہیں جب ہم افورڈ کرنے کے باوجود ملازم نہیں رکھ پاتے۔ اس لیے ملازموں کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے۔ اُسے اماں کا

یہ فلسفہ کبھی بھی سمجھ نہ آیا کہ بھلا افورڈ کرنے کے باوجود ہم نوکر کیوں نہیں رکھ سکتے۔"

☆......☆......☆

روتے دھوتے وہ فرحان کے ساتھ پرائے دیس آ گئی۔

شادی سے پہلے جو آنسو شروع ہوئے تھے وہ شادی کے بعد کئی مہینوں تک نہ رُکے اب اِن کی وجہ بھیا، بابا، دونوں باجیاں اور کہیں کہیں اماں بھی تھیں۔ جبران تو کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

یہاں آ کر وہ پہلی بار اماں کے فیصلے سے متفق ہوئی۔ فرحان اماں کے اندازے سے بڑھ کر احساس اور محبت کرنے والے ثابت ہوئے۔ ہر چھوٹی چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتے اور ہر چھوٹی بات کو اہمیت دیتے۔

ایک سال میں، وہ فرحان کے تمام ملنے والوں میں اپنے سلیقے اور سُگھڑ پن کی وجہ سے مشہور ہو گئی۔ اصل میں ماں کی گود کو بچے کی پہلی درس گاہ اسی لیے کہا جاتا ہے کیونکہ ماں بچپن میں جو بات بچے کو سکھا دیتی ہے۔ وہ چاہے کسی چیز کا ذائقہ ہو یا کوئی عادت وہ کبھی نہیں بدلتی۔

روتے پیٹتے ہی سہی آخر کار صبح سویرے اُٹھنا اُس کی عادت بن گئی۔ بغیر کسی الارم کے وہ نماز کے ٹائم اُٹھ جاتی۔ رات کو کچن صاف کر کے سوتی، فرحان کے پورے ہفتے کے کپڑے ایک ہی دن استری کر کے رکھ دیتی۔

فرحان اکثر کہتا "یار تم تو جن ہو، قسم سے تھکا ہارا آتا ہوں تو اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی یوں لگتا ہے جیسے جنت میں آ گیا ہوں۔ تم تو میرے لیے خدا کی نعمت ہو۔"

پاکستان سے اُس کے ساس سُسر چند ماہ کے لیے آئے اور اُس کے سلیقے کے گرویدہ ہو گئے۔

جب بھی کسی نے اُس کے ہنر کی تعریف کی دل نے ہر بار اس سے کہا کہ یہ سب میری ماں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ لیکن دل کے کسی کونے میں یہ کسک بھی تھی کہ اماں اُس سے پیار نہیں کرتیں۔

پاکستان سے اماں کا فون بھی آتا تو وہ "ہوں" "ہاں" سے زیادہ بات نہ کرتی۔ فرحان کئی بار اِس بات پر اُسے ڈانٹتے بھی تو وہ ہمیشہ کہتی کہ اماں کو مجھ سے پیار نہیں ہے۔" وہ ہنستے اور کہتے۔

"لُبنیٰ تم بالکل پاگل ہو۔"

☆......☆......☆

ان ہی دنوں اُس کے اکلوتے بھائی کی شادی کا ہنگامہ جاگ اُٹھا۔ اِدھر وہ ایک نئی زندگی کو دنیا میں لانے کے آخری مراحل میں تھی۔

ایک دن اُس کی چھوٹی خالہ کی بیٹی افشاں کا فون آیا۔ افشاں اور وہ اچھی دوست تھیں اور پھر قسمت کی ستم گری کہ افشاں کی شادی جبران سے ہو گئی۔ وہ فون پر اپنی شادی کی سالگرہ اور فرحان کی بے تابیوں کا ذکر کر رہی تھی کہ اچانک افشاں نے کہا۔

"لُبنیٰ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں فرحان بھائی جیسا شوہر ملا۔ جبران تو بالکل بھی Loving نہیں ہیں۔ ذرا سی بات پر غصہ کرنے لگتے ہیں۔"

اُسے افشاں کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش صاف محسوس ہوئی اور اُس کے دل نے ایک بار پھر کہا۔ میری خوش قسمتی کا سارا اعزاز میری ماں کو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

چند دن بعد حسنہ باجی کا فون آیا۔ وہ بہت ناراض تھیں اور اماں پر غصہ ہو رہی تھیں جو ابھی تک بھائی کی شادی کی تاریخ طے نہیں کر رہی تھیں۔

باجی نے کہا۔" اماں نے صاف صاف کہہ دیا

ہے کہ جب تک لُبنیٰ خیر خیریت سے فارغ نہ ہوجائے تاریخ نہیں رکھی جائے گی۔'' باجی کی بات پروہ حیران ہوکر بولی۔

''باجی سچ میں اماں نے ایسے کہا۔''

''اور کیا، اماں کہتی ہیں تم لوگ تو بھائی کی شادی انجوائے کرو اور میری شہزادی پردیس میں اکیلی بیٹھی رہے۔'' باجی غصے سے بولیں۔

''یار مجھے لگتا ہے تُو سب سے زیادہ لاڈلی ہے اماں کی۔ پچھلے دنوں میں چند دن اماں کی طرف رہنے گئی۔ اماں بات بات پر تیری مثالیں دیتی تھیں، جیسے ہم تو بالکل جاہل گنوار ہیں۔'' باجی نا جانے اور کیا کیا بولتی رہیں اور وہ کہاں کھوگئی۔ اُس دن اُس کا دل بہت گھبرایا۔ ساری رات فرحان جاگتے رہے وہ بار بار کہتے تھے کہ تمہارا بلڈ پریشر بہت ہائی ہے۔ کس بات کی ٹینشن لی ہے تم نے؟''

☆......☆......☆

اگلے دن صبح جب فرحان اُسے ہاسپٹل لے جارہے تھے تو اماں کا فون آگیا۔ حالانکہ پاکستان میں اُس وقت رات تھی۔ اماں بہت پریشان تھیں۔ وہ بار بار میرا حال پوچھتی اور کہتیں۔

''لُبنیٰ تُو ٹھیک تو ہے، میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔'' اماں کی بے تابی دیکھ کر اُسے ایک دم سے رونا آگیا اور پھر اُسے یاد نہیں تھا کہ کب فرحان اُسے ہاسپٹل لے کر گئے اور موت سے لڑکر اُس نے ایک ننھی سی پری کو جنم دیا۔

نرس جب بچی اُس کی گود میں ڈال کر گئی تو اُسے دیکھ کر وہ زار زار رونے لگی۔

''ارے بھئی تم کیا جاہل عورتوں کی طرح بی ہیو کررہی ہو۔ اللہ کی رحمت آئی ہے ہنس کر استقبال کرو۔'' فرحان نا جانے کیا سمجھے۔ لیکن اُس کا دل ایسا بھرا کہ گھر آکر بھی آنسو نہ تھمے۔

چند دن تک فرحان اُس کی حالت دیکھتے رہے۔ ایک دن بولے۔

''یار اللہ نے بیٹی دی ہے تو بیٹا بھی دے گا۔ اِس میں رونے والی کیا بات ہے اچھا اگر تم رونا بند کردو تو میں تمہیں اچھا سا تحفہ دوں گا۔'' انہوں نے بچوں کی طرح اُسے بہلاتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے پاکستان کی ٹکٹ لادیں یہی تحفہ ہے میرے لیے۔'' اُس نے ہنس کر کہا۔

''اچھا تو پاکستان کی یاد میں آنسو بہائے جارہے تھے اور میں نا جانے کیا کیا سمجھ رہا تھا۔'' فرحان نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

اور پھر پورے دو سال بعد وہ ایک بار پھر اپنی سرزمین پر پہنچی۔

دور سے اماں کو دیکھ کر وہ اپنے آپ کو روک نہ پائی اور بے اختیار اُن کے سینے سے جالگی۔ اماں نے حیرت اور خوشی سے اُسے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں اُس نے فوراً کہا۔

''اماں کچھ مت کہیں صرف مجھے ڈانٹیں۔ میں آپ کی ڈانٹ سُننے کے لیے بے قرار تھی۔'' اُس نے روتے ہوئے کہا تو اماں نے بے اختیار اُس کا ماتھا چوما اور بولیں۔

''پگلی میں کیوں تمہیں ڈانٹوں۔ تم تو میری سب سے زیادہ سمجھ دار بیٹی ہو۔ جس طرح پردیس میں اکیلی گھر سنبھالتی ہو، شوہر اور بچے کا خیال رکھتی ہو۔ یہ کوئی آسان نہیں ہے۔''

اور وہ اماں کی بات سُن کر حیرت سے اُنہیں دیکھتی رہی اور سوچتی رہی واقعی ماں کی محبت سب سے نرالی ہے۔ اُس کی ڈانٹ بھی پیار، مار بھی پیار، اور پیار تو پیار ہے ہی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

شمیم فضل خالق

اندھیرے کے مسافر

لیکن میرا دل تو غم سے پھٹ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے یہ آخری اُمید تھی جو نا امیدی میں بدل گئی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کملا دیدی اور مسز عرفان مجھے سنبھالنے لگیں۔ وہ دونوں مجھے تسلیاں دے رہی تھیں۔ ''تم اتنی مایوس کیوں ہوتی ہو انعم، ہمیں دیکھو، ہماری شادی کو......

اندھیرے کے مسافر، کبھی کبھی ایک چمک سے روشن رستہ بھی پا لیتے ہیں

میں تھک کر چُور ہو چکی تھی۔ اب مجھ میں ایک قدم اٹھانے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ میں نے نڈھال ہو کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگالی تو سجاد نے تشویش سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''انعم! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا!'' میرے رُکنے کے ساتھ ہی ہمارا یہ چھوٹا سا قافلہ بھی رُک گیا۔ سب میرے اِرد گرد کھڑے ہو گئے۔ مسز عرفان نے مجھے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ عرفان بھائی نے جلدی سے کہا۔

''پانی پلا دو سجاد اِسے۔'' سجاد نے اپنی چھاگل سے مجھے پانی پلایا۔ پانی پینے سے میرے اندر توانائی سی آ گئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر سب کی پریشان صورتیں دیکھیں۔ کملا دیدی مجھ سے بڑی محبت سے پوچھ رہی تھیں۔

''انعم! کچھ کھاؤ گی؟''

''نہیں!'' میں نے انکار میں سر ہلایا تو راج بھائی وہیں زمین پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''چلو بھئی! یہاں تھوڑا سا ٹھہر جاتے ہیں، جگہ اچھی ہے تھوڑا سا ستا بھی لیں گے اور تب تک انعم بھاوج کی طبیعت بھی بہتر ہو جائے گی۔''

کسی نے اُن کی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ سب وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے۔ میری طبیعت اب خاصی بہتر ہو چکی تھی اور سب کے اصرار کرنے پر میٹھی روٹی کا ایک ٹکڑا بھی کھا لیا تھا، جس سے میری طبیعت مزید بہتر ہو گئی تھی۔ سجاد اِس دوران پریشانی سے مجھے دیکھتے رہے اور بار بار پوچھتے رہے کہ میں اب کیسا محسوس کر رہی ہوں۔''

میری طبیعت اب خاصی سنبھل گئی تھی سو ہم پھر سے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ہمارا یہ چھوٹا سا قافلہ چھ بندوں پر مشتمل تھا۔ میں اور سجاد، عرفان بھائی اور مسز عرفان اور ہندو جوڑا راج بھائی اور کملا دیدی...... ہم تینوں کی ایک ہی خواہش تھی، ایک ہی مقصد تھا اور اسی مقصد کے حصول کے لیے ہمارا یہ سفر تھا۔ اور ہم اِس سفر کے

دوران غیر اور اجنبی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے جیسے ایک دوسرے کے رشتے دار ہوں۔ یا پھر شاید رشتہ داروں سے بھی زیادہ قریبی رشتہ ہو۔ اور یہ اِس لیے تھا کہ ہمارے بیچ درد کا رشتہ تھا۔

ہم تینوں جوڑے اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ میری اور سجاد کی شادی کو پانچ سال ہونے کو آئے تھے، اِن پانچ سالوں میں کون سا علاج تھا جو ہم نے نہیں کیا تھا۔ در در گھومے تھے۔ کسی نے کوئی حکیم بتایا، کسی نے اچھی لیڈی ڈاکٹر کا نام لیا، یا کسی ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا بتایا۔ ہم وہاں پہنچ جاتے۔ سجاد اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ باپ اُس کا چند سال پہلے وفات پا چکا تھا۔ اُس کی ماں کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی اولاد کی خوشخبری سُنے۔ لیکن ہر ماہ کوئی خوشخبری دیے بنا گزر جاتا۔ ہر ماہ میری ساس کا رونا دھونا اور بھوک ہڑتال جاری رہتی۔ وہ دو چار دن کچھ نہ کھاتی، بس روتی رہتی اور واویلا کرتی رہتی، مجھ پر بھی ہر ماہ شدید قسم کا ڈپریشن طاری ہو جاتا۔ سجاد منہ پھلائے اُداس اُداس سے پھرتے رہتے۔ غرض گھر پر ایسا سوگ طاری ہوتا جیسے کسی کی موت واقع ہو گئی ہو۔

سجاد کو کسی نے آفس میں بتایا تھا کہ فلاں جگہ پر ایک پیر صاحب ہیں جو بے اولاد جوڑوں کے لیے دعا کرتے ہیں اور اُن کا یہ ریکارڈ ہے کہ آج تک انہوں نے جس کے لیے بھی دعا کی ہے وہ بامراد ہوا ہے۔ دس دس اور بیس بیس سالوں کے بے اولاد جوڑوں کو خدا نے اولاد سے نوازا ہے۔'' سجاد گھر آئے تو بہت پُرجوش ہو رہے تھے، چھوٹتے ہی انہوں نے مجھے ساری بات بتائی۔

''سجاد!'' میں جذبات کی شدت سے تھرتھراتی آواز میں بولی۔ ''مجھے ابھی لے چلو وہاں۔'' سجاد سنجیدگی سے کہنے لگے۔

''وہاں جانا آسان نہیں ہے انعم۔'' میں نے حیرت سے اُنہیں دیکھا۔

''کیا مطلب؟ آسان نہیں ہے...... پر

کیوں؟''

''وہ بہت اونچی پہاڑی ہے۔ جس پر انہوں نے اپنا جھونپڑا بنا رکھا ہے۔ اُس پہاڑی پر چڑھنا ایک مشکل ترین کام ہے اور اُن کی ایک شرط بھی ہے۔''

''شرط! کیسی شرط؟''

''یہی کہ میاں بیوی دونوں کو آنا ہوگا۔ اگر ایسی شرط نہ ہوتی تو شاید مرد کے لیے وہاں جانا اِتنا مشکل نہ ہوتا۔ لیکن...... خواتین نہیں چڑھ سکیں گی وہاں۔ میرے آفس میں موجود کئی لوگوں نے یہ بات کی ہے۔''

''سجاد پلیز!'' میں اُن کو جھنجوڑتے ہوئے بے تابی سے بولی۔ ''میں ہر قسم کی مشکلات سے نپٹنے کو تیار ہوں۔ تم نہیں جانتے ہر ماہ میں جس کرب سے گزرتی ہوں۔ اور مجھے چھوڑیں...... اماں جس کرب سے گزرتی ہیں۔ اُس کا اندازہ تو ہے آپ کو۔ پھر آپ کیوں کہتے ہیں کہ میں اس سلسلے میں کوئی کمزوری دکھاؤں گی۔ بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ آپ کل سے آفس سے چھٹی لیں۔ اور وہاں کا پورا ایڈریس لے لیں۔''

سجاد کو تو خود بھی اولاد کی بے انتہا خواہش تھی۔ اُس نے کبھی مجھے کسی حکیم، کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے انکار نہیں کیا تھا۔ لہٰذا تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

سجاد مجھے بار بار کہتا رہا کہ سفر بے حد کٹھن ہے، راستہ بہت دشوار ہے۔ وہاں کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ساتھ سارا انتظام کر کے جانا ہوگا۔''

خیر ہم نے اپنے ساتھ پانی کی چھاگلیں رکھ لیں، کچھ سوکھی خوراک جس میں میٹھی روٹیاں، سُوکھے میوے کی گریاں اور بسکٹ کے ڈبے تھے۔

میں بڑی پُر جوش ہو رہی تھی اور مجھے قطعاً پروا نہ تھی کہ راستہ کٹھن ہوگا۔

دو بسیں بدل کر ہم مطلوبہ جگہ پر پہنچے۔ وہ خاصی سنسان جگہ تھی۔ وہاں سے سارے دن میں ایک ہی بس گزرتی تھی۔ اُس بس میں ہماری ملاقات عرفان بھائی اور مسز عرفان سے ہوئی۔ راج بھائی اور کملا دیدی بھی اُسی بس سے جا رہے تھے۔ راستہ لمبا تھا، ہم نے ایک دوسرے سے بات چیت شروع کی تو ہم پر یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ ہمارا اور اُن دونوں جوڑوں کا مقصد بھی ایک ہے اور منزل بھی۔ راج بھائی اور کملا دیدی انڈیا سے آئے تھے۔ اُن کی شادی کو گیارہ سال ہو چکے تھے اور اُن کی اولاد نہیں تھی۔ وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کا کہنا تھا کہ وہ پیر صاحب کی شہرت سن کر آئے ہیں۔ عرفان بھائی اور مسز عرفان لاہور کے کسی مضافاتی علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کی شادی کو نو سال ہو چکے تھے اور وہ ہنوز بے اولاد تھے۔ وہ بھی پیر صاحب کی شہرت سُن کر آئے تھے۔ ہم تینوں جوڑے اِس بات پر بے حد خوش تھے کہ اِس کٹھن سفر میں ہم سب کو ایک دوسرے کا ساتھ نصیب ہوگا۔

☆......☆......☆

خدا کا نام لے کر ہم نے یہ سفر شروع کیا۔ یہ ایک تنگ راستہ تھا جس کے ایک طرف کھائی تھی اور دوسری طرف درخت تھے۔ سارا راستہ چڑھائی والا تھا اور ہمارے اندازے سے زیادہ کٹھن راستہ تھا۔ میں اور سجاد تینوں جوڑوں میں سب سے کم عمر تھے۔ لیکن میں سمجھ رہی تھی کہ کملا دیدی اور مسز عرفان دونوں مجھ سے زیادہ چُست تھیں۔ میں اکثر اُن سے پیچھے رہ جاتی۔ مرد ہم سے تھوڑے آگے جا رہے تھے۔ راج بھائی بہت ہنس مکھ اور باتونی تھے۔ انہوں نے سجاد اور عرفان بھائی کو باتوں میں اُلجھا رکھا تھا۔

مسئلہ یہ ہے

اِس نفسانفسی کے دور میں جب ہر شخص مسائل میں اُلجھا ہوا ہے۔ جائز کام کے لیے بھی ناجائز ذرائع استعمال کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسے میں شریف النفس انسان سوائے بے بسی کے ہاتھ ملنے کے کچھ نہیں کر پاتا...... اس تکلیف دہ صورتِ حال سے بچنے کے لیے اپنا مسئلہ سچی کہانیاں کے مشہور و معروف سلسلے ''مسئلہ یہ ہے'' میں تحریر کر ڈالیے اور قرآن اور حدیث کی روشنی میں اپنے مسئلے کا حل پائیے۔
آپ اپنا مسئلہ اِس پتے پر ارسال کر دیجیے۔

C II-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے: 021-35893121-35893122

جبکہ میرا تھکن سے بُرا حال تھا۔ مجھے کملا دیدی اور مسز عرفان کی باتوں میں کوئی مزہ نہیں آ رہا تھا۔ میں بس اپنے لیے دعا کر رہی تھی کہ خدا مجھے منزل تک ساتھ خیریت کے لے جائے۔ لیکن تھوڑی دور آگے جانے کے بعد مجھے چکر آنے لگے۔ میری آنکھوں کے آگے ترمرے سے ناچنے لگے۔ مجھے اب ایک قدم اٹھانا بھی محال لگ رہا تھا اور قریب تھا کہ میں پورے قد سے آن گرتی کہ اچانک کملا دیدی کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے چیخ مار کر سب کو متوجہ کیا اور مجھے کسی چھوٹے بچے کی طرح اپنی بانہوں میں تھام لیا۔ ایک بار پھر سب میری وجہ سے ٹینشن میں آ گئے تھے۔ سجاد بے حد پریشان تھے۔ جانے کے عمل میں پھر سے تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سب دوسری بار میری وجہ سے رُک گئے تھے۔ میں اپنی طبیعت کو جتنا سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اتنی زیادہ بگڑ رہی تھی۔ کملا دیدی میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلا رہی تھیں اور مسز عرفان مجھے پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے ساری فضا گول گول گھوم رہی ہو اور میں نے جو تھوڑا بہت کھایا تھا وہ بھی باہر آنے کو بے قرار تھا گویا کہ کچھ اور اندر جاتا۔ سب منتظر تھے کہ میری طبیعت ٹھیک ہو تو وہ اپنے سفر کو جاری رکھ سکیں۔ لیکن میری طبیعت تو کسی طرح سنبھل نہیں رہی تھی۔ آخر کار سجاد نے اُن سے کہا۔

''آپ لوگ جائیے، میں تھوڑی دیر اِس کے ساتھ ٹھہر جاتا ہوں۔ اِس کی طبیعت بہتر ہو گی تو ہم بھی آ جائیں گے۔'' انہوں نے کچھ آنا کانی کی لیکن سجاد نے انہیں جانے کے لیے مجبور کیا۔ وہ دونوں جوڑے مجھے کچھ ہدایات دیتے ہوئے چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد سجاد کبھی مجھے پانی پلانے کی کوشش کرتے کبھی میٹھی روٹی کا ٹکڑا کھانے کا مشورہ دیتے۔ کچھ دیر بعد میری طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ میں ایک درخت کے موٹے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ سجاد مجھ سے کہنے لگا۔

''انعم! اگر تمہاری طبیعت سنبھل گئی ہو تو چلیں؟''

''نہیں سجاد!'' میں کمزور آواز میں بولی۔ ''مجھ میں ایک قدم چلنے کی بھی ہمت نہیں...... لیکن تم ضرور چلے جاؤ۔ میں یہیں بیٹھ کر تم لوگوں کا انتظار کروں گی۔''

''کیا کہہ رہی ہو۔'' وہ قدرے تیز آواز میں

بولا۔ ''اِس ویرانے میں تمہیں بیمار چھوڑ کر میں چلا جاؤں؟ پاگل تو نہیں ہوئی ہو۔''

''سجاد!'' میں روہانسی آواز میں بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ ہم کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔ اب اگر میں نہیں جاسکتی تو کم سے کم تم تو چلے جاؤ نا۔''

''انعم ...... تم جانتی ہو کہ پیر صاحب کی شرط یہی ہے کہ میاں بیوی دونوں کو آنا ہوگا۔ اب میرا اکیلے جانا ویسے بھی بیکار ہے۔''

''نہیں!'' میں نڈھال سی ہو کر بولی۔ ''تم انہیں بتادو گے کہ تم گھر سے بیوی کو لائے ہو لیکن اُس کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے۔ ویسے بھی وہ اللہ والے ہیں۔ بات سمجھ جائیں گے۔''

''لیکن انعم!'' وہ تشویش سے بولے۔ ''میں اِس طرح تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں۔ جانے اب بھی وہ جگہ کتنی دور ہوگی۔''

''میں اب بہت بہتر ہوں۔'' میں نے اپنی آواز میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ جگہ اتنی سنسان بھی نہیں۔'' میں نے درختوں کے بیچ میں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکے کو بکریوں کا ریوڑ چراتے دیکھ کر اُس کی طرف اشارہ کیا۔

''دیکھو تو اُس بچے کو۔ وہ اِسی طرف آرہا ہے۔''

سجاد نے کوئی جواب نہیں دیا تب تک وہ لڑکا ہمارے نزدیک آچکا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، پاؤں میں ٹوٹے سے چپل تھے اور کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ سجاد نے اُس سے چند باتیں کیں اور پھر اُس سے کہا۔

''بیٹے! یہ میری بیوی ہے، اِس کی طبیعت خراب ہے۔ میں پیر صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں لیکن یہ نہیں جاسکتی۔ کیا تب تک تم اِس کے پاس بیٹھ سکتے ہو؟''

''ہاں ...... ہاں چاچا! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ یہاں کچھ بھی غلط نہیں ہوتا۔ ہمارے بہت نیچے وادی میں گھر ہیں۔ میں ہر روز بکریاں یہاں لے کر آتا ہوں۔ میں اِن کا خیال رکھوں گا۔'' وہ لڑکا اپنی عمر سے زیادہ سمجھداری سے بات کررہا تھا۔ سجاد کو تھوڑا اطمینان ہوگیا لیکن وہ پھر بھی جانے میں متذبذب تھا لیکن میں اُس کو ایسا تاثر دینے لگی جیسے میری طبیعت اب کافی بہتر ہوگئی ہو۔ سو ایک طرح سے میں نے انہیں زبردستی بھیج دیا۔ میری طبیعت ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی لیکن خود کو سنبھال کر میں اُس بچے سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ میں حد درجہ اُداس اور مایوس ہورہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ کیسے خدا نے مجھے منزل کے قریب لاکر بیمار کردیا۔ شاید اس لیے کہ میری قسمت میں اولاد کا سکھ نہیں ہے۔ منفی خیالات مجھے اور زیادہ ڈپریشن میں مبتلا کررہے تھے۔ میں نے اُس بچے کو میٹھی روٹیاں اور سوکھا میوہ دیا۔ وہ مزے سے کھا رہا تھا اور اپنے علاقے کی باتیں کررہا تھا جسے میں کچھ سُن رہی تھی کچھ نہیں سن رہی تھی۔ مجھے اماں کا بھی خیال آرہا تھا کہ اگر انہیں معلوم پڑ گیا کہ میں پیر صاحب کے پاس نہیں جاسکی تو اُن کی مایوسی اور دُکھ سے کیا حال ہوگا۔ کافی دیر ہوگئی میری کچھ سوتی جاگتی کیفیت تھی جب میں نے سُنا وہ چرواہا کہہ رہا تھا۔

''باجی! شاید آپ کے لوگ آگئے ہیں۔''

میں فوراً الرٹ ہوکر بیٹھ گئی اور آنے والے راستے پر نظریں جمادیں تو دور سے وہ سب آرہے تھے۔ لڑکا کوئی مقامی نغمہ گاتا ہوا اپنی بکریوں کی طرف چلا گیا۔ اتنے میں وہ قریب آگئے۔ راج بھائی اور کملا دیدی آگے آگے تھے۔ اُن کے پیچھے عرفان بھائی اور مسز عرفان تھے۔ اِن سب سے پیچھے نظریں جھکائے سجاد آرہا تھا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ سجاد کے چہرے پر ایسا کچھ تھا جس نے مجھے

سہلا دیا جبکہ کملا دیدی اور مسز عرفان کے چہرے کھلے کھلے سے نظر آرہے تھے۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' کملا دیدی اور مسز عرفان وہیں زمین پر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ تب تک سجاد بھی قریب آچکا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں بے قراری سے بولی۔

''لیکن پیر صاحب نے کیا کہا؟ آپ سب نے انہیں میرے متعلق تو بتا دیا تھا نا کہ میں بیماری کے باعث اُن کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکی۔'' میری بات پر وہ چپ ہوگئیں۔ مجھے اُن کی خاموشی دہلائے دے رہی تھی۔ میں نے چیخ کر اُن سے پوچھا۔

''آپ سب پلیز...... پلیز مجھے بتائیں کہ وہاں کیا ہوا۔ سجاد! تم بتاؤ۔'' سجاد کا سر ویسے ہی جھکا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر بھی اُس نے کچھ نہیں بتایا جبکہ کملا دیدی میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے بولیں۔

''ہم سب نے انہیں کہہ دیا کہ سجاد کی بیگم آئی ہیں لیکن طبیعت کی بے انتہا خرابی کی وجہ سے آپ تک نہ پہنچ سکیں۔ لیکن وہ اپنی بات پر اڑ گئے کہ میری تو شرط ہی یہ ہے کہ میاں بیوی دعا کے لیے ایک ساتھ آئیں۔''

''تو...... تو کیا...... پیر صاحب نے......'' میری آواز ڈوبنے لگی۔

''ہاں!'' کملا دیدی نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔

''پیر صاحب نے ہمارے بہت اصرار کے باوجود سجاد کے لیے دعا نہیں مانگی۔''

''لیکن......'' راج بھائی جلدی سے بولے۔ ''تم لوگ پھر یہاں آسکتے ہو۔ جب تمہاری طبیعت سنبھل جائے گی بھابی تو دونوں آجانا۔ تم لوگ تو اِسی ملک میں ہو۔''

''ہاں!'' سجاد نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ہم پھر آجائیں گے انعم!''

لیکن میرا دل تو غم سے پھٹ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے یہ آخری اُمید تھی جو ناامیدی میں بدل گئی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کملا دیدی اور مسز عرفان مجھے سنبھالنے لگیں۔ وہ دونوں مجھے تسلیاں دے رہی تھیں۔

''تم اتنی مایوس کیوں ہوتی ہو انعم، ہمیں دیکھو، ہماری شادی کو کتنے سارے سال ہوگئے ہیں۔ اور ہماری ایج بھی تم سے کتنی زیادہ ہے۔ پھر بھی ہم مایوس نہیں ہیں۔ تم تو ابھی بہت چھوٹی ہو۔ تمہارے پاس تو بہت ٹائم ہے۔''

سجاد دُکھ بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اپنے رونے کو کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔ کس جوش و خروش سے آئے تھے ہم...... اور اب...... مجھے لگ رہا تھا جیسے سب ختم ہوگیا ہو۔ سجاد راج بھائی اور عرفان بھائی سے کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ جائیں۔ اِس کی طبیعت بہتر ہوتی ہے تو ہم بھی آتے ہیں۔ لیکن پلیز، آپ جائیں۔'' ایک طرح سے سجاد نے انہیں زبردستی رخصت کیا۔ وہ مجھے ڈھیروں تسلیاں دے گئیں۔ بار بار مجھے گلے لگایا۔ اُن کے جانے کے بعد بھی میرا رونا اُسی رفتار سے جاری تھا۔ سجاد مجھے بہلا رہا تھا۔

''انعم...... پلیز...... ایک تو پہلے سے بیمار ہو۔ اِس طرح رو رو کر اپنے آپ کو اور بیمار کر ڈالو گی۔ میں نے کہہ دیا نا...... ہم پھر آئیں گے۔'' کافی دیر رونے کے بعد سجاد نے مجھے پانی پلایا اور کہنے لگے۔

''بلندی پر چڑھنے کی نسبت اترائی میں جانا آسان ہوتا ہے۔ تم ہمت کرو، میں تمہیں سہارا دوں گا۔ جہاں تمہاری طبیعت خراب ہونے لگے گی، وہاں بیٹھ جائیں گے۔ لیکن ہمیں یہاں سے جانا

ہوگا۔'' میں اُس کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ آنسو اب بھی میری آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے تھے اور مجھے اپنا دل پاتال میں گرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سجاد کی بانہوں کا سہارا لیتے ہوئے اور اترائی میں اترتے ہوئے شدت سے میرا دل چاہا کہ کاش میں لڑھکتی ہوئی نیچے، بہت نیچے چلی جاؤں اور زندگی کی قید سے آزاد ہو جاؤں۔ میرا نہ گھر جانے کو دل چاہ رہا تھا اور نہ میں اماں کا سامنا کرنا چاہ رہی تھی۔ میرا تو بس مرنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن...... مجھے ایسی زندگی کا سامنا کرنا تھا جو موت سے بدتر ہونی تھی۔

☆......☆......☆

گھر جا کر اور اماں کو سلام کر کے میں اپنے کمرے میں گھس گئی۔ میں نے اُن کے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ سجاد نے انہیں کچھ بتایا یا نہیں، مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ میں تو اندھیرے کمرے میں بیڈ پر گر گئی۔ مجھے تو ہر چیز بُری لگ رہی تھی۔ حتیٰ کہ اپنا آپ بھی برا لگ رہا تھا۔

اور اِسی طرح پورے دو دن میں نے روتے اور سوتے گزار لیے۔ تیسرے دن سجاد نے مجھے زبردستی اٹھایا۔

''سجاد پلیز! مجھ سے نہیں اٹھا جا رہا۔ مجھے وومیٹنگ ہو رہی ہے۔'' میں اٹھتے اٹھتے پھر سے بیٹھ گئی اور بے بسی سے بولی۔

''ہاں...... اِس لیے تو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔''

''نہیں!'' میں کسلمندی سے بولی۔

''میں ڈاکٹر کے پاس نہیں جا سکتی میرے جسم میں طاقت نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی تو جسم میں طاقت آئے گی نا۔ شاباش! جلدی کرو۔ ہری اپ۔''

سجاد کے محبت بھرے اصرار کے سامنے میں زیادہ دیر ٹھہر نہ سکی اور کچھ سوتی جاگتی کیفیت میں سجاد کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر تبسم سجاد کی دور پار کی رشتہ دار لگتی تھیں۔ اُن کا کلینک ہمارے گھر کے قریب تھا۔ ہم لوگ چھوٹی بڑی بیماریوں کے لیے اُن ہی کے پاس جاتے تھے۔ بچے کے لیے بھی اُنہوں نے میرا بہت علاج کیا تھا اور پھر خود ہی مجھے ایک اور مشہور لیڈی ڈاکٹر کے پاس ریفر کیا تھا۔ اُس کے بعد ایک اور، پھر ایک اور...... یہ سلسلہ تو جانے کب تک جاری رہنا تھا۔ میرے منہ سے ایک دبی دبی آہ نکل گئی۔ ڈاکٹر تبسم کے کلینک میں خاصا رش تھا لیکن اُس نے جلد ہی مجھے بلا لیا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑیں۔

''ارے بھابی! آپ کے چہرے سے لگ رہا ہے کہ آپ بہت بیمار ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟''

میں نے کمزور آواز میں اپنی بیماری کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ پیر صاحب کے ہاں جانے کا قصہ انہیں میں نے نہیں بتایا بس بیماری کے متعلق ہی ساری بات ہوتی رہی۔ وہ غور سے سنتی رہیں۔ بیچ بیچ میں وہ مجھ سے کوئی بات پوچھ بھی لیتیں۔ پھر انہوں نے میرا معائنہ کیا۔ ایک ٹیسٹ بھی کرایا۔ میں نے اُن کے چہرے پر دبا دبا سا جوش دیکھا۔

''آپ پریگنٹ ہیں بھابی!''

''کک...... کیا؟'' میں بھونچکا سا اُن کا منہ تکنے لگی۔

''ٹھہریے! میں ایک بار پھر آپ کا ٹیسٹ کراتی ہوں۔'' اُنہوں نے ایک نئے طرز کی مشین سے دوبارہ میرا ٹیسٹ کرایا۔ اب کے وہ پورے یقین سے کہنے لگیں۔

''آپ پریگنٹ ہیں۔ ٹیسٹ دوبار پازیٹو آیا

ہے۔ کسی شبے کی گنجائش نہیں۔''

''ڈاکٹر تبسم! نہیں...... ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''
میں بے یقینی سے دھک دھک کرتا دل لیے اُس سے پوچھنے لگی۔ وہ ہنس کر بولی تھیں۔

''مگر یہ ہو چکا بھابی! مبارک ہو آپ کو۔''
اتنے میں ڈاکٹر تبسم نے سجاد کو بھی بلا لیا۔

''سجاد بھائی! مبارک ہو۔ آپ باپ بننے والے ہیں۔''

''کیا؟'' سجاد کی چیخ بڑی زوردار اور بے ساختہ تھی۔ میرے اندر تو زبردست قسم کا شور برپا تھا۔ مجھے تو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اچانک یہ کیا ہو گیا تھا۔ کیسے میں ڈوبتے ڈوبتے ساحل سے آ لگی تھی۔ کیسے میں مرتے مرتے زندہ ہو گئی تھی۔

''سجاد!'' میں رو کر اُس کے سینے سے لگ کر بولی۔

''کیسے ہو گیا یہ سب۔'' میرا سارا جسم بید مجنوں کی مانند کانپ رہا تھا۔

''یہ خدا نے کیا ہے...... اولاد خدا کی دین ہوتی ہے جانم!'' سجاد میرا کانپتا کپکپاتا جسم اپنے بازوؤں میں سنبھالتے ہوئے بولا۔ ہم بھول گئے تھے کہ ہمارے علاوہ یہاں ڈاکٹر تبسم بھی کھڑی ہیں۔ جو بڑی خوشی سے ہمارا یہ پاگل پن دیکھ رہی تھیں۔ سجاد کو خیال آیا تو وہ رُندھی اور شرمندہ آواز میں کہنے لگا۔

''ڈاکٹر تبسم! سوری...... وہ...... دراصل ہم دونوں جذباتی ہو گئے تھے۔'' ڈاکٹر تبسم ہنس پڑیں اور کہنے لگیں۔

''خالہ جان کو میری طرف سے مبارکباد کہیے گا۔ میں خود بھی کسی دن اُن کو مبارکباد کہنے کے لیے آؤں گی۔'' پھر انہوں نے مجھے کچھ دوائیاں لکھ کر دیں اور بہت ساری احتیاطی تدابیر بتائیں۔

ہم دونوں جب ڈاکٹر تبسم کے کلینک سے باہر آئے تو ہمارے دل خوشیوں سے مالا مال تھے اور ہمیں یقین نہیں آرہا تھا کہ خدا نے ہم کو زندگی کی سب سے انمول خوشی دے دی ہے۔

☆......☆......☆

عفان سال بھر کا ہونے کو آیا تھا۔ پی سی میں لون ایگزیبیشن تھی۔ مجھے لون کے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ میں اور سجاد ننھے عفان کو لے کر پی سی چلے گئے۔ وہاں ایک ہال میں لون کے مختلف اسٹال لگے تھے۔ لہراتے ہوئے رنگین کپڑے عجب بہار دکھا رہے تھے۔ عورتوں کا خاصا رش تھا ہر اسٹال پر، جبکہ مرد بچوں کو گود میں لیے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے

میں پطرس بخاری ہوں

مشہور معروف مزاح نگار پطرس بخاری انگریز گورنر سے ملنے گئے۔ گورنر کی خاتون سیکریٹری نے ان سے پوچھا۔

''کیا کرتے ہیں۔''

''ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو ہوں۔''

''پہلے کبھی گورنر سے ملے ہو؟''

''جی نہیں۔''

''ٹھیک ہے کل آئیں'' سیکریٹری نے کہا۔

پطرس بخاری اگلے روز گئے تو پھر ان سے وہی سوالات پوچھے گئے اور جواب ملا ''کل آئیں۔''

پطرس بخاری پھر اگلے روز گورنر سے ملنے پہنچے۔ خاتون نے ابھی کچھ پوچھا نہیں تھا کہ پطرس بخاری نے سبق سنانے کے انداز میں بولنا شروع کر دیا۔ ''میرا نام پطرس بخاری ہے۔'' ڈائریکٹر جنرل آل ریڈیو ہوں، پہلے کبھی گورنر سے نہیں ملا...... میں کل آؤں گا۔'' یہ کہہ کر پطرس باہر نکل گئے۔

(مرسلہ: ارسلان، کراچی)

تھے۔ سجاد کو کوئی دوست مل گیا تو وہ اُس سے باتوں میں لگ گئے۔ میں عفان کو گود میں لیے ایک اسٹال سے دوسرے اسٹال تک جارہی تھی لیکن رش اتنا زیادہ تھا کہ میں صحیح طرح سے کچھ دیکھ نہیں پارہی تھی۔

''کتنا پیارا بچہ ہے آپ کا۔'' کسی خاتون نے عفان کو پیار کرتے ہوئے مسکرا کر مجھے کہا۔

''جی...... شکریہ!'' میں نے اُن کی طرف دیکھا اور شدت سے چونک پڑی۔ وہ مسز عرفان تھیں۔ وہ بھی غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

'' مسز عرفان آپ؟'' میں خوشی اور حیرت سے بولی۔

''ارے انعم! یہ تم ہی ہونا؟''

ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں اور کپڑوں کے اسٹال سے الگ ہوکر ہم ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں۔ بات دعا سلام اور خیر خیریت سے آگے بڑھی تو وہ تجسس آمیز لہجے میں بولی۔

''انعم...... یہ بچہ؟'' اُن کی آنکھوں میں اُلجھن تیر رہی تھی۔

'' میرا ہے مسز عرفان! میرا اور سجاد کا۔'' میں نے عفان کو خود سے لپٹاتے ہوئے کہا۔

'' لیکن......'' وہ کچھ بولتے بولتے رُک گئیں اور بات بدل کر بولیں۔

''کیا تم اور سجاد دوبارہ پیر صاحب کے پاس دعا کرانے گئے تھے۔ جبکہ پہلی بار تو پیر صاحب نے دعا نہیں کی تھی۔''

''نہیں مسز عرفان! بلکہ جب میں راستے میں بیمار پڑگئی تھی اور پیر صاحب کے پاس نہیں جاسکی تھی تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ میں پریگنٹ تھی لیکن تب مجھے اِس بات کا علم نہ تھا۔''

''اچھا!'' وہ حیران رہ گئیں۔

'' مسز عرفان...... وہ آپ ...... میرا مطلب ہے، پیر صاحب کی دعا سے...... کچھ افاقہ ہوا؟'' میں نے جھجک کر، رُک رُک کر اُن سے پوچھا۔

'' نہیں۔'' وہ مایوسی سے سر ہلا کر غمزدہ آواز میں بولیں۔

'' کچھ نہیں ہوا، ابھی تک بے اولاد ہیں۔ اب تو اُمید بھی ختم ہوگئی ہے۔'' اُن کے چہرے پر کرب بکھرا ہوا تھا۔

'' مسز عرفان! ہمیں جو کچھ مانگنا ہے وہ صرف اپنے رب سے مانگنا چاہیے۔ اُس کے علاوہ اور کوئی نہیں جو ہماری حاجت روائی کرسکے اور اللہ خود کہتا ہے کہ تم مجھ سے مانگو میں تمہیں عطا کروں گا۔ اِس کے باوجود ہم پیروں، فقیروں کے پاس جاتے ہیں۔ اور مسز عرفان۔'' میں نے محبت سے اُن کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا نرم دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔'' اگر ہماری دعا قبول ہونے میں تاخیر ہوجائے تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ خود فرماتا ہے کہ تم مجھ سے مایوس نہ ہو۔''

مسز عرفان نے ڈبڈبائی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا کر میری تائید کی۔ میری نظروں کے سامنے کملا دیدی اور مسز عرفان کے خوشی سے دمکتے وہ چہرے آگئے جب وہ دونوں پیر صاحب سے واپس ہوئیں اور میرے پاس آگئیں۔ اُن دونوں کے چہرے اُمید کی روشنی سے منور ہورہے تھے کیونکہ پیر صاحب نے اِن دونوں کے لیے دعا کی تھی جبکہ مجھے اپنی دعا سے محروم رکھا تھا۔

؟؟ میرے رب مجھے معاف کردینا۔'' میں نے ہزار بار کی مانگی معافی ایک بار پھر سے مانگ لی اور مسز عرفان کو سجاد سے ملانے کے لیے اُس طرف بڑھ گئی جہاں سجاد کھڑے تھے۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

اُمِ مریم

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

''بہت زعم سے اٹھ کر آئی تھیں یہاں تم۔ یہ کیئر ہے تمہاری...... آج کھل گیا مجھ پہ۔'' وہ سرد آواز میں جنلا کر کہہ رہا تھا۔ سارہ جانتی تھی اسے اپنی خجالت بھی تو مٹانا تھی۔ بُرا ماننے والی بہر حال اس میں کوئی بات نہیں تھی۔ ''ایک بے بس لاچار بچہ...... یوں اکیلا اتنے بڑے لان میں......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا گیارہواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن و رحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر
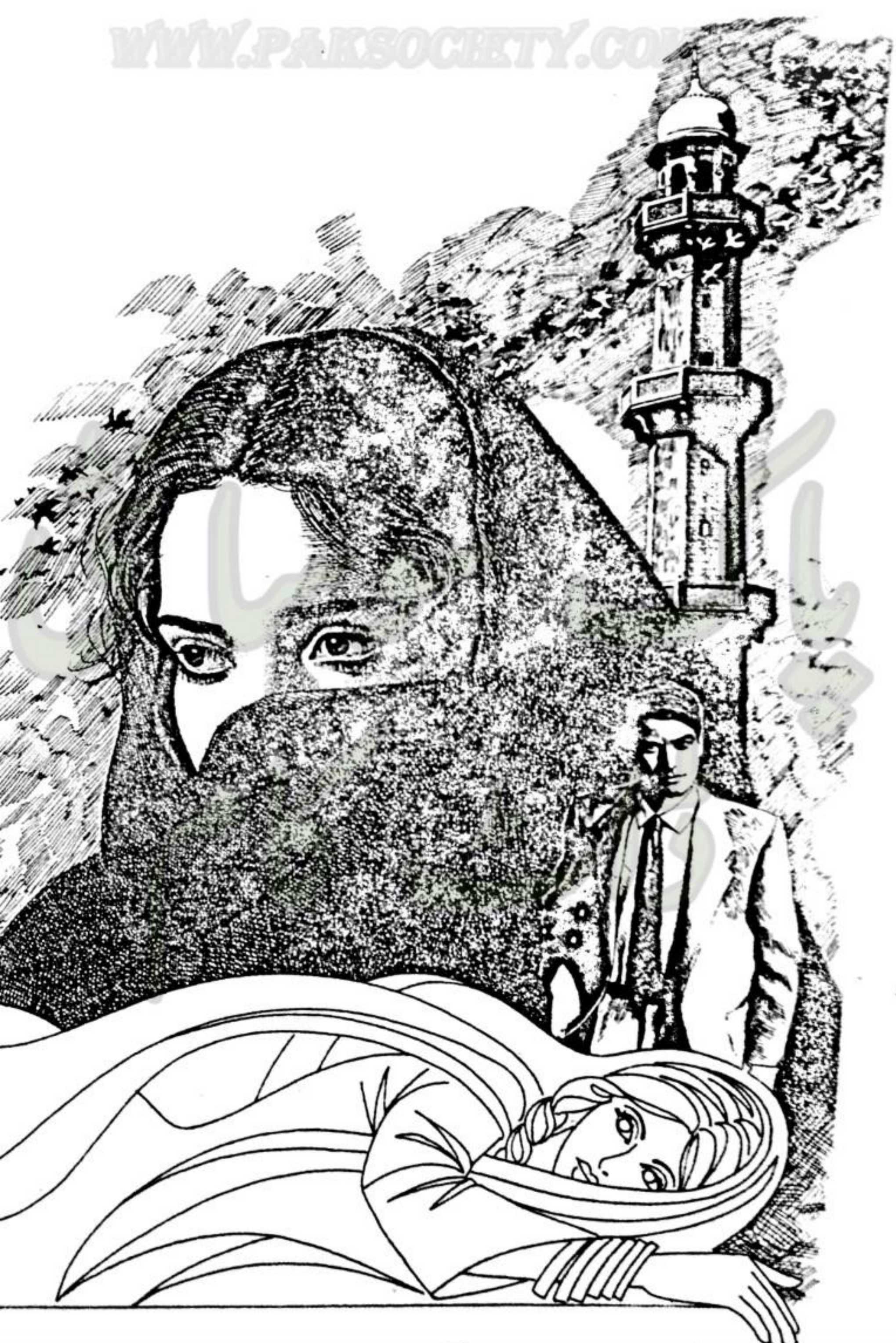
اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہری نہیں حاکیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا ممی کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں مبتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ ممی اس کی حالت پر ہراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ ممی جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس سطحی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں مبتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دُعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیر تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عمیر ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تارِ عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کمی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ عمیر کو حالات اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُس کی شرافت دیکھ کر مؤذن صاحب اُسے اپنی پُر شفقت پناہ میں لے کر اُس کی ذمے داری قبول کر لیتے ہیں۔ اُم جان اور بابا جان حج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی سے مؤذن صاحب بہت متاثر تھے، وہ اُس سے اپنی اِس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے قابلِ بھروسہ جان کر عمیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔ عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں اُن کا یہ فیصلہ قبول کر کے عمیر سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی اچانک ہوتا ہے کہ وہ لاریب سے اِس بارے میں کوئی ذکر تو کُجا مشورہ بھی نہیں کر پاتا۔ عمیر کو لے کر عبدالغنی گھر آ جاتا ہے۔ لاریب کے لیے یہ سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اُسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اِس لیے لاریب کو سمجھانا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔ علیزے، عبدالہادی کے ساتھ اُس کی مام سے ملنے اُن کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔ جب عبدالہادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔ عبدالہادی کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ کیونکہ اُس کی ماں......

(اب آپ آگے پڑھیے)

''**وعلیکم** السلام! خدا عمر دراز کرے۔ نصیب نیک ہو۔'' ممی نے جذب سے کہتے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔ عبدالغنی نے ان سے عبدالعلی کو لے لیا۔ جو باپ کو دیکھ کر مچل گیا تھا۔

''بابا جانی اپنے گھر چلیں۔'' عبدالعلی کی وہی رٹ تھی۔

''چلیں گے بیٹے!'' عبدالغنی نے اسے چوما تھا۔ پھر لاریب کو دیکھا۔ جس کے تاثرات میں ہنوز تلخی تھی۔ وہ اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

''آپ بیٹھو بیٹے! میں چائے بھجواتی ہوں۔'' ممی نے کہا تھا اور عبدالعلی کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

''آؤ بیٹے! میں چاکلیٹ دوں آپ کو۔'' وہ نہیں چاہتی تھیں لاریب کی بدتمیزی کا مظاہرہ عبدالعلی بھی دیکھے۔ انہیں صاف لگتا تھا لاریب الجھے گی لازمی عبدالغنی سے۔ عبدالعلی جیسے بے دلی سے ان کے ہمراہ گیا تھا۔

''کیسی ہو لاریب؟'' عبدالغنی نے ازخود اسے مخاطب کیا تھا۔ لہجے میں وہی نرمی اور رچاؤ تھا۔ جو ہمیشہ اس کے لیے مخصوص رہا تھا۔ مگر لاریب کو اس کی وفاؤں سے لے کر محبتوں پر بھی ہمیشہ کا شک لاحق ہو گیا تھا۔

''عبدالعلی یاد کرتا تھا آپ کو۔'' اس کا انداز جتلاتا ہوا تھا۔ گویا وہ کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہو۔ عبدالغنی کو اس کے بچگانہ انداز پہ ہنسی آئی تھی۔

''اور عبدالعلی کی ماں......؟ وہ بھی تو یاد کرتی ہوگی مجھے لازماً۔'' عبدالعلی نے فاصلہ گھٹایا اور قریب آ کر اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے روٹھی روٹھی مگر بے حد پیاری لڑکی کو خود سے قریب کر لیا۔ لاریب کا دل جیسے اس قربت کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکا۔ ایسا برجستہ التفات تو گزرے وقتوں کی سب سے حسین یاد تھی۔ وہ اس سحرناک لمحے کے زیرِ اثر آ گئی۔ بے خودی کیف۔ اس نے نم پلکیں بھینچتے ہوئے عبدالغنی کے چوڑے سینے سے سر ٹکا کر طمانیت سے گہرا سانس بھرا تھا۔ اسے کب بھولا تھا کہ اس نے اس شخص سے جنونی عشق کیا تھا۔ پتا نہیں عبدالغنی نے اُس کی اِس طرح آزمائش کیوں کی۔

''اپنے گھر چلو لاریب۔'' عبدالغنی نے جھک کر اس کے سر پر بوسہ لیا تھا۔

''آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں عبدالغنی؟'' وہ یونہی اس کے ساتھ لگی ہوئی بولی۔

''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے لاریب؟'' عبدالغنی نے اسے اپنے بازوؤں کی سخت گرفت میں بھینچا۔

''تو پھر اس عورت کو گھر سے نکال دیں عبدالغنی! دل سے نکال دیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہی اس صورت آسکتا ہے کہ آپ محبت کرتے ہیں مجھ سے۔'' وہ سراٹھا کر بولی تھی۔ عبدالغنی کے چہرے پر تغیر چھا گیا۔

''یہ کیسی فضول ضد ہے بھلا؟''

''جو مرضی سمجھیں۔'' وہ کاندھے اچکا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ایک بار پھر وہ وہی ضدی لاریب تھی۔ عبدالغنی کے چہرے سے بے بسی چھلکنے لگی۔ اضطراب چھانے لگا۔

''میں ایسا نہیں کرسکتا ہوں لاریب!''

''تو پھر محبت کے دعویدار کیوں بنتے ہیں۔ ہٹ جائیں پیچھے اس بات سے۔'' وہ چیخی۔ ساتھ ہی آنسو بھی آنکھوں میں اتر آئے۔

''آپ میری جان لے لیتے عبدالغنی! میں ذرا بھی بدگمان نہ ہوتی، ذرا بھی احتجاج نہ کرتی۔ آپ اس طرح میرا کلیجہ تو نہ نوچتے۔ میں کبھی اس بات پہ مطمئن نہیں ہوسکتی کہ آپ کی سچی محبت مجھے حاصل ہوئی تھی۔ محبت تو ہر دن کے ساتھ اعادہ چاہتی ہے۔ اور سورج نہ چڑھے تو دن نہیں ہوتا۔ جس روز محبت کا سورج نہ چڑھے، رات رہتی ہے۔ یہ دل اور جسم بڑے بیری ہیں ایک دوسرے کے۔ جسم روندا جائے تو یہ دل کو بسنے نہیں دیتا اور دل ناشاد ہو تو یہ جسم کو عذاب میں مبتلا رکھتا ہے۔ عبدالغنی میری پور پور میں حشر برپا ہے، میں عالمِ برزخ میں ہوں۔ ذرا سوچیں...... میں بے وفائی کی مرتکب ہوں آپ سے تو کیسے کانٹوں پہ گھسٹے گا آپ کا دل، آپ کا وجود...... میں ایسی ہی جاں کنی کے عالم میں ہوں۔ رحم کردیں مجھ پہ۔''

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر فریادی انداز میں کہہ رہی تھی، عبدالغنی نے نگاہ کا زاویہ بدل لیا۔ عجیب پگھلا دینے والی صورتحال تھی۔ لاریب وہ تھی جس نے ہمیشہ اسے دیا تھا۔ محبت، بے تحاشا خدمت، ایثار، وفاداری، سعادت مندی، فرمانبرداری، کبھی کوئی گلہ نہ شکایت، ہمیشہ راضی بارضا۔ وہ ہمیشہ سے خواہش مند تھا۔ کبھی وہ فرمائش کرے اس سے کچھ۔ کیسا ستم تھا۔ اس نے فرمائش بھی کی تھی، التجا بھی، گزارش بھی، فریاد بھی۔ مگر جو مانگا تھا۔ وہ اتنا بھاری بوجھ تھا۔ جسے وہ اٹھانے سے قاصر تھا۔

''میرے ساتھ چلو۔ ایک دو دن میں اُم جان اور بابا جان آنے والے ہیں۔ میں چاہتا ہوں ان کے آنے سے پہلے تم اپنے گھر میں ہو۔''

لاریب کی آنکھیں دکھ اور رنج سے جیسے پتھرا کر رہ گئیں۔ اسے لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ ضبط کی انتہا ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ ٹوٹی ہوئی شاخوں کی مانند اس کے پہلوؤں میں گر گئے۔

''آپ نے میری بات نہیں مانی! مطلب آپ کو یہ منظور نہیں۔ یہ ہوس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے عبدالغنی! افسوس آپ بھی عام انسان نکلے۔ یاد رکھیے...... ہوس کا کوئی انجام، کوئی اختتام نہیں۔ یہ ایک ایسا ندیدہ بچہ ہے۔ جس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ یہ ایسا کتا ہے جو کھاتا چلا جاتا ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے شکم میں کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ہمیشہ گندگی سے شروع ہوکر ذلت پر ختم ہوتی ہے۔ عبدالغنی مجھے آپ کے اصل کو دیکھ کر دکھ ہوا۔ مجھے آپ کے انجام سے خوف آرہا ہے۔'' وہ جیسے آپے میں نہیں رہی تھی۔ الفاظ سخت تھے۔ انداز کڑا۔ پھر دکھ کی شدت کم کیسے رہتی۔ عبدالغنی کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا۔ مگر ضبط کمال درجے کا تھا۔ حوصلہ اور اعلیٰ ظرفی بے مثال۔ وہ خود کو سنبھال کر نرمی سے حوصلے سے مسکرا دیا تھا۔

''تم بہت غصے میں ہو۔ مجھے افسوس ہے۔ میں تمہیں عظیم دکھ سے ہمکنار کرچکا ہوں۔ لاریب ہوسکے تو معاف کردینا مجھے۔ اور ایک بات پہ غور بھی ضرور کرنا۔ رشتے خون کے نہیں، احساس کے ہوتے ہیں۔ اگر احساس ہو تو اجنبی بھی اپنے ہوسکتے ہیں۔ اگر

احساس نہ ہوتو اپنے بھی بیگانے۔'' لاریب کی آنکھیں چھلک کراس کے رخساروں کو نمناک کرنے لگیں۔

''آپ نے ٹھیک کہا عبدالغنی! آپ مجھے عظیم دکھ سے ہمکنار کر چکے۔ حالانکہ آپ سے ہی یہ توقع نہیں رکھتی تھی میں۔ چلیں جائیں یہاں سے...... میں شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی اب آپ کی۔'' رخ پھیر کر وہ باقاعدہ ہچکیوں سے رونے لگی، عبدالغنی بہت ہارا ہارا مضمحل ساوہاں سے لوٹا تھا۔

☆............☆............

مسکراہٹ ادھار دینا مجھے
کچھ ستارے خریدنا ہیں مجھے
ایک آنسو کا مول کیا لو گے؟
آج سارے خریدنا ہیں مجھے
سر خوشی میں جو بیچ آیا تھا
غم وہ سارے خریدنا ہیں مجھے
ڈگمگاتی ہے زندگی عاطف
کچھ سہارے خریدنا ہیں مجھے

اس نے نماز پڑھی تھی اور سر بھاری محسوس کرتی تلاوت کیے بغیر بستر پہ دراز ہوگئی۔ طبیعت بہت بوجھل تھی۔ دل بھرایا ہوا۔ عبدالہادی کا رویہ اسے بہت متفکر اور دکھی کرتا تھا۔ عبدالغنی جیسا بندہ اگر شادی کرسکتا تھا دوسری تو عبدالہادی...... وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

'کہاں ہوگا بھلا اس وقت؟...... اور وہ لزا......؟'

خون اس کی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ جب کسی طور قرار نہ آیا تو شال اوڑھتی، چپل پہن کر کمرے سے باہر آگئی۔ اب تو اسے بھی کسی حد تک گھر کی لوکیشن کی سمجھ آگئی تھی۔ اس کا رخ عبدالہادی کے کمرے کی جانب تھا۔ اطمینان کرنا ضروری تھا۔

''یہ جو محبت ہوتی ہے ناں! یہ بھی قیامت کی طرح ایک دم ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس طرح کہ جیسے پتھر...... نہ تو خود سے کہیں زیادہ عزیز لوگ یاد رہتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ رشتے جو ہماری خوشیوں پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ یاد رہ جاتا ہے تو بس...... حواسوں پہ چھا جانے والا اک شخص۔''

وہ ٹھٹک کر تھم گئی تھی۔ قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ہال کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ ہیٹر آن تھا اور وہ بالکل سامنے ہاتھ میں کوفی کا فل سائز مگ لیے بیٹھی تھی۔ اس کے مقابل عبدالہادی کے علاوہ کون ہوسکتا تھا۔ علیزے کی جان لمحے کے ہزارویں حصے میں جل کر خاکستر ہوگئی تھی۔

عشق کے سمندر کا کوئی کنارا نہیں ہوتا۔ اس میں ڈوب کر ابھرنا مشکل ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ جو ڈوب جائے وہی اپنی ذات کو دریافت کرسکتا ہے۔ علیزے نپے تلے قدموں سے چلتی قریب آگئی۔ اس کی سرد نظریں عبدالہادی پہ تھیں۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی پین کلر ہے تو مجھے دے دیجیے اور عبدالہادی...... آپ کو پتا ہے میں بہت دیر تک نہیں جاگا کرتی۔ اور اتنی دیر تک مجھے نیند بھی نہیں آتی جب تک بیڈ روم کا دروازہ لوکڈ نہ ہو۔ حیرت ہے۔ آپ یہ بات کیسے بھول گئے۔ معذرت خاتون......! آپ سے صبح میٹنگ ہوگی۔ اِف یُو ڈونٹ مائنڈ پلیز۔''

ایک ایک لفظ چبا کر ادا کرتے۔ پہلے اس کا مخاطب عبدالہادی تھا۔ پھر لزا۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پہ ٹپٹائے ہوئے نظر آئے، گڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ایکسکیوز می۔'' عبدالہادی نے لزا سے نگاہ ملائے بغیر کہا اور اٹھ کر علیزے کے قریب آ گیا۔

''معذرت خواہ ہوں، آپ کو زحمت ہوئی۔ مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ آپ میرا انتظار کررہی تھیں۔'' اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال کر زبردستی خود سے قریب کرتا ہوا وہ سرگوشی سے مشابہہ آواز میں بولا۔ علیزے اس کی بے حجابی پہ جز بز تو کیا ہوتی، ششدر ہو کر رہ گئی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ چھوڑیں۔'' اگلے لمحے وہ جیسے مچل کر فاصلے پر ہوئی۔

''یار اگر آپ بیوی بن کر آئی ہیں تو شوہر سمجھیں بھی مجھے۔'' وہ جیسے بسورا تھا اور پھر زبردستی اسے خود سے قریب کیا۔ علیزے کی جان پہ بن آئی تھی۔ اس نے گھبرا کر گردن موڑی۔ لزا وہیں کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ شرمندگی اور حیا کے احساس سے جل اٹھی۔

''وہ یہیں ہے۔ دیکھ رہی ہے۔ کچھ تو شرم کریں۔'' اس کے بازو پہ اپنے ناخن چبھوتے ہوئے اس نے بے حد غصے میں کہا تھا۔ عبدالہادی نے گہرا سانس بھرا۔

''میں نے پہلے بھی بتایا تھا۔ وہ بہت براڈ مائنڈڈ ہے۔ پھر ہم تو واقعی میاں بیوی ہیں۔'' عبدالہادی نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ مگر بات کرنے کا انداز جتلاتا ہوا تھا۔ علیزے نے سر جھٹک دیا۔

''منع کیا تھا آپ کو۔ اس کے ساتھ نظر نہ آئیں مگر......''

''مجھے اس وقت بہت مزا آتا ہے۔ جب آپ کو اس کی وجہ سے جلتے دیکھتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو اتنے حسین لمحے میرے نصیب میں کیسے آئیں۔'' اس کی آنکھوں میں اتنی شوخی، اتنے رنگ تھے کہ علیزے بے اختیار نظریں چرا گئی۔

''ٹیبلٹ دیں مجھے۔ تاکہ جاؤں۔''

باتوں کے دوران وہ اس کے کمرے تک آ گئی تھی۔ احساس ہوتے ہی منہ بنا کر بولی۔

''جو بات وہاں کہی اسے بھول گئیں آپ......؟''

عبدالہادی نے آنکھیں پھیلائیں۔ علیزے اس معنی خیز سوال پہ جیسے شرم سے کٹ کر رہ گئی تھی۔

''فضول نہیں بولو۔ اب اس پہ ضروری نہیں تھا یہ بھید کھولنا کہ ہم......''

''تو پھر یہیں سو جائیں۔ ورنہ یہ بھید کھل جائے گا۔'' عبدالہادی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ علیزے پوری جان سے لرز گئی تھی۔ اس نے سرعت سے ہاتھ کھینچا تھا۔

''میں آپ کی رضا کے بغیر بھی فاصلے نہیں گھٹاؤں گا۔ مگر یہاں قیام مناسب ہے۔'' عبدالہادی نے اس کی لانبی لرزتی پلکوں پہ نگاہ جما کر کہا تھا۔ علیزے نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کا چہرہ دہک رہا تھا۔ عبدالہادی سنجیدگی سے منتظر تھا۔

''بظاہر تو بہت مذہبی شو کرتے ہیں خود کو۔ یہ یاد نہیں رہتا کہ مرد اور عورت کی تنہائی کے بیچ تیسرا شیطان ہوا کرتا ہے؟ عبدالہادی میں دوبارہ کبھی آپ کو اس لڑکی کے ساتھ نہ دیکھوں۔ وہ بھی رات کے وقت۔'' بستر کے کنارے ٹکتے ہوئے وہ بے حد متمنی انداز میں کہہ رہی تھی۔

''جو حکم مادام! ویسے یار اگر اتنا اعتماد کر لیا ہے تو پلیز...... بیڈ پہ بھی لیٹنے دو مجھے۔ آئی سویئر...... مجھ سے صوفے پہ نہیں سویا جاتا۔'' سنجیدگی سے بات کرتا وہ پھر پٹڑی چھوڑ گیا۔ علیزے کے چہرے پہ یکدم سرخی سی چھا گئی۔

''میں سو جاؤں گی صوفے پہ۔'' نظریں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھتی وہ فی الفور بستر سے اٹھ گئی۔ عبدالہادی نے سرد آہ بھری۔

''اب انتظار کس بات کا ہے؟ لیزے کیا آپ کو ابھی بھی میری سچائی پہ شبہ ہے؟ یا میری محبت پہ اعتبار نہیں؟'' اس کے لہجے میں جیسے بے تحاشا سلگن تھی، آنچ تھی۔ علیزے کی جان ہوا ہونے لگی۔ کچھ کہے بغیر وہ ہونٹ کچلتی ہاتھ مسلتی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آئی۔ کیسے اپنی ناراضگی ختم ہونے کا اشارہ دے۔ سچی بات تھی۔ اسے بہت حیا آتی تھی اس سے۔ وہ چاہتی تھی عبدالہادی خود سمجھ جائے۔

''مجھے پتا تو چلنا چاہیے ناں لیزے میرا انتظار کتنا طویل ہے ابھی۔'' عبدالہادی کا انداز اور لہجہ آس

مندانہ تھا۔ علیزے کی آنکھوں میں بے بسی کا احساس نمی بھرنے لگا۔

''ایسی باتیں مت کریں مجھ سے پلیز!'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ عبدالہادی ایکدم ہونٹ بھینچ کر رخ پھیر گیا۔ کچھ کہے بغیر پلٹ کر بالکونی کا دروازہ کھول کر ٹیرس پہ ٹہلتا رہا۔ دوسری طرف علیزے صوفے پہ کروٹ بدل کر لیٹی خاموش آنسو بہاتی رہی تھی۔ ایک بار پہلے اس نے حجاب کو بالائے طاق رکھا تھا اور ذلت سمیٹی تھی۔ راندۂ درگاہ ہوئی تھی۔ اب وہ حیا سے مبرا نہیں نہ ہونا چاہتی تھی۔ عبدالہادی کو خود سمجھنا تھا۔ چاہے وہ جتنی مرضی تاخیر کرتا۔

☆..........☆..........☆

زی حالِ مسکیں مکن تغافل دورائے پنہاں بنائے بتیاں
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کسے پڑی ہے جو جا سنائے پیارے پی کو ہماری بتیاں

ریکارڈ دھیمی آواز میں بج رہا تھا۔ گھٹنوں کے گرد بازو لیے وہ رونے میں مشغول تھی۔ بریرہ نے پہلے ریکارڈ بند کیا تھا۔ پھر نرمی سے اپنا ہاتھ اس کے شانے پہ رکھ دیا۔ انداز میں محبت بھری تھی۔

''رونا تو ایمان بچاتا ہے لاریب! تم کیوں بھٹک رہی ہو؟ کیوں پریشان ہو؟ کیوں فکر کرتی ہو؟ ایک بات یاد رکھنا لاریب! تم رو رو کر سمندر بھی بہا دو تو وہ صرف آنسو ہی رہیں گے کہ وہ ایک انسان کے لیے بہائے گئے۔ اللہ کے لیے نہیں۔ کیسا رشتہ ہے بے جا نفرت کا...... جو ہم ہمیشہ بنائے رکھتے ہیں۔''

لاریب سوجی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ انداز دکھ بھرا تو تھا ہی، سوالیہ بھی ہو گیا۔ گویا پوچھ رہی ہو۔ 'کس سے بے جا نفرت کی میں نے'۔

''میں اُس لڑکی کی بات کر رہی ہوں۔ لاریب جس نے عزت کی بقا کی خاطر بھائی سے بھیک مانگی۔ ہر لمحہ وہ ان دیکھے خوف میں مبتلا رہتی ہوگی۔ اہم اور معتبر رشتوں کا یہ دباؤ اس معجزاتی طور پہ بندھ جانے والے رشتے کو توڑنے کا باعث نہ بن جائے۔ لاریب تھوڑا سا ظرف بڑا کر لو۔ کسی غریب کا بھلا ہو جائے گا۔ بھائی کی نظروں میں تمہارا مقام مزید بلند ہو جائے گا۔ اللہ کے ہاں درجات میں بلندی نصیب ہوگی، بلاوجہ کی اس نفرت سے جو گناہ ہے...... خود کو بچالو۔ غور تو کرو، سوچو تو سہی۔ وہ مظلوم ہے یا ظالم......؟ وہ ضرورت مند ہے یا ظالم؟ یہ بھی سوچو ایک انسان ہی ہیں بھائی بھی۔ ان کی محبت نے تمہیں سنوارا تھا، تو نفرت میں تم اتنی ڈگمگا کیوں رہی ہو؟ یہ نفرت نہیں ہے تو کیا ہے؟ وہ ایسے انسان نہیں ہیں کہ ان کی محبت تمہیں جھوٹ، نفرت، ناشکری پہ اکساتی۔ تم نے غور ہی نہیں کیا ان سب پر؟ غرور اور تکبر پر، گناہ اور ثواب پر، نیکی اور بھلائی پر...... تم بھول گئیں، ایک فانی محبت نے تمہیں سب بھلا دیا۔ اللہ سے محبت کرتیں تو یہ سب نہ ہوتا۔'' اب کے اس کا لہجہ کس قدر دکھ بھرا تھا۔ لاریب نے اپنے گال سختی سے رگڑ ڈالے۔ دکھ میں بہنے والے آنسو اسے گوارا نہ تھے۔

''آزمائش میں گھبرا کر ہمت نہیں ہارتے، حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لاریب مرد کے دل سے ایک بار اتر جانے والی عورت دوبارہ کبھی نہیں چڑھتی۔ میری مثال سامنے ہے تمہارے۔ ہارون نے محبت کی تھی مجھ سے...... کتنے جتن سے اپنایا۔ مگر آج صورتحال سامنے ہے تمہارے۔ میں نہیں چاہتی خدانخواستہ کوئی نقصان حصے میں آئے تمہارے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں تم سہہ نہ سکوگی۔ آج بھائی کو پھر خالی واپس جاتے دیکھ کر میں تمہیں سمجھائے بغیر نہ رہ سکی۔ اس سے پہلے ہمت اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ تم یہ نہ سمجھو میں تمہیں اس گھر سے بھیجنا چاہ رہی ہوں۔ تم بہت عزیز ہو مجھے۔ علیزے کی طرح...... دیکھ لو۔ اس کے ساتھ بھی ہم نے زبردستی کی تھی۔ وہ وقت بھی انشاء اللہ دیکھیں گے کہ وہ

عبدالہادی کے ساتھ خوش ہوگی۔'' لاریب اب بھی خاموش تھی۔ یوں جیسے کہنے کو کچھ باقی ہی نہ رہ گیا ہو۔ بریرہ نے اس کا کاندھا تھپکا۔

''اللہ کی رضا میں راضی ہو جاتے ہیں میری جان! پھر وہ اپنے بندے کو صبر بھی دے دیتا ہے۔ انسان بہت کم فہم ہے۔ اسے کیا خبر کیا شے کسی کے لیے زیادہ قیمتی ہے۔ سو چھن جانے کا غم نہیں کرتے۔ سب معاملہ اُسی پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بہت انصاف کرنے والا ہے۔ بہت سارے معاملات میں صبر اور حوصلے کو لازم رکھنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف عبادت کو ہی اپنی رضامندی سے مشروط نہیں کیا۔ عبادات وفرائض کے ساتھ ساتھ اور بھی ذمہ داریاں عائد ہیں۔ جن کو نبا ہے بغیر اُس کی رضامندی حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ تو صاف صاف فرماتا ہے۔ جو کچھ تم اپنے دلوں میں چھپائے پھرتے ہو۔ اللہ اسے جانتا ہے۔ لاریب! اللہ فرماتا ہے۔ وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ یعنی ہمارے دل کے حال پہ اس کی رضامندی مشروط ہے۔ لاریب! میرا دل صاف نہیں تھا۔ میں اسے صاف کرنے کی کوشش کر رہی ہوں آج تک۔ میرا عمل غلط تھا۔ کچھ کوتاہیاں ہوئیں، ان کے ازالے میں مصروف ہوں۔ لاریب میں نہیں چاہتی تم بھٹکو۔ میری باتوں پہ غور کرنا۔ مجھے پورا یقین ہے اللہ کے حکم سے تم بہترین فیصلہ کرو گی۔''

بریرہ نے اس کا سر سہلایا تھا اور اٹھ کر چلی گئی۔ لاریب ویسے ہی ساکن و سامت بیٹھی تھی، اس کے ذہن میں، اس کے دل میں کیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆..........☆..........☆

باہر ڈھلتی شام اور تیز بوندا باندی نے ہوا میں شدید خنکی کے احساس کو بڑھا ڈالا تھا۔ سارا دن بھی وقفے وقفے سے بادل کھل کر برسے تھے اور اب شہر کے گلی محلے کسی تالاب کا منظر پیش کر رہے تھے۔ آسمان پہ اب بھی کہیں کہیں بادلوں کا قبضہ تھا۔ لیموں کے پیڑ کے عقب سے جھانکتا بادلوں میں چھپا چاند بہت زرد اور اداس لگ رہا تھا۔ پورا صحن اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف صحن کی داہنی دیوار تھی جو سلگتی چاندنی کی زد میں نیم روشن لگ رہی تھی۔ کمرے کی کھلی کھڑکی سے نکلنے والی روشنی نے صحن کے عین وسط میں ایک روشن راستہ سا بنا دیا تھا۔

''میاؤں......'' چھت پر جانے والی سیڑھیوں سے اترتی براؤن بلی کی کانچ جیسی آنکھیں اندھیرے میں چمکیں۔ اس کی آواز نے صحن میں بکھری خاموشی کی سپاٹ چادر پہ نادیدہ سی شکنیں بکھیر دی تھیں۔ عبدالغنی نے چونک کر سر اٹھایا اور گہرا سانس بھر کے پھر سے کرسی کی بیک سے ٹکا دیا۔ اسے کب سے یونہی تکتی عبیر نے اپنی جلتی آنکھیں لحہ بھر کو بند کر کے کھولی تھیں۔ پھر گہرا سانس بھر کے اس کے پاس اٹھ آئی۔

''شاہ! لاریب نہیں آئیں آپ کے ساتھ؟''

عبدالغنی نے محض سر کو نفی میں ہلایا۔ اس کا دل عجیب سی یاسیت کے حصار میں تھا۔

''کل آئیں گے بابا جان اور اُم جان!'' وہ جانتے بوجھتے استفسار کر رہی تھی۔ عبدالغنی کو الجھن ہوئی۔

''ان کے آنے سے پہلے لاریب کو آنا چاہیے تھا! ورنہ شاید ان کا دل اتنا برا ہو کہ اس میں کبھی میری جگہ نہ بن سکے۔ شاہ یا تو آپ مجھے اجازت دیں کہ میں انہیں منا لاؤں۔ یا پھر آپ پلیز مجھے واقعی چھوڑ دیں۔ میں آپ کی زندگی میں اپنی وجہ سے......''

''عبیر...... پلیز! کوئی ایسی بات مت کریں جو مجھے مزید پریشان کر دے۔'' عبدالغنی نا چاہتے ہوئے بھی جھلا گیا۔ عبیر کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو کر چھلکنے کو بے تاب ہوئیں۔ کچھ کہے بغیر وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ عبدالغنی کو اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا

تو خفت سے بے حال اٹھ کر اس کے پیچھے آیا تھا۔

''عبیر آئی ایم سوری یار......!'' وہ اسے شانوں سے تھام کر اپنے مقابل کر چکا تھا۔ عبیر کچھ کہے بغیر اس سے لپٹ گئی تھی۔

''ایسا مت کہیے شاہ! مجھے گناہ گار مت کریں۔ آپ مجھے کبھی دکھ نہیں دے سکتے، مجھے یقین ہے۔ لیکن یہ احساس مجھے خوش بھی نہیں ہونے دیتا ہے شاہ کہ میری وجہ سے لاریب بہت ہرٹ ہو چکی ہیں۔ میری وجہ سے ہی آپ الجھن و پریشانی میں ہیں۔ آپ سے آپ کی محبت، آپ کے بچے دور ہو گئے۔'' عبدالغنی نے اس کا سر سہلایا تھا۔

خود کو قصوروار مت سمجھو عبیر! قسمت میں یونہی طے تھا ازل سے، لاریب کو بھی منالوں گا میں انشاء اللہ! وہ بہت محبت کرتی ہے مجھ سے۔ زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' عبیر نے رقت آمیزی سے کہا۔

''آؤ۔ سو جائیں۔ صبح ٹائم پہ اٹھنا بھی ہوگا۔'' عبدالغنی اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا تھا۔ عبیر مسکرا دی۔ بستر پہ اپنی جگہ آ کر وہ بظاہر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی تھی۔ درحقیقت اسے عبدالغنی کے سونے کا انتظار تھا۔ وہ جب اس کے مدھم خراٹوں سے اس کی گہری نیند کے یقین سمیت مطمئن ہوگئی، تب بے آواز، بنا آہٹ کے اٹھی تھی اور عبدالغنی کا سیل فون اٹھائے کمرے سے باہر آگئی۔

صحن ہنوز کھلا تھا اور ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ انرجی سیور کی روشنی میں گیلا آنگن عجیب سی اداسی لیے چمکتا تھا۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں تھا اور آسمان پہ مکمل تاریکی کا راج...... وہ بیٹھک میں آئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ کانپتے ہاتھوں سے فون بک سے لاریب کا نمبر سرچ کیا اور او کے کا بٹن دبا دیا۔ دوسری جانب جاتی بیل کی آواز سن کر اس کا دل دھک دھک

کرنے لگا۔ کال ریسو نہیں ہوئی۔ اس کے اندر مایوسیت بھری گھمبیرتا اترنے لگی۔ کچھ توقف سے اس نے پھر ٹرائی کیا۔

''واٹس یور پرابلم عبدالغنی! کیوں تنگ کرتے ہیں، اگر آپ نے میری بات نہیں ماننی۔ بس کہہ دیا ناں کریں بات مجھ سے۔ میں نے جان لیا۔ دنیا میں آپ سے زیادہ برا اور کوئی نہیں۔''

کال ریسو ہوئی تھی اور وہ چھوٹتے ہی پھٹ پڑنے کے انداز میں بولتی چلی گئی۔ آواز ایسے نم آلود تھی جیسے رونے کے بعد بھاری ہو جائے۔ لہجے میں ایسا مان و استحقاق تھا جو قربتوں اور بے تکلفی کے سارے موسموں کا حسن پا کر ہی نصیب بن سکتا ہے۔ وہ خفا تھی مگر بات ایسے کرتی تھی جیسے یقین ہو فتح اس کی ہونی ہے۔ یہ یقین بے جا تو نہیں تھا۔ وہ یہ ڈیزرو کرتی تھی۔ عبیر کو ایک بار پھر اس پر رشک آیا۔

''اب بولتے کیوں نہیں ہیں؟'' مسلسل خاموشی پہ وہ جھنجلا گئی تھی۔ عبیر ہڑبڑا کر ہوش میں آئی اور گلا کھنکارا تھا۔ کچھ بولنا چاہا مگر الفاظ جیسے کھو گئے تھے، اس بے بسی پر وہ ہراساں سی ہو گئی۔

''کون......؟'' لاریب دوسری جانب الرٹ ہوئی تھی، اتنا تو وہ بھی جان گئی تھی فون پہ عبدالغنی نہیں ہے۔

''م...... میں عبیر......!!!'' اس کے گلے سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔ لاریب شاکڈ رہ گئی۔ صدمے سے پاگل ہو گئی۔

''تمہاری جرأت اتنی ضرور ہوئی ہوگی کہ تم عبدالغنی کا فون استعمال کر سکو۔ اگر تم میرے گھر...... میرے شوہر کو مجھ سے چھین سکتی ہو تو یہ بہت معمولی حادثہ ہے۔ مگر تمہیں یہ ہمت کیسے ہوئی کہ مجھ سے ہمکلام ہو۔'' وہ اس طرح بولی تھی جیسے رو رہی ہو۔ اس کی آواز میں کراہیں بین کرتی تھیں۔ عبیر اس کے دکھ کا اندازہ کر سکتی تھی۔

’’مجھے معاف کردیں لاریب! میں اپنی صفائی بیان نہیں کروں گی۔ بس اتنا کہوں گی۔ اگر معاملہ عزت کی بقا کا نہ ہوتا تو میں آپ کے اس دکھ کو ختم کرنے کی خاطر خود یہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی۔ لاریب میری بات پلیز تحمل سے سنیے گا۔‘‘

’’مجھے تم سے کچھ نہیں سننا۔ میں تمہیں اس قابل نہیں سمجھتی کہ بات کروں تم سے۔‘‘ لاریب کے لہجے میں حقارت سمٹ آئی تھی۔ اگلے لمحے لائن کاٹ دی گئی۔ عبیر مضطرب سی سیل فون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہ گئی تھی۔ بے بسی، لاچاری کا احساس اس کی آنکھوں کو بھگونے لگا۔

’’بنا کسی خیال کے تحت اس نے لاریب کے لیے ٹیکسٹ ٹائپ کرنا شروع کیا تھا۔ وہ لازماً اپنے مقصد کی تکمیل چاہتی تھی کہ اب یہ ناگزیر ہو چکا تھا۔

’’آپ واپس آجائیں لاریب! اس لیے بھی کہ عبدالغنی آپ کے بغیر ادھورے ہیں۔ خود پر ظلم نہ کریں۔ میں عورت ہونے کے ناتے آپ کی فیلنگز کو سمجھتے ہوئے ایک فیصلہ کررہی ہوں۔ عبدالغنی کو اپنے حقوق معاف کرنے کا فیصلہ...... آپ عبدالغنی کو شیئر نہیں کرسکتی ہیں ناں۔ میرا وعدہ ہے آپ سے، آج کے بعد عبدالغنی صرف آپ کے رہیں گے۔ وہ ایک دیانت دار شخص ہیں۔ مگر جب میں خود اپنے حقوق سے دستبردار ہوں گی تو اس سے معاملے کی کوتاہی پر اللہ سوال نہیں کرے گا۔ یہ شریعت میں جائز ہے۔ اس سے زیادہ میں آپ کی خوشی کی خاطر کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ جہاں تک مجھے اس گھر میں برداشت کرنے کا تعلق ہے۔ تو آپ مجھے ایک ملازمہ کی حیثیت سے زیادہ درجہ نہ دیجیے۔ میں اس میں بھی راضی رہوں گی کہ اللہ نے مجھے باعزت پناہ عطا فرما دی ہے۔ خدارا میری درخواست پر غور کیجیے گا۔‘‘

اس نے ٹیکسٹ لاریب کو سینڈ کرنے کے بعد سینٹ آئٹم سے اسے ضائع کردیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی عبدالغنی اس بات سے آگاہ ہو۔ یہ بہت بڑا فیصلہ تھا۔ جسے کرتے اس کے اندر ویسی ہی کن من ہونے لگی تھی۔ جو شب بھر آنگن بھگوتی رہی تھی۔ اب اس برسات نے اس کے دل کو، اس کی روح کو سیلن زدہ کرنا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

☆............☆............

یار کو ہم نے جابجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا
کہیں ممکن ہوا کہیں واجب
کہیں فانی کہیں بقا دیکھا

وہ راکنگ چیئر پہ جھولتا تھا۔ بے چین دل تھا، مضطرب اس کے ڈولتے وجود کی طرح۔ خالی تھا، اس کے گھر کی طرح۔ وہ ہار رہا تھا۔ مگر اعتراف کی ہمت نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ بہت انا پرست رہا تھا۔ ضدی، سر بلند...... جو ٹوٹ سکتا تھا مگر جھک نہیں، کتنی بار وہ ممی سے ملنے کے بہانے گھر گیا تھا۔ درحقیقت اس بے حس سنگ دل لڑکی کو دیکھنا مقصود تھا۔ جو ایسی گئی تھی کہ پلٹ کر دیکھنا بھول گئی تھی۔ وہ حیران ہوتا۔ وہ تو اس سے محبت کی دعویدار تھی۔ کتنی مرتبہ اس کے کاندھے پر سر ٹیک کر اس نے خوشبو بھرے لہجے میں اعتراف کیا تھا۔ اس کے بغیر نہ جی سکنے کا۔ وہ جی رہی تھی۔ کیسے......؟

’کیا اولاد کی محبت اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ باحق سب بھلا دے......؟‘

وہ خود سے سوال کرتا اور ہارنے لگتا۔ لاریب کے حوالے سے اسے پتا چلا تو لاریب کو سمجھانے کی نیت سے چلا آیا تھا۔ پہلا سامنا ہی لان میں ارسل احمد سے ہوگیا۔ وہ اپنی وہیل چیئر پر تھا۔ صحت مند، توانا...... صاف شفاف، بے حد حسین پیارا بچہ...... اس کا اپنا خون۔ یہ اسی خون کی کشش تھی جس نے اس کے قدم سست کردیے تھے۔ لان میں کوئی نہیں تھا۔ وہ خود کو اس

کی جانب بڑھنے سے نہیں روک سکا۔ ارسل احمد اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ گود میں دھری کلرفل بال پہ ہاتھ مارتا اور اونچی آواز میں بے ہنگم ہنسی ہنسنے لگتا۔ اسامہ بے اختیاری کی کیفیت میں اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔

''ارسل......!'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گال چھوا تھا۔ تب اندازہ ہوا اس کے منہ سے بہتی رال گردن تک پہنچ رہی ہے۔ اسے گھن کی بجائے ترحم کا احساس دل میں اٹدتا محسوس ہوا تھا۔ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے رومال نکالا تھا۔ اور بہت نرمی اور ملائمت بھرے شفقت زدہ انداز میں اس کا چہرہ، اس کی گردن صاف کرنے میں جب مشغول تھا۔ اسے وہاں اپنے علاوہ بھی کسی کی موجودگی کا احساس ساکن کرنے کا باعث بنا تھا۔ ایک جھٹکے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے وہ سرعت سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو اپنے روبرو سارہ کا متبسم چہرہ پا کے اس کی خفت کا جیسے کوئی انت نہیں رہا۔ کیسا تفاخرانہ انداز تھا۔ گویا ایک دنیا فتح کر لی ہو۔ اسامہ کا یہ روپ بہرحال اس کی سب سے عظیم جیت تھی بلاشبہ۔ اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہوسکتی تھی کہ وہ ایسا کام کرتا پایا گیا تھا۔ جس کی توقع اور امیدیں سارہ نے ترک کر دی تھیں۔

''بہت زعم سے اٹھ کر آئی تھیں یہاں تم۔ یہ کیئر ہے تمہاری...... آج کھل گیا مجھ پہ۔'' وہ سرد آواز میں جتلا کر کہہ رہا تھا۔ سارہ جانتی تھی اسے اپنی خجالت بھی تو مٹانا تھی۔ بُرا ماننے والی بہرحال اس میں کوئی بات نہیں تھی۔

''ایک بے بس لاچار بچہ...... یوں اکیلا اتنے بڑے لان میں...... یہاں بھلے سے اسے کتے بلیاں کھا جائیں۔ تف ہے تم پہ سارہ بیگم! اس سے بہتر ہے۔ اسے میں لے جاؤں۔ کم از کم ایسی بے بس تنہائی سے تو محفوظ رہے گا۔'' اسامہ کا غصہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ شاید وہ اس کی نااہلی اور کوتاہی ثابت کر کے رہنا چاہتا تھا۔ بھید کھل جانے کی جو جھنجھلاہٹ تھی۔ وہ اسے بُری طرح کوفت زدہ کر چکی تھی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر آپ مجھ سے زیادہ اچھے انداز میں کیئر کر سکتے ہیں تو ضرور لے جائیں۔ ویسے بھی باپ ہیں۔ کچھ فرائض آپ پر بھی لاگو تو ہوتے ہیں۔'' سارہ کے اندر تو جیسے ترنگ ہی انوکھی تھی۔ مسکرا کر جیسے ایک نئی بات سنا دی۔ اسامہ کا طیش سے بُرا حال ہونے لگا۔

''اپنی حد میں رہو سارہ! جو کچھ بھی خود کو سمجھتی ہو اس غلط فہمی سے نکل آؤ۔'' وہ اس کے چادر میں لپٹے وجود پر شعلہ بار نظریں ڈال کر غرایا تھا۔ اور لمبے ڈگ بھرتا اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

لاریب سے مل کر اسے اندازہ ہوا تھا، صرف سارہ نہیں اس گھر کی ہر لڑکی ہٹ دھرمی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اسے غصہ آیا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے لاریب کہ تم نے اتنا عرصہ عبدالغنی بھائی کی قربت میں گزارا ہے۔ میں تو تمہارے انداز و اطوار کی تبدیلی سے سمجھا تھا تم بہت سمجھ دار اور عقلمند ہوگئی ہو۔ مگر اب اندازہ ہوا کہ ایسا تو کچھ نہیں۔ تم بھی ایک بے حد عام لڑکی ہو۔ جذباتی، احمق اور خود پرست۔ وہی عام عورت جو شوہر کی دوسری شادی کے نام پر مسلمان بھی نہیں رہتی۔ جسے اللہ کے احکامات بھول جاتے ہیں۔ جسے صرف اپنی غرض، اپنی جذباتیت اور مفاد یاد رہ جاتا ہے۔'' وہ جتنا غصیلا ہو رہا تھا۔ اسی قدر برسا تھا لاریب پر۔ جواباً لاریب نے بھی کہاں لحاظ کیا تھا۔

''آپ اور ہارون بھائی تو میرے معاملے میں نہ ہی بولیں تو بہتر ہے۔ آپ کے عمل بھی ہر گز قابلِ تقلید نہیں ہیں۔ خود بابا فضیحت والا معاملہ ہے۔ ہاں ہوں میں خود غرض! نہیں کر سکتی برداشت۔ آپ اپنے بیٹے کو ایکسیپٹ کریں۔ سارہ بھابی سے اختلاف ختم

کرلیں۔ جو بھی، جیسا بھی بچہ ہوگا، اسے خدا کی رضا سمجھ لیں۔ ہارون بھائی دونوں بیویوں کے مابین انصاف قائم کرلیں۔ بھابی کو معاف کردیں۔ پھر میں بھی عبدالغنی کو شیئر کرلوں گی۔''

وہ چیخ پڑی تھی۔ یوں ہر کسی کا دباؤ ڈالنا اسے بدمزاج اور چڑچڑا بنا رہا تھا۔ اسامہ کو ان طعنوں نے عجیب سی چپ لگادی تھی۔ کچھ کہے بغیر وہ اسی خاموشی سے وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ تب سے جیسے ایک جنگ اس کے اندر چھڑی ہوئی تھی۔ دل سارہ اور ارسل کی جانب جھکتا تھا جبکہ دماغ انا کا اسیر تھا۔ جھکنے میں متامل۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ کیا کرے۔

☆.........☆.........☆

شام کا وقت تھا۔ دھوپ تقریباً رخصت ہوچکی تھی۔ گھر کی دیواریں ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں کی زد میں دھیرے دھیرے سلگ رہی تھیں۔ آنگن میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے صحن میں پھیلی شام کو دیکھتی عبیر دور سے آتی مسجد سے نعت کی آواز سنتی رہی۔ عبدالغنی ایئرپورٹ گیا ہوا تھا، اُم جان اور بابا جان کو ریسو کرنے۔ لاریب کی جانب سے مکمل خاموشی تھی۔ عبیر مضطرب تھی یہ سوچ کر کہ جانے اس نے میسیج دیکھا بھی تھا...... یا قابل درخور اعتنا نہیں جانا تھا۔ اس کا دل ہر لمحہ گویا سورج کی تیز تپش کے مقابل پگھل کر ختم ہو رہا تھا۔

''وہ نہیں آئیں عبدالغنی! اُم جان پوچھیں گی میرا اوران کا تو......'' اس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ آنکھیں کسی بھی لمحے برس پڑنے کو تیار تھیں، عبدالغنی خود جتنا بھی مضطرب تھا، مگر اسے حوصلہ دینے کو نرمی سے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیوں پریشان ہوتی ہیں آپ! عبیر یہ میرے مسائل ہیں۔ آپ کو جواب دہ نہیں ہونا پڑے گا۔ انشاء اللہ! اللہ بہتر کرے گا سب۔''

''آپ کھانے پر اہتمام کرلینا۔ مجھے امید ہے بریرہ بھی ضرور آئے گی۔ ممکن ہے علیزے بھی آجائے۔ مجھ سے کوئی رابطہ تو نہیں ہوا مگر اسے اُم جان اور بابا جان کی واپسی کا لازماً علم ہوگا۔'' عبیر محض سر ہلا سکی تھی۔ عبدالغنی کے جانے کے بعد وہ بے دلی سے کچن میں آگئی تھی۔ پلاؤ اور رائتے کی تیاری کرتے بار بار اس کا ذہن آنے والے وقت کے خیال سے الجھ کر گم ہونے لگتا تھا۔ ایک بار ہاتھ بھی جلا تھا۔ دو سے تین مرتبہ مسالا جلتے جلتے رہ گیا۔ تب ہی دروازے پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی اور چند لمحوں کے توقف سے دروازہ ناک ہونے لگا۔ عبیر کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا۔ عبدالغنی واپس آگئے تھے گھر کے سربراہان کے ساتھ۔ وہ سخت پزل ہوئی تھی۔ لرزتی ٹانگوں کے ساتھ خشک ہوتے حلق کو تھوک نگل کر تر کرتی وہ بیرونی دروازے تک آئی تھی۔ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوسکی تھی۔ جبھی چٹخنی گرادی۔ دروازہ آنے والے نے خود وا کردیا۔ عبیر متحیر ہوکر رہ گئی۔ اس کے روبرو لاریب کھڑی تھی۔ پیازی لباس میں اس کی رنگت بھی ویسی ہی ہورہی تھی۔ عبدالعلی کی انگلی پکڑے پورے تفاخر اور زعم سے گردن اٹھائے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتی ہوئی۔

''بیگ اندر رکھ دو اور تم واپس جاؤ۔'' وہ پلٹ کر ڈرائیور سے مخاطب تھی۔ جو حکم بجا لایا تھا۔ عبیر نے سرعت سے سائیڈ پر ہوکر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

''خوش آمدید!'' عبیر نے دلی طمانیت سے کہا تھا۔ جواباً اسے سرد نظروں کو سہنا پڑا تھا۔ معاً وہ چونک اٹھی تھی۔ سیاہ دوپٹے کے ہالے میں سنہری رنگت کا نکھار اور نقوش کی دلکشی ہرگز نظرانداز کیے جانے والی نہیں تھی۔ اسے دھچکا لگانے کا باعث اس کی غیر معمولی حد تک تبدیل ہونے والی شکل تھی۔

''مجھے خوشی ہے آپ نے میری گزارش رد نہیں

کی۔ شاہ ابھی اُم جان اور بابا جان کو لے کر نہیں آئے
یہ اور اچھی بات ہے کہ آپ ان کی واپسی سے قبل پہنچ
گئیں۔'' عبیر نے نرمی سے گفتگو کو آگے بڑھایا تھا۔ جو
یکطرفہ ہی تھی۔

''اپنی بکواس بند کرو۔ تمہیں یہ خیال کیونکر ہے کہ
میں تمہیں سننا پسند کروں گی۔'' وہ چیخ پڑی تھی۔ عبیر کا
چہرہ دھواں ہوا تھا۔ مگر وہ اس قسم کی صورتحال کے لیے
غالباً خود کو تیار کر چکی تھی۔ کچھ کہے بغیر سر کو اثبات میں
ہلایا اور پلٹ کر کچن میں آگئی۔ لاریب جیسے کسی آگ
میں جلتی ہوئی اپنے کمرے تک آئی تھی۔ اور ایک ایک
شے کو جیسے پرکھتی جانچتی نظروں سے دیکھنے لگی۔ عبیر
نے گو کہ اپنی رہائش کا وہاں سے ہر نقش مٹا دیا تھا۔ اس
کے باوجود لاریب کا دل اس کی موجودگی کے یقین کو
پا کر جھلسنے لگا تھا۔ نم آنکھوں کی جلن نہ سہتے ہوئے وہ
آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے سسکیاں دبانے لگی۔ عبدالعلی
ماں کے احساسات و تاثرات سے سہا ہوا خاموش کھڑا
تھا۔ اسے روتا پا کر کچھ اور ڈسٹرب نظر آنے لگا۔

''بابا کہاں ہیں مما! اور آپ کیوں رو رہی ہیں۔''

''عبدالعلی آپ باہر جاؤ۔'' لاریب نے قدرے
درشتی لہجے سے کہا تھا۔ عبدالعلی سہا ہوا پلٹ کر باہر چلا
گیا۔ یہاں تک کہ عبدالغنی اُم جان اور بابا جان سمیت
واپس آگیا۔ وہ سب کی آوازیں سنتی رہی اور وہیں بیٹھی
رہی۔ اس کا دل بھاری تھا۔ اس کا دل اس پل جیسے
سب سے روٹھا ہوا تھا۔

''لاریب کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بچی ابھی تک
نہیں آئی۔'' اُم جان کے بعد یہ سوال بابا جان نے بھی
کیا تو عبدالغنی اٹھ کر خود وہاں چلا آیا تھا۔ اس کے لیے
لاریب کی واپسی جتنا بڑا سرپرائز تھی، اس سے کہیں
زیادہ اطمینان کا باعث۔ اس نے روٹھی ہوئی اکھڑی
اکھڑی لاریب کو محتاط نظروں سے دیکھا تھا۔

''لاریب باہر آؤ...... اُم جان اور......''

''باہر موجود ہے ناں آپ کی قانونی و شرعی بیوی۔
ملوا دیں اسے ان سے۔'' وہ بھڑک کی تھی۔ عبدالغنی خاموش
کا خاموش رہ گیا۔

''تم ایسی نہیں تھیں لاریب! تم اس بات پر لازمی
غور کرنا۔ اگر رشتے سچے ہوں تو انہیں بات بات پر
سنبھالنا نہیں پڑتا اور جن رشتوں کو بات بات پر سنبھالنا
پڑ جائے وہ سچے نہیں ہوتے۔ تعلق اور رشتے کی بنیاد
محبت پر قائم ہو یہ ضروری ہے۔ مگر اس میں احساس اور
پاسداری کے ساتھ وفاداری نہ ہو تو بنیاد محض محبت کے
آسرے پر قائم نہیں رہ سکتی۔ میں نے تم سے بہت
ساری توقعات نہیں باندھی ہیں تھوڑا سا احساس مانگا
ہے۔ میرے مسائل کو صرف میرے نہ سمجھو تو مسئلہ حل
ہو سکتا ہے۔'' عبدالغنی کا لہجہ نرم تھا، لاریب کے چہرے
پر زہرخند پھیل گیا۔

''آپ تو کہیں گے ہی یہ بات ظاہر ہے۔'' وہ طنز
سے کہہ گئی۔ عبدالغنی کے چہرے پر عجیب سا تاثر پھیل گیا
کچھ کہے بغیر وہ خاموشی سے پلٹ گیا تھا۔ لاریب ہنکارہ
سا بھر کے رہ گئی۔ معاً اسے سارہ کی بات یاد آئی تھی۔

''انسان کو دل موم کرنے کا ہنر آنا چاہیے۔ اسے
معلوم ہونا چاہیے کس وقت کس کو کیسی دلیل دینی ہے۔
اگر اپنی ذات منوانے کے لیے کسی میدان میں قدم
رکھنا پڑیں تو سازگار حالات کی تمنا میں حالات کو جیسے
ہیں تسلیم کر لینے میں حرج نہیں۔ تو اس کا ہرگز یہ مطلب
نہیں کہ آپ ہار گئے۔ ہارنا میری نظر میں مر جانے کا
دوسرا نام ہے۔ ارادہ زندہ ہے تو جنگ کسی بھی لمحے
دوبارہ شروع کی جا سکتی ہے۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ اسے لگا وہ میدان چھوڑ
کر غلطی کر رہی ہے۔ اپنے حصے کی جنگ اسے خود لڑنی
ہی نہیں تھی فتح کے لیے کوشش بھی کرنی تھی۔ خود کو
مضبوط کرتی وہ اٹھ کر باہر آگئی تھی۔ اُم جان اسے روبرو
پا کے والہانہ انداز میں کھڑی ہوئیں اور اسے گلے لگایا

تھا۔ لاریب کی جتلاتی ہوئی نظریں عبدالغنی پر جا پڑیں۔ گویا اس پر اپنی حیثیت، اپنا مقام واضح کر رہی ہو۔ اسے بتلا رہی ہو کہ میں ہی ہوں اِس گھر، اِس ریاست کا حال اور مستقبل۔ اُس شرمندگی کی طرح نہیں ہوں جسے تم نے متعارف کرانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اسے ہنسی آئی۔ کبھی وہ وقت بھی تھا۔ جب اس مغرور کو اپنی نگاہ میں قید کر لینے کی آرزو تھی۔ اس کا ایک ایک نقش چھو لینے کی تمنا اسے پاگل بنائے پھرتی تھی۔ یہ تمنا تو آج بھی تھی۔ مگر ساتھ میں اور بہت سارے مسائل آ پڑے تھے درمیان۔ وہ آج پھر اسے ناقابلِ رسائی لگنے لگا تھا تو دل دُکھن سے بے حال تو تھا ہی۔ توہین کا احساس بھی پاگل کرتا تھا۔

''میں نے اپنی بیٹی کے لیے بہت ساری دُعائیں مانگی ہیں۔ ہمیشہ خوش آباد رہو۔'' اُم جان نے اسے خود سے الگ کر کے پیار سے پیشانی چومی تھی۔ وہ مسکرائی اور بابا جان کے سامنے جھکی۔ انہوں نے اسی رسان اور شفقت بھرے مخصوص انداز میں اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا تھا۔ لاریب بالکل عبدالغنی کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ دھوپ مدھم پڑ چکی تھی۔ جامن کا درخت ساکن تھا۔ پتے بے حس اور اپنے پروں کو کھجلاتے پرندے بے زار...... عبدالغنی کا دل انجانے دکھ سے بھرنے لگا۔ لاریب کی شدت پسندی اس کی نیکی کے جذبے کو مضطرب کرتی جا رہی تھی۔ ایسی دُکھن...... جیسے کوئی زخموں پہ آنے والے کھرنڈ نوچ رہا ہو۔ رگوں کو کاٹتا ہوا درد۔

''اسے ملوائیں گے نہیں؟ اپنا کارنامہ سنانے کا حوصلہ نہیں؟'' لاریب نے تمسخرانہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ عبدالغنی خاموش رہا۔ یہی خاموشی لاریب کو شہ دے رہی تھی۔ اس کی بے حسی کو تقویت بھی۔

''مجھے لگتا ہے آپ کی دُعائیں قبولیت نہیں پا سکی ہیں اُم جان!'' لاریب نے ترچھی نگاہوں سے عبدالغنی کی بے چینی دیکھتے شوشا چھوڑا۔ اُم جان کے ساتھ بابا جان بھی متحیر ہو کر اسے تکنے لگے۔ جس کے ہونٹوں پر دل جلاتی مسکان تھی۔

''مطلب...... آپ کے بیٹے نے مجھے بہت تنگ کیا۔ بہت ستایا ہے۔ بے شک پوچھ لیں۔ مگر نہیں سکیں گے۔''

اب وہ براہِ راست عبدالغنی کو دیکھ رہی تھی۔ جو لب بستہ خاموش بیٹھا تھا۔ اُم جان اور بابا جان کی نظریں بیک وقت عبدالغنی پر اٹھی تھیں۔ انداز میں الجھن بھی تھی۔ تحیّر بھی۔ ہنسی مذاق میں عبدالغنی کی شکایت ایک الگ بات تھی۔ ورنہ وہ کبھی عبدالغنی کے حوالے سے ان کے سامنے کبھی پوراشا کی نہیں ہوئی تھی۔

''عبدالغنی بیٹے......! کیا کہہ رہی ہیں ہماری بیٹی!'' بابا جان نے بیٹے سے استفسار کر لیا تھا۔ عبدالغنی نے گہرا سانس بھرا تھا اور ان کی بجائے لاریب کو دیکھا۔

''انہیں مجھ سے جو اختلاف یا شکایتیں ہیں۔ یہ میرا خیال ہے مجھ سے بہتر انداز میں آپ کو بتا سکتی ہیں۔ بابا جان! جیسے انہوں نے اپنے گھر کے تمام افراد کو بتائی ہیں۔'' وہ کس قدر ناراضگی سے بولا تھا اور اٹھ کر وہاں سے چلتا بیرونی دروازہ پار کر گیا۔ اُم جان تو ششدر ہو کر رہ گئی تھیں۔ لاریب نے سر جھٹکا اور انہیں نم آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''محسوس تو کر لیا ہوگا آپ نے بھی۔ کتنا بدل گئے ہیں۔ یہ سارا کرشمہ اس فاحشہ عورت کی قربت کا شاخسانہ ہے۔ جسے یہ آپ کی غیر موجودگی میں صرف اپنے دل میں ہی نہیں گھر میں بھی جگہ دے چکے ہیں۔ بابا جان میرے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ اندازہ کر لیں۔ یہ کسی طور بھی اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ چاہے میں کیوں نہ انہیں چھوڑ جاؤں، یہ منظور ہے۔'' وہ بولنے پر آئی تو بغیر رکے اندر کا غبار نکالے گئی تھی۔ اور کچن کی کھڑکی سے لگ کر کھڑی عبیر نے دل تھام لیا تھا۔ اس پر انکشاف ہوا تھا۔ اگر کوئی کم ظرفی پر اترے تو اسے

اس سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ سامنے والے نے اپنی کل کائنات بھی ہار دی ہے اس کی خاطر۔ اسے دکھ ہوا تھا اس لیے کہ وہ عبدالغنی کو دکھ دینے کا باعث بنی تھی۔ وہ اتنا پیارا انسان جو صرف محبت کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اسے وہ لڑکی دکھ دے رہی تھی، جس سے وہ خود بہت محبت کرتا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہو بیٹی! اللہ رحم کرے۔ پوری بات بتاؤ ورنہ میرے دل کو کچھ نہ ہو جائے۔'' لاریب نے اٹھ کر ان کو دونوں شانوں سے تھام لیا۔

''آپ کو پریشان ہی تو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جبھی یہ بات نہیں بتلائی اپنی تمام تر تکلیف کے باوجود۔ آپ ہمت سے کام لیں۔'' بابا جان اس تسلی آمیز انداز پر گہرا سانس بھر کے رہ گئے۔

''اگر آپ کو یہ خیال تھا بیٹے تو اب بھی ذرا تسلی رکھی ہوتی۔ اور بات کرنے کا یہ انداز بھی بہت غلط ہے۔ کسی کو بھی خود سے کمتر درجے پر نہیں رکھنا چاہیے۔ بہر حال اگر وہ بچی گھر پر موجود ہے تو لازماً عبدالغنی ہم سے مناسب ٹائم پر ملوا دیتا۔ مجھے اس پر بھرپور اعتماد ہے۔ عبدالغنی نے اگر یہ قدم اٹھایا ہے تو اس کا مقصد نہ تو آپ کو تکلیف پہنچانا ہو سکتا ہے۔ نہ ہی محض خواہش سے مغلوب ہو کر...... بیٹے عبدالغنی سے پھر بھی آپ کو اگر شکایت ہے تو ہم اسے دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ آپ کی حیثیت مسلم ہے۔ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔'' بابا جان کا رسان آمیز ٹھہرا ہوا لہجہ لاریب کے لیے کسی ڈھارس کا باعث نہیں بن سکا۔ اس نے شاکی نظروں سے ام جان کو دیکھا تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''سردی بڑھ رہی ہے، اندر آ جائیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔'' بابا جان اٹھ کر اُم جان سے پہلے اندر چلے گئے۔ اُم جان بہت آہستگی سے اٹھی تھیں۔ کچھ کہے بغیر لاریب کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہونٹ بھینچے پلکیں جھپک کر آنسو اندر اتارتی رہی۔ اُم جان کو سہارا دے کر ان کے کمرے تک چھوڑا تھا۔ پھر کچن میں آ گئی۔ عبیر یونہی بے جان سی نیچے فرش پر بیٹھی نظر آئی۔ جیسے کل متاع گنوا بیٹھی ہو۔ لاریب نے نظروں میں تنفر سمو کر اسے دیکھا۔

''چونکہ میں کچن میں تمہیں برداشت نہیں کر سکتی۔ سو بہتر ہے تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' ہونٹ بھینچ کر وہ غراتی ہوئی آواز میں کہہ کر برتن پٹخنے لگی۔ عبیر بکھرے حواس سمیٹتی متوحش سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سارا وجود جیسے درد بن کر کراہ رہا تھا۔ دل میں اترتے درد کی شدت سے نڈھال ہوتے اس نے سر جھکا کر ہونٹ کاٹے اور قدم آگے بڑھائے تو جسم پر لرزہ سا طاری ہونے لگا۔ بے جان قدم گھسیٹتی وہ خود کو سخت بے اماں محسوس کر رہی تھی۔ جس پل اس نے برآمدہ عبور کر کے آنگن میں قدم رکھا آسمان سے پہلی بوند اتری تھی۔ اس نے نم پلکیں اٹھا کر آسمان کی اس نوازش کو محسوس کیا اور بیٹھک میں آ گئی۔ بیرونی دریچہ کھلا تھا اور یخ بستہ ہوائیں اندر بہت فراخدلی سے گھسی آ رہی تھیں۔ بارش یکدم تیز ہوئی تھی، وہ دریچے کے پار باہر کا منظر بھیگتا محسوس کرتی رہی۔ عجیب سا خوف اس کے اندر سرائیت کرتا جا رہا تھا۔

''خدا نے اپنے ہر بندے کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ خواہ دنیا کو قبول کرے یا خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ قبول کرے۔'' اسے کہیں پڑھی ہوئی بات یاد آئی۔ اس نے ہمیشہ دنیا کو نظر انداز کر کے وہ چاہا تھا جو اللہ اس کے لیے پسند کرے۔ اگر یہ بھی اس کی آزمائش تھی، تو سر آنکھوں پر۔ وہ خود کو مضبوط رکھنا چاہتی تھی۔

''جب آنکھوں میں بہت سارے آنسو جمع ہو جائیں۔ جب اُس سے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہو۔ تو کبھی پریشان نہ ہونا۔ بس اُس کی جانب دیکھنا...... ذاتِ باری تعالیٰ سے محبت بھری نظر کی التجا کرنا۔ بے

شک وہی ہے جو روتوں کو ہنسا سکتا ہے۔ جو بے قراری کو سکون دیتا ہے۔ جو بگڑی کو بنا دیا ہے۔ وہی تو ہے جو ڈوبتی نیا کو پار لگا دیتا ہے۔ بس اُس پر امید رکھنا۔ اُس پر یقین رکھنا۔ دُعا مانگنا اس رابطے کو کبھی ترک نہ ہونے دینا کہ دُعا دستک کی طرح ہے۔ مسلسل دستک سے دروازہ کھل ہی جایا کرتا ہے۔

اس کی پچھلے دنوں کی بے قراری اور اضطراب کو محسوس کرتے ہوئے عبدالغنی نے اسے کتنی نرمی سے نصیحت کی تھی۔ اسے لگا، وہ اب بھی اسے یہی کہہ رہا ہے۔ اسے لگا وہ تنہا نہیں ہے۔ عبدالغنی بھلے اس کو چھوڑ گیا ہے۔ مگر اس کا رب اس کے پاس ہے۔ وہ اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ مسکرائی، اس مسکان میں طمانیت تھی۔ آسودگی تھی۔

☆............☆............☆

درد کا شہر بساتے ہوئے رو پڑتا ہوں
روز گھر لوٹ کے جاتے ہوئے رو پڑتا ہوں
جانے کیا سوچ کے لیتا ہوں میں تازہ گجرے
اور پھر پھینکنے جاتے ہوئے رو پڑتا ہوں
جسم پہ چاقو سے ہنستے ہوئے جو لکھا تھا
اب تو وہ نام دکھاتے ہوئے رو پڑتا ہوں
روز دل کرتا ہے منہ موڑ لوں میں دنیا سے
روز میں دل کو مناتے ہوئے رو پڑتا ہوں

ہارون نے بال بنائے اور برش ڈریسنگ ٹیبل پر اچھال دیا۔ بریرہ عبداللہ کو جوتے اور موزے پہنا رہی تھی۔ چونک کر متوجہ ہوئی۔ اس کا انداز بہت شکستہ اور مضمحل لگا تھا اسے۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی پوری طرح آپ کی؟''

ہارون نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کچھ دیر تک سلگتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔

''شکر کرو۔ لاریب خیریت سے گھر چلی گئی اپنے۔ ورنہ میں تمہیں واپس بھجوانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ یاد رکھو سارے نقصان ہمارے حصے میں تمہاری وجہ سے آئے ہیں۔'' وہ درشتگی سے کہتا دراز سے سگریٹ کیس نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔ بریرہ خاموش بیٹھی رہ گئی۔

''مجھے اعتراف ہے۔ مجھے معاف کردیں ہارون!''

''معافی مت مانگا کرو مجھ سے۔ ازالے کا ایک یہی آخری انداز نہیں ہے دنیا میں۔'' وہ نا چاہتے ہوئے بھی چیخ پڑا۔ بریرہ نے اس کی آنکھوں کی وحشت دیکھی تھی اور گھبرا کر تیزی سے اس کے قریب آگئی۔

''ہارون......!!!'' اس کے انداز میں بے قراری تھی۔ ہارون نے اسے ہاتھ سے پیچھے کردیا۔

''ہاتھ مت لگانا۔ تم میرے کسی زخم کا مرہم نہیں ہو۔ یہ طے ہو چکا۔'' بریرہ شدتِ ضبط کے باوجود سسک اٹھی تھی۔

''دنیا کی محبت جیتنے اور اپنے رشتوں کی محبت پانے والی کوششوں میں بس ایک فرق ہوتا ہے۔ دنیا کی محبت جیتنے میں ناکام رہنے کا غم انسان کو دیمک کی طرح نہیں کھاتا۔ اپنوں کی بے اعتنائی دیمک کی طرح چاٹنے لگتی ہے۔ دنیا کی محبت سو بار خالص ہونے کے پیمانے پر تولنے کے باوجود بھی ہم اپنی شرطوں پر قبول کرتے ہیں۔ اپنوں کی جھوٹی محبت کے لیے بھی انسان جھولی پھیلائے رکھتا ہے۔ میں یونہی برباد ہوا ہوں تمہاری خاطر۔ تم مجھے ہمیشہ جھوٹ پر ٹرخاتی رہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ مگر......''

''ہارون آپ کو سچائی کا یقین دلانے کو مجھے کیا کرنا پڑے گا۔ بتائیں؟'' وہ روہانسی ہو کر سوال کرنے لگی۔ ہارون نے جواباً کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''اس سے بڑھ کر میری اور کیا تذلیل ہو سکتی ہے۔ تم مجھے بہلاؤ، اس کی اجازت نہیں دے سکتا میں۔'' وہ حلق کے بل چیخا تھا۔ بریرہ ساکت رہ گئی۔ وہ اگر کوئی جذباتی بے وقوف لڑکی ہوتی تو لازماً کوئی احمقانہ قدم اٹھا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کرتی۔

اسے دکھ اس بات کا تھا کہ ہارون اچھا خاصا میچور ہو کے ایسے جذباتی احساسات کیوں رکھتا تھا۔ یا شاید محبت میں انتہا انسان کو یونہی بے اوسان اور جذباتی ہی بنا دیا کرتی ہے۔

''ہارون میں آپ سے محبت کرتی ہوں اس کا ثبوت یہ بھی ہے اگر آپ سمجھیں کہ آپ کا ہر فیصلہ چاہے وہ میرے لیے کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ تھا۔ میں نے مان لیا۔ آپ غور تو کریں۔ آپ نے شادی کی میں نے آپ کی رضا سمجھتے ہوئے دل سے قبول کرلیا۔ یہ سوچ کر کہ مجھ سے جو کوتاہی ہوئی، ہوسکتا ہے اس کا ازالہ اس صورت ہو جائے۔ یہ بھی یاد کریں ہارون میں کبھی بہت جلد باز اور جھگڑالو تھی۔ سوہا کا محض نام سن کر میں نے آپ کو اپنی باتوں سے عاجز ہی نہیں کیا تھا۔ ہرٹ بھی کرچکی تھی۔ میری ہر وہ حرکت جس سے آپ کو یا مجھ سے وابستہ رشتے کو تکلیف پہنچ چکی تھی میں نے اس سے کنارہ کیا۔ اس کی وجہ وہی ہدایت ہے جس سے اللہ نے مجھے سرفراز فرمایا۔ میں پہلے غلط تھی۔ احساس ہونے پر تائب ہوئی۔ اللہ کی توفیق تھی۔ ہارون...... میں مسلسل ازالے میں کوشاں ہوں۔ مجھے دکھ ہے کہ میں آپ کو ذرہ برابر بھی سکون نہیں دے سکی۔ میں بار بار آپ سے معافی کی خواستگار ہوتی ہوں۔ یہ بھی میری محبت ہے۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اذیت نہیں کہ آپ جو ہدایت اور نیکی کے طالب تھے میری بدولت اس راہ سے بھٹک گئے اور تا حال بھٹک رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے۔ اللہ مجھ سے ابھی پوری طرح راضی نہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے۔ آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میری دن رات اللہ سے التجا ہے۔ وہ آپ کو سکونِ قلب اور نیک ہدایت سے نواز دے۔ مجھے جس دن یقین ہوا آپ کو ہدایت سے کوئی شکوہ نہیں۔ اسی دن دل سے بوجھ اترے گا۔ ورنہ ضمیر کی عدالت میں ہر روز اس طرح فردِ جرم عائد ہوتی رہے گی مجھ پر۔''

قطرہ قطرہ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ لہجے میں اتنی صداقت تھی کہ دل بے اختیار ایمان لانے کو مچل جائے۔ ہارون کے جلتے بلتے دل پر بھی جیسے ٹھنڈے چھینٹے پڑے تھے۔ کچھ دیر وہ فطری طور پر لہجے کی تاثیر، الفاظ کی چاشنی میں گم رہا تھا۔ معاً وہ چونکا اور اس پر جتلانے کو دانستہ طنزیہ ہنسا تھا۔

''چلو بس ٹھیک ہے۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ بہت اچھی تقریر کرلیتی ہو تم۔ یہ تو ثابت ہوا۔'' بریرہ نے کچھ کہے بغیر آنسو پونچھ ڈالے۔ اس کا دل ہنوز بوجھل تھا۔

مشہور ہے بہت میرے الفاظ کی تاثیر
اک شخص مگر مجھ سے منایا نہیں جاتا

اس کے اندر غضب کی تھکن اتر رہی تھی۔

''ممی چل رہی ہیں ساتھ؟'' ہارون نے آگے بڑھ کر عبداللہ کو اٹھالیا تھا۔

''نہیں۔ منع کردیا ہے۔ کہہ رہی ہیں، کل چلی جائیں گی۔ آج کچھ طبیعت بہتر نہیں۔'' بریرہ بولی تو اس کی آواز ہنوز بوجھل تھی۔ ہارون گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

☆......☆......

وہاں ان کا استقبال کرنے والی لاریب ہی تھی۔ جو حسب سابق انہیں روبرو پا کے پُرجوش ہوئی نہ خوش۔ وہی جلا بھنا انداز تھا جو آج کل اس کے مزاج کا حصہ بنا ہوا تھا۔ بریرہ بہت جوش و خروش سے والدین سے ملی تھی اور بہت عقیدت بھرے انداز میں کرید کرید کر وہاں کے متعلق پوچھتی رہی تھی۔ لاریب چائے لائی تو عبدالغنی بھی چلا آیا تھا۔ بریرہ اسی تپاک سے اس سے ملنے لگی۔

''طبیعت ٹھیک نہیں لگتی بھائی! اتنے کمزور ہو رہے ہیں۔'' وہ حیران ہوگئی تھی۔ عبدالغنی کی آنکھوں تلے بھی

باقاعدہ جلتے تھے۔ وہ محض مسکرا کر رہ گیا، لاریب نے چونک کر اس کا از سرِ نو جائزہ لیا تھا اور جیسے دل پر ہاتھ پڑا۔ وہ واقعی بہت زرد ہی نہیں پژمردہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔

''چائے لیں۔'' لاریب نے مگ بڑھایا۔ عبدالغنی نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

''نہیں۔ میں کھانا کھاؤں گا پہلے۔'' لاریب نے صاف اس کی خفگی محسوس کی تھی۔ شاکی انداز میں کچھ دیر اسے دیکھا پھر آنکھوں میں آنسو لیے پلٹ گئی۔

''دیکھا آپ نے اسے۔ بالکل بھتنی لگتی تھی۔ مگر چند دنوں میں ایسے نکھر گئی کہ یقین نہیں آتا۔ خود اتنے ویک ہو رہے ہیں۔ کیا مجھے دکھ نہیں ہے ان کا۔'' بریرہ چائے کے برتن کچن میں رکھنے آئی تو لاریب پھٹ پڑی تھی۔ بریرہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

''یہ ویک نیس ٹینشن کا باعث بھی ہو سکتی ہے لاریب! اس میں کیا شک ہے کہ تم ٹینشن دے رہی ہو انہیں۔'' لاریب نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔

''آپ تو مجھے ہی کٹہرے میں گھسیٹیں گی۔ دیکھا تھا انداز اپنے بھائی کا۔ دیکھ تک نہیں رہے تھے مجھے۔ ایسا کون سا جرم کر دیا ہے میں نے۔'' وہ الٹا جھنجلانے لگی۔

''ہمارے خلاف اصل سازشی ہمارا اپنا نفس ہوتا ہے لاریب گڑیا۔ یہ ہمیں خود احتسابی سے روکتا ہے۔ یہ عذر تراش کر ہمیں اس بات پر مطمئن کر دیتا ہے کہ سارے فساد کی جڑ صرف اور صرف بیرونی سازش ہے۔ لاریب!...... غافل کر دینے والی خوشی سے بیدار کر دینے والا غم بدرجہا بہتر ہے۔ ان حالات سے سمجھوتا کر لو تو ہی اچھا ہے۔ ایسا نہ ہو حالات تمہارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ ایسا نہ ہو فیصلہ تمہارے اختیار سے نکل کر اوپر کی عدالت میں چلا جائے۔ وہاں پھر عرضیاں اور گزارشیں پیش کریں آنسوؤں کے خزانے لٹائیں تب بھی اگر اللہ کی ناراضی دور نہ ہو سکے تو اس سے بڑا نقصان دوسرا کوئی نہیں۔''

بریرہ کی نصیحت میں بے حد نرمی تھی۔ لاریب چند لمحوں کو جیسے سہم سی گئی، کچھ نہیں بول سکی۔ بریرہ نے محبت و نرمی سے اس کا کاندھا تھپکا تھا اور پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کا رخ بیٹھک کی جانب تھا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو کھلتا چلا گیا۔ اسے خوشگوار حیرت نے آن لیا تھا۔ بلیک دوپٹے کو نماز کے اسٹائل میں لپیٹے وہ جائے نماز پر بیٹھی خدا کے حضور کاسہ پھیلائے ہوئے تھی۔ بریرہ نے ڈسٹرب نہیں کیا اور سکون آمیز انداز میں اس کے فارغ ہونے کے انتظار میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

''السلام علیکم! میں سوچتی تھی۔ ایسی کون سی لڑکی ہوگی جسے بھائی نے اپنایا ہے اور فیصلے پر ڈٹ گئے ہیں۔ ان کے لیے اللہ کا دوسرا انتخاب ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ بہت بخت آور ہیں میرے بھائی! اللہ ان کے نصیب کو مزید روشن کرے اور ان کی مشکلات کو آسان کرے۔ آمین۔''

بریرہ اس کے فارغ ہونے پر اسے کنفیوژن اور ہچکچاہٹ میں مبتلا پا کر خود اٹھ کر اس سے گلے ملی تھی، الفاظ کا جو استعمال تھا وہ کافی تھا عبیر کو اس کے تعارف اور نیچر سے آگاہ کرنے کو۔ عبیر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے عقیدت مندانہ انداز میں بریرہ کا ہاتھ بے ساختگی میں چوما تھا۔

''ذرہ نوازی ہے۔ میں اس تعریف کے قابل نہیں پاتی خود کو۔ بس ذرا سا علم عطا ہوا ہے تو جانا ہے۔ قسمت سے کبھی ایسا بھی ہو جایا کرتا ہے کہ اللہ معلوم دنیا سے ہٹا کر لامعلوم کی دنیا سے بھی علم عطا فرما دیتا ہے۔ مگر اسے حاصل کرنے اور اپنا نصیب بنانے کے لیے ہمارے پاس ایک جھولی ضرور ہونی چاہیے۔ جب تک ہمارے پاس پھیلانے کے لیے اور اپنا نصیب بنانے کے لیے جھولی نہیں ہوگی اس وقت تک وہ نصیحت جو اترنے والی ہے۔ اترے گی نہیں۔ رحمت ہمیشہ وہیں اترتی ہے جہاں جھولی ہو اور جتنی بڑی نعمت

ہو گی۔ اتنا بڑا نعمت کا نزول ہو گا اور مجھے تو دُعاؤں سے بڑا پیار ہے۔ مجھے تو ابھی اور بہت کچھ مانگنا ہے اپنے رب سے۔'' وہ طمانیت سے مسکرائی تھی۔ بریرہ آسودگی کے اس درجہ مظاہرے پر مبہوت رہ گئی۔ ایک وہ تھی۔ جو اس درجہ قانع تھی۔ ایک لاریب تھی۔ سب کچھ حاصل کر کے بھی ناشکرے پن پر آمادہ۔ اس کا دل بھر آیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس نے لاریب کے سیل فون میں عبیر کا میسج پڑھ لیا تھا۔ جسے یقیناً لاریب پڑھ چکی تھی کہ وہ اوپن ہو چکا تھا۔ لاریب کے اچانک فیصلے کے پیچھے کیا وجہ کارفرما تھی۔ اس پر کھل کر اسے خاص خوشی نہیں دے سکی تھی۔ بریرہ وہ ضروری کال بھی نہیں کر سکی۔ جس کی خاطر اس نے لاریب کا سیل لیا تھا۔ اتنا ہی بوجھل ہو گیا تھا اس کا دل۔

سکندر خوش نہیں ہے لُوٹ کر دولت دنیا کی
قلندر دونوں ہاتھوں سے لٹا کر رقص کرتا ہے

''خوش رہو۔ میری دُعا ہے۔ اللہ تمہاری مشکلات کو آسان کرے۔ آمین۔'' وہ اس کا گال سہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ عبیر نے مسکرا کر سلام کیا تھا۔ بریرہ باہر نکلی تو اس جانب آتے عبدالغنی نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔ وہ نرمی سے مسکرا دی۔

''بہت پیاری ہے ماشاء اللہ! لاریب کا خیال ہے دنوں میں نکھری ہے۔ کچھ غلط بھی نہیں کہتی۔ آپ جیسے انسان کی قربت ایسے ہی روشن اور حسین بنا سکتی ہے کسی کو بھی۔'' وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

''ہارون کو پتا چلا کہ تم عبیر سے ملی ہو تو خفا ہو سکتا ہے۔''

''اسی لیے تو پتا نہیں لگنے دیا۔ ذہانت کے قائل ہوں گے میری۔ مگر میں یہاں آ کر اس سے نہ ملتی تو یہ غلط تھا۔ اوہ سوری...... دماغ دیکھیں میرا۔ یہ اس کے لیے لائی تھی۔ آپ دیجیے گا میری طرف سے تحفہ۔ اب اگر گئی تو ہارون کو لازماً پتا چلے گا۔''

وہ سرگوشی میں کہتی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ کی انگلی سے سونے کی انگوٹھی نکال کر تھماتی آگے بڑھ گئی۔ عبدالغنی کچھ کہنا چاہتا تھا، روکنا چاہتا تھا، مگر بریرہ نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ وہ گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

☆......☆......☆

کچھ دن سے تیرے ساتھ کوئی بات نہیں ہے
یوں لگتا ہے صدیوں سے ملاقات نہیں ہے
دکھ درد سنو مجھ سے، مجھے ہر بات بتاؤ
یہ دل کی خواہش ہے میری بات نہیں ہے

لاریب نے جان بوجھ کر یہ نظم عبدالغنی کے نمبر پر سینڈ کی تھی دوبارہ...... کچھ دنوں پہلے جب وہ بہت خفا تھی اس سے، تب اس نے یہی کیا تھا۔ کچھ توقف سے عبدالغنی نے جوابی اظہار بہت خوبصورت انداز میں کیا تھا۔ وہ اس کا جوابی ٹیکسٹ موصول کر کے تمام ناراضی کے باوجود دل سے مسکرائی تھی۔ عبدالغنی نے لکھا تھا۔

آؤ اداس راتوں میں
دل کی بستی میں آ کے دیکھو
ہر اک رستہ، ہر اک کھڑکی
تمہاری چاہت کا منتظر ہے
فلک سے تکتا ہے چاند تم کو
ستارے تم کو بُلا رہے ہیں
تمہاری آمد کے منتظر ہیں
مجھے یقیں ہے تمہارے دل میں
گئے دنوں کے خیال ہیں کچھ
نئے سفر کے ملال ہیں کچھ
نئی رتوں کے سوال ہیں کچھ
اگر یہ سچ ہے تو میری مانو
پرانے رستوں پہ لوٹ آؤ
پرانی بستی میں کوئی اب تک
تمہاری آمد کا منتظر ہے

وہ ایک بار پھر ایسے ہی اظہار کی منتظر تھی، مگر

انتظار انتظار رہا تھا۔ بریرہ اور ہارون واپس جا چکے تھے۔ اُم جان اور بابا جان اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ عبدالغنی وہیں تھا۔ وہ جانتی تھی بات اسی موضوع پر ہو رہی ہو گی۔ اس نے دھیان باہر ہی لگا رکھا تھا۔ جاننا چاہتی تھی۔ عمیر کو بلوایا جاتا ہے یا نہیں۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ عبدالغنی ان کے کمرے سے نکل آیا تھا۔ وہ مضمحل لگتا تھا۔ گرم شال کاندھوں پر پھیلائے برآمدے میں بے خیال ٹہلتا ہوا۔ لاریب سخت مضطرب تھی۔ اسے لگتا تھا اگر عبدالغنی اسے نظر انداز کر کے بیٹھک میں گیا تو وہ اپنی جان لینے میں ایک لمحہ نہیں لگائے گی۔ ہر لمحہ سولی پر لٹکا رہا تھا۔ اور بالآخر جیت اس کی ہوئی تھی۔ عبدالغنی کو کمرے میں داخل ہوتے پا کر اس کے چہرے پر تفاخرانہ مسکان اتر آئی تھی۔ عبدالغنی خاموشی سے جا کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ لاریب نے اپنے لباس پر نگاہ ڈالی۔ جدید تراش خراش کا بے حد اسٹائلش لباس تھا۔ جو اس کی دلکشی اور رعنائی کو مزید اجاگر کر رہا تھا۔ اس نے بال کھول دیے۔ اور برش اٹھا کر انہیں سلجھانے لگی۔ مقصد عبدالغنی کی توجہ حاصل کرنا تھا۔ جب ناکامی ہوئی تو طیش میں بپھرتے ہوئے ہیئر برش ٹیبل پر پٹخ دیا تھا زوردار آواز کے ساتھ۔

''کیا لینے آئے ہیں یہاں آپ......؟'' وہ مٹھیاں بھینچ کر چلائی۔ عبدالغنی چونک کر اسے نافہم نظروں سے تکنے لگا۔

''عبدالغنی اگر آپ یہاں نہ آتے تو میں مر جاتی۔ آپ اگر مجھ سے خفا ہیں تو میں اب بھی مر رہی ہوں۔'' وہ رو پڑی تھی، اس کی برداشت بہت چھوٹی تھی۔ خاص کر عبدالغنی کے معاملے میں۔ عبدالغنی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ لاریب کو بازوؤں سے پکڑا تھا۔ وہ بے اختیار اس کے سینے سے لگ گئی۔

''میں کیسے آپ کو یہ سمجھاؤں عبدالغنی کہ آپ میرے لیے کیا ہیں؟'' وہ جیسے تھک کر سسکنے لگی۔ عبدالغنی نے کچھ نہیں کہا۔ اسے بازوؤں کے حصار میں لیے بستر تک آ گیا۔

''اسی لیے ڈرتا ہوں لاریب! تمہیں دکھ سہنا نہیں آئے گا۔ اتنی محبت وہ بھی غیر اللہ سے......لاریب آزمائش جبھی اترتی ہے، جب یہ محبت جس کا سب سے زیادہ حق اللہ کا ہے۔ کسی اور کے لیے ہو۔ مت چاہو مجھے اتنا۔''

''آپ مجھ سے خفا ہیں، اس لڑکی کی وجہ سے۔ یہ بات برداشت نہیں ہو رہی مجھ سے۔''

''میں جانتا ہوں۔ سب جانتا تھا تمہاری فیلنگز......تمہاری سخت مزاجی...... برہمی میں، بدتمیزی میں بھی میرے لیے محبت چھپی ہوتی تھی۔ تم مجھ سے جھگڑا کرتی تھیں مگر تمہاری آنکھیں اور الفاظ التجا کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے نظر انداز نہ کرو۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ صرف میرے رہو۔ لاریب! حضرت یوسفؑ سے اتنی شدید محبت حضرت یعقوبؑ نے کی تھی۔ اللہ کو پسند نہیں آئی۔ جدائی ڈال دی۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ سنبھل جاؤ۔ جو فیصلے اللہ کے ہوتے ہیں، انہیں تسلیم کر لینے میں ہی بقا ہوتی ہے۔ نہ کریں گے تو ڈنڈے پڑتے ہیں۔ اتنی مار سہہ نہیں سکو گی۔ اللہ گواہ ہے۔ میرا کبھی دوسری شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ یار یقین کر لو، تم ایک کافی تھیں میرے لیے۔ مگر اللہ نے ایسا چاہا اور ایسا ہو گیا، اللہ ہی جانتا ہے۔ اس میں کس کی آزمائش مقصود ہے ہم دونوں میں سے۔ تمہاری یا میری؟ لاریب...... میں خود کو کسی قابل نہیں پاتا۔ مگر میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں۔ اللہ مجھے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق بخشے۔ میں تمہارے لیے بھی دُعا کرتا رہا ہوں۔ اللہ تمہارے دل میں اس مجبور و بے بس لڑکی کے لیے گنجائش پیدا کر دے۔''

''عبدالغنی نے لمحہ بھر کا توقف کیا اور اس کے بال نرمی سے سمیٹ کر پیچھے کرتے ہوئے بہت جذب سے

اس کی بھیگی آنکھوں کو اپنے ہونٹوں سے باری باری چھوا تھا۔اور گھمبیر تر لہجے میں بولا تھا۔

''یُو نُو واٹ لاریب! اللہ اپنے ان بندوں پر آزمائش ڈالتا ہے۔ جو اسے عزیز اور پیارے ہوتے ہیں اور اگر وہ اس آزمائش میں پورے اتر آئیں تو درجات کی بلندی حاصل کرتے ہیں۔ اور جو پورے نہیں اترتے وہ بہت بدنصیب ہوتے ہیں۔ جو اللہ کے دیے موقع کو بربادی اور دنیا کے معمولی اور بے کار فائدوں کی نذر کرکے گھرے اور ناقابلِ تلافی نقصان اپنی جھولی میں ڈال لیتے ہیں۔ میری لاریب ہرگز ہرگز بھی ایسا نہیں کرے گی۔ ہے ناں......؟''

وہ تھم کر تائیدی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ لاریب جو ساکت گم سم تھی۔ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر سسکی سی بھر کے اس کے سینے سے سر ٹیک لیا تھا۔

''یہ بہت مشکل ہے، بہت کٹھن۔ اور میں بہت کم ظرف ہوں مجھے اعتراف ہے۔'' وہ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ عبدالغنی نے اس کا سر سہلایا تھا۔

''اللہ سے ظرف مانگو لاریب! وہی عطا فرمانے والا ہے۔ فارسی کا ایک شعر ہے۔ اور بہت خوب ہے کہ

ایمان چوں سلامت بہ لب گور بہ یم
احسنت بریں چستی و چالاکی ما

اگرچہ ایمان کو لب گور (قبر) تک سلامتی کے ساتھ لے گئے تو اس وقت اپنی چستی و چالاکی کی تعریف کریں گے۔ جب تک زندگی ہے۔ خطرہ موجود ہے۔ جب تک کشتی طوفان میں ہے۔ مطمئن ہو جانا نادانی ہے۔ عارفوں کی شان یہی ہے کہ کوشش کرتے رہیں۔ اور ڈرتے رہیں اور ڈراتے رہیں۔ یہی ڈرنا ولایت و بزرگی کی نشانی ہے۔ اگر ڈر نکل گیا تو ولایت و بزرگی بھی ختم ہوئی۔'' وہ بہت نرمی، بہت رسان سے کہہ رہا تھا۔ لاریب اب بھی کچھ نہیں بولی۔ نم آنکھیں جھپکتی رہی۔

''میں پھر کہوں گی۔ یہ سب آسان نہیں، بس آپ دُعا کرتے رہیں گے میرے لیے اور مجھے وقت بھی دیں۔'' اس نے عبدالغنی کو تسلی دینے کی خاطر کہا تھا۔

''شیور، کیوں نہیں۔ وقت ضرور ملے گا میری جان! اور سنو۔ کوئی بھی کام ہرگز مشکل نہیں ہوتا۔ بس اسے کرنے کی نیت اور عزم ہونا ضروری ہے۔ زندگی مشکل نہیں ہے جتنی خواہشات کے آئینے میں نظر آتی ہے۔ بس خواہش کو قابو کرنا آجائے۔ خود کو اپنے رب کے تابع کرنا سیکھ لو۔ اپنی خواہش کو اپنے حاصل کے تابع کر دو۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اس میں دیکھا جائے تو کچھ مشکل بھی نہیں۔ کیا ہم اپنی خواہش سے پیدا ہوئے تھے؟ اگر نہیں تو اپنی خواہش کے غلام بن کر جینا کیوں چاہتے ہیں۔ اپنی زندگی کو اپنے رب کی رضا کے مطابق گزاریں تو دونوں جہاں میں کامیابی و کامرانی حاصل کریں گے۔ آدم کو جنت میں کس چیز کی کمی تھی؟ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ لیکن شیطان نے خواہش پیدا کر دی کہ اس درخت کا پھل چکھنا ہے۔ تو کیا ہوا؟ گناہ سرزد ہو گیا۔ اگر کوئی خواہش ضرورت کے طابع نہیں تو وہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہی خواہش تم سے تمہاری جنت تو چھینے ہی......تم سے تمہارے رب کی رضا بھی چھین کر ناراضی کو مسلط کر دے۔ اس لیے بہت بھلائی ہے اس میں کہ اپنی خواہشات اور نفس کو کنٹرول کرلو۔ اسے لگام دے لو۔'' عبدالغنی نے نصیحت کی تھی۔

لاریب نے مسکرا کر سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ عبدالغنی یہ سوچ کر مطمئن ہوا تھا کہ اس کی باتوں میں سے کسی نہ کسی نے ضرور اس کے دل پر اثر کیا ہوگا جبکہ اس کے برعکس لاریب سوچ رہی تھی۔ عبدالغنی کو جب وہ بات پتا چلے گی کہ وہ عبیر کی کس شرط پر واپس آئی ہے، تو اس کا ردعمل کیا ہوگا، کیا وہ پھر بھی اسی ضبط کا مظاہرہ کر سکے گا؟

............☆............☆............

اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ مارچ میں ملاحظہ فرمائیے۔

افسانہ

معصومہ منصور

اُمید کی پری

”کتنی مرتبہ سمجھایا ہے...... رات کے جھوٹے برتن مت رکھا کرو۔ بہت سخت گناہ ہوتا ہے۔ برتن اس طرح ناپاک ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی کتا منہ مار گیا ہو۔“ انہوں نے لاٹھی رات کے رکھے پتیلوں پر ماری۔ اس کا جھکا سر مزید جھک گیا۔ جیسے اس سے واقعی کوئی بہت بڑا......

ایک دوشیزہ کی امید اور یقین سے جڑا، ایک خاص فسانہ

ساتھ والے گھر سے آتی تیز آوازوں پر صحن میں جھاڑو لگاتی فضا نے دائیں جانب موجود دیوار کی سمت دیکھا۔ دونوں گھروں کو یہی دیوار جدا کرتی تھی۔ ارم کا اکثر ہی اپنی ساس کے ساتھ جھگڑا ہوتا رہتا تھا اور آوازیں اس قدر بلند ہوتیں کہ پورا محلّہ سنتا۔ بے اختیار اس نے گردن اُٹھا کر چھتوں اور کھڑکیوں سے جھانکتی آنکھوں کو دیکھا اور تاسف سے سر ہلایا۔ جہاں اسے فضا کی فکر ہوئی وہیں اسے ایک انجانی شرمندگی نے آ گھیرا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے جھاڑو مکمل کرنے لگے۔ سارا کچرا سمیٹ کر اس نے بیرونی دروازے کے قریب رکھے کچرادان میں ڈالا اور جھاڑو بھی وہیں رکھ کر کچھ فاصلے پر لگے نل کے قریب جا بیٹھی۔ جہاں برتنوں کا ڈھیر لگا تھا۔ باورچی خانے میں چونکہ پانی کا انتظام نہ تھا اس لیے وہ برتن سمیٹ کر صحن میں لگے نل کے نیچے جمع کر دیتی اور صفائی سے فارغ ہونے کے بعد انہیں دھوتی۔

اب بھی وہ رگڑ رگڑ کر برتن چمکانے میں مصروف تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک آوازوں میں اُلجھا تھا جو آہستہ آہستہ ہوتے ہوتے اب معدوم ہو گئی تھیں۔

ٹک ٹک کی آواز پر اس نے زیتون بی بی کو لاٹھی کے سہارے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے منے قطرے چمکنے لگے۔ حالانکہ بادل چھائے تھے اور خوشگوار ہوا کے جھونکوں نے گرمی کی شدت کو ختم کر دیا تھا۔ زیتون بی بی قریب پہنچ گئیں وہ لرزتے ہاتھوں سے صابن لگے برتن دھو دھو کر اسٹیل کے بڑے سے چھلنے میں رکھنے لگی۔

”کتنی مرتبہ سمجھایا ہے...... رات کے جھوٹے برتن مت رکھا کرو۔ بہت سخت گناہ ہوتا ہے۔ برتن اس طرح ناپاک ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی کتا منہ مار گیا ہو۔“ انہوں نے لاٹھی رات کے رکھے پتیلوں پر ماری۔ اس کا جھکا سر مزید جھک گیا۔ جیسے اس سے واقعی کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو۔

”پتا نہیں کب ڈھنگ آئے گا تمہیں؟ لگتا ہے

تمہیں سلیقہ سکھاتے سکھاتے میں قبر میں پہنچ جاؤں گی۔'' وہ صحن میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگیں اور پھر جیسے صفائی سے مطمئن ہو کر واپس اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ اور وہ چاہ کر بھی نہ کہہ پائی کہ کل اس کی دونوں شادی شدہ نندوں اور ان کے بچوں کے فرمائشی پروگرام پورا کرتے کرتے، بچوں کی پھیلائی چیزیں سمیٹتے سمیٹتے، سارا دن گزر گیا اور رات تک وہ اس قدر تھک گئی کہ بریانی اور سالن کے پتیلے دھونے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس لیے اس نے انہیں پانی ڈال کر بھگو دیا تھا تاکہ صبح آسانی سے دھل سکیں۔ پر وہ کیسے کہتی؟ وہ ارم تھوڑی تھی جو اپنی ساس کو ترکی بہ ترکی جواب دیتی تھی۔ وہ تو فضا تھی۔ جسے خاموشی اور صبر کا سبق گھٹی کے ساتھ ہی دیا گیا تھا۔

سات سال کی تھی جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کے والدین کی وفات ہو گئی۔ اس کی پرورش اس کی دادی نے کی جو وقتاً فوقتاً اسے سمجھاتی رہتیں کہ تایا، تائی نے اسے رکھ کر اس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اس لیے اگر کبھی اس کی تائی کچھ کہہ بھی دیں تو خاموشی سے سن لینا ہے۔ کبھی پلٹ کر جواب نہیں دینا اور ان کے چاروں بچے جو اس سے چھوٹے تھے، سے کبھی جھگڑا نہیں کرنا۔ دادی کی یہ نصیحتیں اس کے ننھے دماغ میں اس طرح بیٹھیں کہ وہ ساری عمر اپنے ساتھ ہونے والی کسی زیادتی پر بھی نہ بول سکی۔ میٹرک کے بعد اس کی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا گیا، اور پھر اس کے لیے آنے والے پہلے ہی رشتے کو اس کی خوش نصیبی سمجھتے ہوئے دادی نے اس کی شادی علی سے کر دی۔ ایک میٹرک پاس لڑکی کے لیے میٹر ریڈر سے بہتر کس کا رشتہ آئے گا بھلا؟ خوش شکل تھی، مگر خواب اونچے نہ تھے اس لیے اس کے دل و دماغ نے بخوشی و رضا مندی علی اور اس کے خاندان کو قبول

کرلیا۔
برتن دھونے کے بعد چھلنا اُٹھا کر وہ کچن میں رکھ آئی اور جھاڑو سے نل کے نیچے کا حصہ دھونے لگی۔ پھر وہیں صابن دانی میں رکھے ایک صابن سے منہ ہاتھ دھونے کے بعد اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں سامنے دیوار پر لگے کلاک میں اُس نے ٹائم دیکھا۔ صبح کے دس بجے تھے۔ دو بجے علی کھانا کھانے گھر آتا تھا اور ساتھ ہی اس کی چھوٹی نند 'روبی' کالج سے لوٹتی تھی۔ سالن رات کا بچا رکھا تھا۔ اسے صرف روٹی بنانی تھی اور ابھی خاصا وقت تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر میز پر رکھا کاغذ قلم سنبھال لیا۔ اور کل جو اس نے کہانی شروع کی تھی، وہ مکمل کرنے لگی۔ اس نے کبھی اپنی کوئی تحریر کسی ڈائجسٹ میں نہیں بھیجی تھی۔ کیونکہ اسے لگتا تھا کہ وہ اچھا نہیں لکھتی۔ بس شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی۔ کاغذ قلم ہر وقت اس کی میز پر رکھا رہتا۔

☆......☆......☆

سالن چیک کرنے کے بعد اس نے چولہا بند کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ وہ کچن سے نکل کر تیزی سے دروازے کی سمت بڑھی۔
''ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟'' ارم نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
''بس چادر ہی تو لینی ہے۔'' ''تم بیٹھو۔ وہ ارم کو صحن میں بچھے پلنگ پر بیٹھنے کا کہہ کر خود زیتون بی بی کے کمرے میں آ گئی۔
''دیکھو تھیلا، گھر سے لے کر جانا، میرا بیٹا کتنی محنت سے روپے کماتا ہے، وہ یوں پانچ پانچ روپے کر کے تھیلوں پر ضائع کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ مگر تم جیسی بدسلیقہ عورتوں کو کیا خبر؟ خون پسینے کی کمائی کیسے استعمال کی جاتی ہے۔ تمہیں تو بس خرچ کرنے سے مطلب۔'' انہوں نے اس کے بازار جانے کا سُن کر تکیے کے نیچے سے اپنا بٹوہ نکالتے ہوئے کہا۔
وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔
''دھیان سے خرچ کرنا۔'' انہوں نے چند نوٹ اس کی جانب بڑھائے۔
''جی۔'' اس نے اختصار سے کہا اور باورچی خانے سے تھیلا لے کر صحن میں آ گئی اور تار پر لٹکی چادر کو اچھی طرح لپیٹا۔ دونوں خاموشی سے گھر سے باہر نکلیں۔

☆......☆......☆

ارم سے اس کی پہلی ملاقات شادی کے کچھ بعد ہوئی تھی۔ وہ اس کی ہم عمر تھی اور اس کے والدین بھی بچپن میں وفات پا گئے تھے۔ دونوں کے حالات زندگی بھی ایک جیسے ہی تھے جو دونوں کو قریب لے آئے۔ ارم کو چپ چپ رہنے والی فضا پسند آئی تھی تو فضا کو ہر وقت ہنسنے ہنسانے والی ارم سے انس محسوس ہوا تھا۔ پھر دو سال بعد جب اس کی ساس گھٹنوں کے درد سے مجبور ہو کر باہر آ جانہ سکیں تو سودا لانے کی ذمہ داری بھی فضا کو نبھانا پڑی۔ ایسے میں ارم نے اس کا خاصا ساتھ دیا۔ اب دونوں اکٹھی بازار جاتیں اور ہفتہ بھر کا سامان خرید لاتیں۔
''آخر تم انہیں کوئی جواب کیوں نہیں دیتیں؟ وہ صرف ان کا بیٹا ہی نہیں، تمہارا شوہر بھی ہے۔ اس کی کمائی پر تمہارا بھی کچھ حق ہے۔'' ارم نے گلی سے نکلتے ہی کہا۔ ارم نے یقیناً ان کی باتیں سُن لی ہوں گی۔ اسے شرمندگی نے آ گھیرا۔
''کوئی بات نہیں۔ وہ بڑی ہیں۔'' وہ منمنائی۔
''بڑے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں، کہ انسان جو دل میں آئے کہہ ڈالے۔'' انہوں نے دائیں جانب مڑ کر سڑک پار کی۔
'آج کتنی گرمی ہے ناں۔'' اس نے بات بدلنے کے لیے کہا اور تیز تیز چلنے لگی۔

''ہاں واقعی! سورج نے تو آج سب کچھ جلانے کی ٹھان لی ہے حالانکہ کل موسم کتنا اچھا تھا۔ اور آج اُف۔'' ارم نے چادر سے چہرے پر آیا پسینہ صاف کیا اور اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔

دو گلیاں مزید چلنے کے بعد وہ دونوں ایک میدان میں داخل ہو گئیں۔ جہاں جمعہ بازار لگا تھا۔ شدید گرمی کے باوجود بازار میں بے حد رش تھا۔ گرمی ہو یا سردی لوگوں کا خریداری کا جنون کبھی ماند نہیں پڑتا۔ بڑی مارکیٹیں ہوں یا ایسے ہفتہ وار لگنے والے بازار، ہمیشہ بھرے ہی نظر آتے ہیں۔ جلدی جلدی کرتے بھی اپنی مطلوبہ چیزیں خریدتے انہیں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔

بازار سے نکل کر کچھ دور چلنے کے بعد ارم ایک جگہ سایہ دیکھ کر بیٹھ گئی۔ تو فضا کو بھی اپنا تھیلا زمین پر رکھ کر اس کے برابر بیٹھنا پڑا۔

''یار کل تو وہ سنائیں ناں...... کہ بڑی بی کے چھکے ہی چھڑا دیے۔'' ارم نے ہنس کر بتایا۔

''بہت بری بات ہے ارم۔'' اس نے سرزنش کی۔

''کیا بری بات ہے؟ وہ بات بے بات طعنے دیتی رہیں اور میں کچھ بھی نہ کہوں۔''

''وہ بڑی ہیں ہماری۔ اگر کبھی کچھ کہہ بھی دیتی ہیں تو کیا ہوا۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''کچھ ناں! اگر کچھ کہیں تب ناں۔ وہ تو شروع ہو جاتی ہیں تو رُکتیں ہی نہیں۔ ناں میرے ماں، باپ کو بخشتی ہیں ناں بہن بھائیوں کو۔ پھر میں کس خوشی میں لحاظ کروں۔'' ارم کی آواز میں غصہ تھا۔

وہ اکثر فضا کو اپنی ساس کے ساتھ ہونے والی جنگ میں اپنے کارنامے بتاتی رہتی تھی۔ فضا اسے سرزش کرتی مگر ارم پر ذرا اثر نہ ہوتا۔ الٹا وہ اسے سمجھانے لگتی۔

''اب کل ہی دیکھ لو، صبح کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر میں ذرا دیر کے لیے ہی لیٹی تھی کہ ان کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ باہر آئی تو پتا چلا کہ نیہا زمین پر کشن رکھ کر کھڑی ہوئی اور میز پر رکھا کانچ کا گلدان گرا دیا۔''

''اوہ...... اسے چوٹ تو نہیں آئی۔'' وہ فکر مند ہوئی۔

''یہی تو بات ہے ساری، انہیں یہ فکر نہیں کہ بچی کو چوٹ تو نہیں لگی؟ یقین کرو انہوں نے ایک بار بھی نیہا کو اٹھا کر نہیں دیکھا۔ بس مجھ پر چیخنے کا موقع مل گیا تھا انہیں۔''

''تو تم اسے ساتھ لے کر لیٹا کرو ناں۔''

''یار نیہا صرف میری بیٹی ہی تو نہیں، ان کی پوتی بھی تو ہے۔ ویسے تو وہ سارا دن کچھ کرتی نہیں۔ کیا بچی کو بھی نہیں دیکھ سکتیں؟ مگر ان سے تو میرا آرام کرنا برداشت نہیں۔ چار نندیں ہیں میری، مجال ہے جو کوئی تھوڑا سا بھی ہاتھ بٹوا دیں، وجہ یہ کہ جی چھوٹی ہیں ابھی، پڑھ رہی ہیں، دنیا کی اور بھی تو لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ کیا فائدہ ایسے جوائنٹ فیملی سسٹم کا۔'' ارم خاصے غصے میں آ گئی تھی اس لیے فضا نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

''مگر میں نے بھی...... وہ سنائی ہیں کہ کچھ دن تو اب سکون سے گزریں گے۔'' وہ مسکرائی تو فضا کے سامنے چھتوں اور کھڑکیوں سے جھانکتی آنکھیں آ گئیں۔ اس نے جھرجھری سی لی۔

''میری مانو تو تم بھی خاموشی اور صبر کی دیوی بن کر مت رہا کرو۔ تمہیں تو اٹھارویں صدی میں ہونا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے تب ان خوبیوں کو تعریف کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو، مگر آج کل کوئی نہیں سمجھتا۔ کوئی خود سے آپ کا حق نہیں دیتا، بلکہ چھیننا پڑتا

ہے۔ یہ صبر، ایثار، قربانی تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔''

''میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے، کافی دیر ہوگئی۔'' فضا اس کی باتوں سے گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

پھر دونوں باقی راستہ خاموش رہیں۔

☆......☆......☆

گھر میں قدم رکھتے ہی اسے زرقا خالہ کے ساتھ بیٹھی نظر آئی۔ اس کے بچے صحن میں گیند سے کھیل رہے تھے۔

''السلام وعلیکم۔'' اسے دیکھ کر زرقا نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور تھیلا پلنگ پر رکھ کر باقی پیسے اپنی ساس کو تھما دیے۔

''کیا لائیں ہیں آج، آہا کریلے۔'' زرقا نے تھیلے میں جھانکا۔

''محمود کافی دنوں سے کریلے پکانے کی فرمائش کررہے ہیں۔ آج تو آپ قیمہ کریلے پکائیے گا۔''

زرقا کی بات پر فضا نے شدید تھکن اپنے رگ وپے میں اُترتی محسوس کی۔

''بی بی! تمہارے میاں فرمائش کررہے ہیں تو تم ان کی فرمائش پوری کرو ناں۔'' اس نے سوچا۔

''بھابی محمود شام میں آئیں گے۔ سالن شام میں پکائیے گا۔ ابھی تو جو ہے لے آئیے۔ بچ سخت بھوک لگی ہے۔'' فضا نے پھر کہا۔

''بس ابھی پانچ منٹ! گرم گرم روٹی بناتی ہوں۔'' اس نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

''بہو! روٹیاں زیادہ بنالینا۔ ابھی فضیلہ اور اس کا میاں بھی آتے ہی ہوں گے۔'' زیتون بی بی بولیں۔

''جی اچھا۔'' اس نے کمرے میں جاکر چادر اُتاری اور باورچی خانے میں آ گئی۔

''کل ہی تو سب آئے تھے۔ اتنا سب کچھ بنایا تھا کہ تھکن ابھی تک نہیں اُتری اور آج پھر۔'' اس نے روٹیاں بناتے ہوئے سوچا۔ ارم کے دیے گئے لیکچرز کے زیر اثر اس میں اتنی ہمت تو نہیں آئی تھی کہ پلٹ کر جواب دیتی البتہ اس کی سوچیں ضرور باغی ہونے لگیں تھیں۔

فضیلہ آئی تو سب زیتون بی بی کے کمرے میں چلے گئے۔

اس نے روٹیاں بنا کر ساتھ والے کمرے میں دسترخوان لگایا اور سب کو بلانے زیتون بی بی کے کمرے میں گئی۔ وہ سب بحث میں اُلجھی تھیں۔ اسے دیکھ کر ایک دم خاموش ہوگئیں۔ اس نے محسوس تو کیا مگر ہمیشہ کی طرح خاموش رہی۔ اور پھر ایسا روز ہونے لگا۔ اس کی نندیں آتیں زیتون بیگم کے کمرے میں چلی جاتیں۔ نجانے کون سی میٹنگز ہونے لگی ہیں؟ اسے تجسس نے آ گھیرا اور پھر یہ تجسس زیادہ دن برقرار نہ رہ سکا۔

اس دن شب برأت تھی۔ اس کی دونوں نندیں صبح سے آئی ہوئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد اس نے کچن سمیٹا اور بچوں کا پھیلایا ہوا۔ پھلجڑیوں اور کاغذ کا کچرا سمیٹ کر وضو کرکے کمرے میں آ گئی۔ اس کا ارادہ، تمام رات عبادت کا تھا۔ علی بیڈ پر بازو آنکھوں پر رکھے سیدھا لیٹا تھا۔ ابھی وہ جائے نماز بچھا رہی تھی کہ اس نے علی کی آواز سنی۔

''ہیلو...... اِدھر آؤ۔'' وہ اُٹھ بیٹھا۔

''جی۔'' وہ جائے نماز کا کنارا موڑ کر اس کی طرف آئی۔

''یہاں بیٹھو۔'' اس نے بیڈ کی سمت اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

''میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے

نارمل سے انداز میں فضا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ فضا کو لگا جیسے کسی نے اس کے اعصاب پر بم دے مارا ہو۔ اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور بے یقینی سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''ہماری شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں۔ مگر کوئی بچہ نہیں، مجھے اولاد چاہیے۔ میں اسے الگ گھر میں رکھوں گا۔ تم ایسے ہی رہنا جیسے اب رہ رہی ہو۔'' وہ اس کے احساسات کی پروا کیے بغیر بولتا جا رہا تھا۔

''مجھے یقین ہے...... تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' اس نے اپنی بات مکمل کرکے اس کی جانب دیکھا۔ کچھ لمحہ اس کے بولنے کا انتظار کیا، پھر بیڈ کی دوسری جانب کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ وہ کسی بت کی مانند اس کی کمر کو تکتی رہی۔

الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ؟ جو اس کے کانوں میں انڈیلا گیا تھا۔ بھلا اسے کیسے تکلیف نہ ہوتی۔ پانچ سال پہلے وہ جس شخص سے نکاح کے بندھن میں باندھ دی گئی تھی۔ تب سے لے کر اب تک وہ اپنے سب خواب، سب خواہشات اسی ایک شخص سے وابستہ کرتی آئی تھی۔ پانچ سال اس نے صرف اس شخص کی وجہ سے اس کے گھر اور گھر والوں کی دن رات خدمت کی تھی۔ زبان پر ایک لفظ ملامت لائے بغیر۔ کیا ملا تھا اس کے بدلے اسے۔ اتنا صبر، ایثار، قربانی کس کام آئی تھی اس کے؟ دادی، تایا نے تو شادی کے بعد مڑ کر خبر تک نہ لی تھی۔ ان کے لیے وہ صرف ایک بوجھ تھی۔ رشتوں کے نام پر بچا ہی کیا تھا۔ اس کے پاس؟ آپ کے پاس صرف ایک ہی چیز ہو۔ جو آپ کی متاعِ حیات ہو۔ وہ بھی چھین کر کسی اور کو دی جا رہی ہو اور کہا جا رہا تھا کہ یقین ہے تمہیں اعتراض نہ ہوگا؟ تمہیں تکلیف نہ ہوگی؟ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ وہ چلا چلا کر بتانا چاہتی تھی کہ ''اسے اعتراض ہے۔ اسے تکلیف بھی ہوئی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں موجود اس واحد رشتہ کو نہیں کھونا چاہتی۔ مگر کہے تو کس سے کہے۔ جس سے وہ کہنا چاہتی تھی۔ جو اس کی اُمیدوں کا واحد مرکز تھا۔ وہ تو کروٹ لیے بہت سکون سے سو رہا تھا۔''

وہ تیزی سے اُٹھی جائے نماز کا کونا سیدھا کیا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ وہ اپنی سب باتیں، سب فریادیں اس کے سامنے کرنے لگی جو سب کی سُنتا ہے اور کسی کو مایوس نہیں کرتا۔

☆......☆......☆

صبح ناشتہ بنانے کے بعد وہ سوگئی۔ صفائی اس کی نندرولی نے کرلی تھی کیونکہ آج اسے کالج سے چھٹی تھی۔ ابھی اسے سوئے گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ کسی نے بے دردی سے اس کی چادر پکڑ کر کھینچی۔ وہ خوف زدہ سی اُٹھ بیٹھی۔ سامنے اس کی چادر ہاتھوں میں پکڑے ارم کھڑی قہقہے لگا رہی تھی۔

''بڑے گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی ہو آج، طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ اُٹھ بیٹھی اور بیڈ پر پڑا دوپٹا اُٹھا کر اوڑھ لیا۔

''بیٹھو۔'' اس نے پاؤں سکیڑ کر بیڈ پر اس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

''خیریت تو ہے ناں۔'' آنکھیں کیوں اتنی سُرخ ہو رہی ہیں؟'' ارم اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''ہاں...... وہ سوئی نہیں ناں۔ تمام رات عبادت کرتی رہی۔ شاید اس لیے۔'' اس نے نظریں چُرا کر کہا۔ کیسے بتاتی کہ وہ ساری رات روتی رہی ہے۔ اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر۔

''اوہ...... پھر تو میں نے غلطی کردی تمہیں اُٹھا کر۔'' وہ شرمندہ ہوئی۔

''کوئی بات نہیں۔'' فضا مسکرائی۔

''اصل میں صبح صبح ردا سے جھگڑا ہوگیا۔ تو موڈ

خراب تھا۔ میں نے سوچا تم سے گپ شپ لگا آؤں۔"

"کیوں اب کیا ہوا؟" اس نے ہاتھوں سے بال سمیٹے اور چٹیا کا جوڑا بنایا۔

"چھوڑو یار۔ یہ تو روز کا معاملہ ہے اور اصل فساد کی جڑ...... تو وہ ہیں، ان کی والدہ...... جو انہیں سمجھاتی نہیں۔ بڑھیا مرے گی تبھی جان چھٹے گی۔"

اس نے بیڈ سے اُٹھ کر کمرے کا چکر لگایا اور میز کے قریب رُک گئی۔

"اوہ۔" فضا کی روح تک کانپ گئی۔ بے شک اسے بھی اپنے سسرال سے بہت سی شکایات تھیں۔ مگر وہ کسی انسان کے مرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتی اور بددعا کرنا تو بہت دور۔

"یار سنا ہے۔ شب برأت کو جن لوگوں نے اس سال مرنا ہو ان کے نام کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔" ارم نے میز کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر کاغذ قلم اٹھایا۔

"توبہ کرو۔ ارم کیسی باتیں کر رہی ہو آج۔" اس نے پریشانی سے کہا۔

"چلو آؤ۔" آج پرچیاں ڈال کر چیک کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ پہلے میں مروں گی یا میری ساس۔"

"او خدایا، او پاگل لڑکی یہ کیا طریقہ ہے بھلا۔" وہ جلدی سے بیڈ سے اُتر کر آئی اور اس کے ہاتھ سے قلم کاغذ لے لیا۔

"لو ڈرپوک لڑکی...... پرچیوں سے تھوڑی...... کسی کے مرنے جینے کا پتا چلتا ہے۔ یہ راز تو خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔" ارم نے اس کے ہاتھ سے کاغذ قلم جھپٹا اور پرچیاں بنانے لگی۔ فضا بے حد حیرت سے اسے تکنے لگی۔

"ویسے بھی مجھے پتا ہے۔ پہلے میری ساس ہی مریں گی۔ میری ابھی عمر ہی کیا ہے بھلا...... ابھی بہت سے خواب ہیں میرے، جنہیں پورا ہونا ہے۔"

اس نے پرچیوں پر نام لکھے اور بند کر کے میز پر اچھال دیا۔

"لو اب ایک پرچی اٹھاؤ۔"

"میں...... میں کیوں اٹھاؤں۔" وہ کچھ خوفزدہ ہوگئی۔

"یار تم مجھ سے زیادہ اچھی انسان ہو۔ صبر، ایثار، قربانی کا پتلا ہو۔ اور پھر تم نے ساری رات عبادت بھی تو کی ہے۔ یقیناً تم صحیح پرچی اٹھاؤ گی۔"

"نہیں جی...... شکریہ۔ مجھے تمہارے اس فضول کھیل میں شامل نہیں ہونا۔" اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ اسے ڈرتا دیکھ کر ارم نے قہقہہ لگایا اور پھر خود ہی ایک پرچی اٹھالی۔ پرچی کھولتے ہی اس کے قہقہوں کو بریک لگ گئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ارم نے کوئی جواب نہیں دیا؟ اس کی نظریں ہاتھ میں پکڑی پرچی پر ساکن تھیں۔ فضا نے ہاتھ بڑھا کر پرچی لے لی۔

پرچی پر ارم لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر فضا کو سانپ سونگھ گیا۔ کمرے میں ایک دم ہی گہرا سناٹا چھا گیا۔

"فضول...... سب بکواس ہے یار۔" اس نے پرچی پھاڑ دی۔ ارم نے شانے اچکائے۔

"چلو چھوڑو...... اس بکواس کو...... آؤ تمہیں لطیفہ سناتی ہوں۔" فضا نے مسکراتے ہوئے ارم کی جانب دیکھا اور لطیفہ سنانے لگی۔ لطیفے پر دونوں خوب ہنسیں پھر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔

کچھ دیر بعد صحن میں شور سنائی دیا تو وہ باہر نکل آئیں۔ فضا کی دونوں نندیں اکٹھی آئیں تھیں، ارم نے انہیں سلام دعا کی اور پھر آنے کا کہہ کر چلی گئی۔

اس کی دونوں نندیں کمرے میں چلی گئیں۔ جہاں

زیتون بی بی اور روبی پہلے سے موجود تھیں۔ بچے صحن میں کھیلنے لگے۔ فضا چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ وہ چائے کپوں میں ڈال رہی تھی کہ اس نے علی کی آواز سنی۔ وہ بچوں سے مل رہا تھا۔ پھر وہ بھی کمرے میں چلا گیا۔ فضا نے مزید ایک کپ کا اضافہ کیا اور ٹرے اٹھا کر کمرے میں لے گئی۔ وہاں سب اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ فضا کو تو کم از کم ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کر وہ پلنگ پر آ بیٹھی اور صحن میں کھیلتے بچوں کو بیزاری سے دیکھنے لگی۔

''اچھا تو یہ تھا وہ کام، جس کے لیے دن رات میٹنگز ہو رہی تھیں؟ تو یہ سب مل کر میرے علی کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہیں؟ اس کی دوسری شادی کروانا چاہتی ہیں؟ نندیں اور ساس ازل سے ہی بہو کی دشمن چلی آرہی ہیں...... تو پھر اب کیسے یہ رواج بدل سکتا ہے۔ وہ جیسے جیسے سوچ جارہی تھی۔ ویسے ویسے ان سب کے لیے نفرت محسوس کررہی تھی۔ جبھی ارم کے گھر سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔

''شاید...... ارم کا پھر جھگڑا ہوا ہے۔'' اس نے سوچا۔

''اچھا کرتی ہے ارم...... لڑ جھگڑ کر کم از کم اپنے دل کا بوجھ تو ہلکا کرلیتی ہے۔ ورنہ اتنی خدمت اور جی حضوری کا کیا صلہ ملتا ہے۔

اب چیخیں رونے کی آوازوں میں بدل گئیں تھی۔ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ آہستہ آہستہ آوازیں بڑھتی جارہی تھیں۔ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ وہ اپنے کمرے سے چادر اوڑھ کر آئی اور بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ بہت سے لوگ ارم کے گھر آ جا رہے تھے۔ وہ پریشانی سے اندر داخل ہو گئی۔ اور پھر ساکت کھڑی رہ گئی۔ اندر کے منظر نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا تھا۔ ارم کی ساس نندیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں اور ان کے سامنے ارم کا

بے جان وجود پڑا تھا۔ جسے سفید چادر سے ڈھانپا گیا تھا۔ صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔

''یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ اس سے مل کر آئی تھی۔ جب اس کے والدین کی وفات ہوئی تھی تب وہ چھوٹی سی تھی۔ اسے خبر نہ تھی کہ مرنا کسے کہتے ہیں؟ مگر اس لمحے اسے شدت سے موت کی سفاکی کا علم ہوا تھا۔ کس طرح ہماری نظروں کے سامنے سے چلتا پھرتا انسان ایک دم ہی چلا جاتا ہے۔ دور بہت دور۔ وہ صدمے سے دو قدم پیچھے ہٹی اور دیوار کا سہارا لیا۔

''ویسے پتا ہے مجھے...... پہلے میری ساس ہی مریں گی۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی بہت سے خواب ہیں میرے جنہیں پورا ہونا ہے۔'' اس کے کانوں میں ارم کی ہنستی ہوئی آواز آنے لگی۔ آنسو شدت سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر غور سے ارم کے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر قریب بیٹھی روتی ساس کو، کہیں اسے دھوکا تو نہیں ہوا۔

جس طرح بعض چیزوں کے جانے کے بعد انسان کو ان کی قدر کا احساس ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح بعض انسانوں کی کمی اور اچھائی ان کے مرنے کے بعد ہی محسوس ہوتی ہے۔

اس نے اپنی چادر کا کونا سختی سے مٹھی میں دبا کر ضبط کرنے کی کوشش کی تھی اور آنسو پونچھتی بے جان قدموں سے واپس لوٹ آئی۔ ابھی وہ زیتون بی بی کو بتانے کے لیے کمرے کی جانب بڑھ ہی رہی تھی کہ اندر سے آتی آوازوں نے اسے باہر ہی رُکنے پر مجبور کر دیا۔

''بھیا ہیرا ہیں ہماری بھابی ہیرا...... چراغ لے کر بھی ڈھونڈو گے تو...... ایسی بیوی نہیں ملے گی۔'' یہ اس کی منجھلی نند کی آواز تھی۔

''اور کیا علی...... اتنے سال ہوگئے۔ ہمارے آنے پر کبھی اس کے ماتھے پر ایک شکن تک نہ پڑتی دیکھی۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے ملتی ہے۔ اور سر جھکائے کام میں لگی رہتی ہے۔'' یہ اس کی بڑی نند کی آواز تھی۔

''میں تو سارا دن کالج اور پڑھائی میں لگی رہتی ہوں۔ پورا گھر وہی سنبھالتی ہیں۔ وہ نہ ہوں تو امی جان کی اتنی دیکھ بھال کیسے ہو۔'' روبی نے کہا۔

''اور ہاں یاد آیا...... یہ لو۔'' بڑی نند نے بیگ سے ایک خاکی لفافہ نکال کر علی کی سمت بڑھایا۔

''یہ اس ٹیسٹ کی رپورٹ ہے۔ جو کچھ دن پہلے بھابی میرے ساتھ جا کر کروا آئی تھیں۔ پازیٹو ہے۔'' علی نے کانپتے ہاتھوں سے رپورٹ تھامی اور کھول کر پڑھنے لگا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ چاہ کر بھی کچھ بول نہ پایا۔ سب کے چہرے مسکرانے لگے۔

''لو دیکھ لو بیٹا...... اللہ نے سن لی اس غریب کی۔ اب آئندہ تم نے کبھی بہو کی حق تلفی کی یا دوسری شادی کا سوچا تو پھر ہم سب کو بھول جانا۔'' زیتون بی بی کی آواز میں سختی تھی جو ان کے ارادے کی پختگی کا پتا دے رہی تھی کہ جو وہ کہہ رہی ہیں کر بھی گزریں گی۔

فضا کو اپنی کچھ دیر پہلے کی سوچوں پر شرمندگی ہونے لگی۔ بعض اوقات انسان ہماری امیدوں پر پورا نہیں اُترتا۔ وہ ہمارے صبر، ایثار، قربانی کے بدلے وہ صلہ نہیں دے پاتا جس کی ہمیں اس سے توقع ہوتی ہے۔ مگر ہمیں ناامید ہونے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ ایک ذات ایسی ہے جو ہمارے سب جذبوں کو دیکھتی ہے۔ ہماری ہر بات سنتی ہے۔ اور اس نے ہمارے ہر عمل کا پورا پورا بدلا دینے کا وعدہ کیا ہے۔

اس نے اوپر آسمان کی جانب دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور دستک دے کر اندر داخل ہوگئی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

نکہت غفار

دوراہا

''نرگس آپا...... یہ آپ کی کیسی محبت ہے۔ اپنے سہاگ کو بانٹنے گی ہو ارے اپنی محبت سے اپنی چاہت سے انہیں سمجھائیں۔ اپنی قربانیوں کا واسطہ دیں۔ میں غلطی پر تھی مگر اب نہیں ہوں۔ مجھے میرے اپنوں نے، دوستوں نے، خیر خواہوں نے بہت اچھی طرح سمجھایا، بات میری......

زندگی کی شاہراہ پر کبھی کبھی ایسے موڑ بھی آتے ہیں، جو یُو ٹرن ثابت ہوتے ہیں

''پلیز! پلیز نرگس آپا آپ میرے پاؤں نہ پکڑیں خدا کے لیے...... آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں، آپ کو اللہ کا واسطہ...... مجھے مت آزمائیں۔ میرے صبر وضبط اور حوصلے کا امتحان نہ لیں۔ پلیز میں آپ

کے پاؤں پکڑتی ہوں، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں، میں نے بہت مشکل سے خود پر قابو پایا ہے۔ اپنے حوصلے کو بڑی مشکل سے متزلزل ہونے سے بچایا ہے۔ اپنے ضبط کو بہت ہی مشکل سے قائم رکھا ہے۔ اور بہت ہی مشکل سے صبر کا دامن تھاما ہے۔ میں نے اپنے دل ودماغ پر بڑی ہی مشکل سے قابو پایا ہے اب ...... آپ ...... پھر سے مجھے توڑنے آ گئیں ہیں۔ پلیز رحم کریں۔ مجھ پر میں اب کی بار ٹوٹی تو ایسے بکھروں گی کہ میرا ریزہ ریزہ ہوتا وجود پھر کبھی یکجا نہ ہو سکے گا۔

آپ دنیا کی واحد نرالی بیوی ہیں جو اپنے شوہر کو میرے حوالے کر رہی ہیں ارے ...... بیویاں تو مارنے مرنے پر تل جاتی ہیں۔ خون خرابا کر دیتی ہیں، اُس ہستی کا منہ نوچ لیتی ہیں جو اُن کے سہاگ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں اور ...... اور آپ خدا کے واسطے دے کر ہاتھ جوڑ کر، پاؤں پکڑ کر مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ میں جنید سے شادی کرلوں ...... یا اللہ ...... یہ میرا کیسا امتحان ہے؟''

حذیفہ میری بہن خدا کے لیے شادی کے لیے مان جاؤ۔ نہیں تو میرا جنید مر جائے گا۔ میں اپنے جنید کو دکھی اور پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ تم نے دو دن سے فون پر بات نہیں کی، جنید نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ اُس کو بچالو ورنہ ......''

''نرگس آپا ...... یہ آپ کی کیسی محبت ہے۔ اپنے سہاگ کو بانٹنے لگی ہو ارے اپنی محبت سے اپنی چاہت سے انہیں سمجھائیں۔ اپنی قربانیوں کا واسطہ دیں۔ میں غلطی پر تھی مگر اب نہیں ہوں۔ مجھے میرے اپنوں نے، دوستوں نے، خیر خواہوں نے بہت اچھی طرح سمجھایا۔ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے جو غلطی کی۔ جتنا بھی آگے بڑھی جو بھی فیصلے کیے، وہ سب غلط تھے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ہم دونوں آج تک ملے نہیں، صرف فون پر رابطہ رہا اور ہم اتنے آگے نکل گئے۔ دوسری اہم بات میرا منگیتر مجھے جنون کی حد تک پیار کرتا ہے۔ چند ماہ بعد میری شادی ہے۔''

حذیفہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے نرگس کا ہاتھ تھام کر کہا تو نرگس بھی رو پڑی۔

''پھر تم اتنا آگے کیوں بڑھ گئیں کہ جنید بھی تمہیں جنون کی حد تک چاہنے لگے۔ بتاؤ اب میں اپنے شوہر کو کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں جو مجھ سے کھو گیا ہے۔ مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے۔ نہ اب وہ میرا رہا نہ میرے بچوں کا ...... میں اب کیا کروں؟'' میں تمہارے پاس بڑی اُمیدیں لے کر آئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں وہ پہلے جیسا نارمل اور ہنستا مسکراتا جنید بن جائے۔ میری نظروں کے سامنے بھی رہے۔ اب میرے جنید کا کیا ہوگا؟''

نرگس کو اس طرح روتے دیکھ کر حذیفہ بھی بلکنے لگی۔

''اچھا میں آج فون کرلوں گی۔ آپا آپ نہ روئیں۔ اُس نے نرگس کے ہاتھوں کو تھپتھپایا تو نرگس آنسو بھری آنکھوں سے مسکراتی گھر لوٹ آئی۔

☆......☆......☆

سارا راستہ وہ سوچتی رہی کہ واقعی یہ میرا کیسا فیصلہ ہے کہ میں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا سہاگ، ایک جیتا جاگتا وجود، جو صرف اور صرف میرا ہے۔ اس کے جسم پر، اُس کی روح پر، اُس کے انگ انگ پر صرف اور صرف میرا حق ہے اور میں اتنی بے بس ہو گئی ہوں کہ وہ سب کچھ اٹھا کر کسی غیر کے حوالے کرنے لگی ہوں۔ مجھے اپنی وفا، اپنی محبت، اپنے خلوص سے اس شخص کو جیتنا چاہیے۔ اسے اپنانا چاہیے ہمیشہ سے جو میرا تھا، اُسے اب میں کیسے کسی کے حوالے کرنے لگی ہوں۔ میں نے کتنے آرام سے حذیفہ سے کہہ دیا کہ جنید سے شادی کرلو اور جب وہ شادی کرے گی تو پھر جنید اُسی کا ہو جائے گا۔

میرا اور میرے تینوں بچوں کا کیا ہوگا؟ وہ لمحات، وہ اُن کی اٹھکھیلیاں، ہنسی مذاق، وہ دن، وہ راتیں میں برداشت کر پاؤں گی۔ اب تو جذبات کی رو میں بہہ کر یہ فیصلہ کرنے لگی ہوں۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ یہ میں کیا کرنے چلی ہوں؟

سچ کہہ رہی ہے حذیفہ میں کیسی نرالی بیوی ہوں، جو اپنے سہاگ کو، اپنے شوہر کو اٹھا کر کسی اور کے حوالے کر رہی ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

حذیفہ کے گھر سے لوٹ کر اپنے گھر آنے تک اُس کی سوچیں بالکل بدل چکی تھیں۔

وہ گھر میں داخل ہوئی سامنے ہی جنید بیٹھا تھا میلے سے لباس میں بڑھی ہوئی شیو کو دیکھ کر نرگس کو دھچکا سا لگا۔ یہ وہی جنید ہے جسے ٹپ ٹاپ رہنے کا کتنا خیال تھا۔

”کیا کہا اُس نے۔“ جنید نے بے چینی سے سوال کیا۔

”اُس نے صاف منع کر دیا۔ اُس کے سسرال والے آئے ہوئے تھے۔ شادی کی بات چیت چل رہی تھی۔“ نجانے وہ کون سا کمزور لمحہ تھا جب نرگس نے اتنا بڑا جھوٹ بول دیا۔

”یہ بتاؤ حذیفہ کا کیا ردِعمل تھا وہ...... وہ کیا محسوس کر رہی تھی۔ اُن لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک کر رہی تھی۔ کیا اِن باتوں کو سن کر وہ خوش تھی؟ جنید بے چینی سے پہلو بدلتے لگاتار نرگس پر سوالات کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ نرگس سنبھل سنبھل کر اُن کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔

”حذیفہ بالکل خاموش تھی۔ اُس کی باتوں اور رویے سے نہ انکار تھا نہ اقرار، اُس کی جذباتی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ کہیں لگتا وہ اس رشتے سے خوش ہے اور کہیں جھول سا نظر آ رہا تھا۔ میں بھی تو آج پہلی دفعہ اُس سے ملی تھی۔ وہ مجھ پر حیرت اور تعجب کر رہی تھی کہ میں کیسی نرالی بیوی ہوں جو اپنے شوہر کے لیے اُس کی منت خوشامد کر رہی ہوں۔ وہ کہہ رہی تھی اُس کا منگیتر اُسے جنون کی حد تک پیار کرتا ہے۔ اگر اُس نے حذیفہ سے شادی نہ کی تو وہ مر جائے گا۔“

”ہوں۔“ جنید نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ کہہ رہی تھی وہ۔“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں...... بالکل یہ ہی کہہ رہی تھی۔“ نرگس نے میاں کو یقین دلانا چاہا۔

☆......☆......☆

نرگس نے چادر اتار کر تہہ کر کے الماری میں رکھی گھر کی صفائی کی بچوں کو نہلا کر صاف ستھرا کیا۔ پھر میاں سے مخاطب ہوئی (جو نجانے کون سی سوچوں میں گم تھا)

”آپ بھی باتھ لے لیں میں نے آپ کے کپڑے پریس کر کے واش روم میں رکھ دیے ہیں۔ کھانا بھی تیار ہو چکا ہے آپ باتھ لے کر آئیں تو پھر دسترخوان لگاتی ہوں۔“

اُس نے اپنا شیڈول بتایا وہ بھی نہا کر جنید کی پسند کا لباس پہن چکی تھی۔ اُس نے خود کو ذرا ڈھنگ سے تیار کیا۔ ایک مدت کے بعد جنید کی پسند کا خیال کیا۔ یہ سب کچھ نجانے کیسے خود بخود ہو رہا تھا۔ جنید بھی فرمانبردار بچے کی طرح اُٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں دسترخوان لگا دیا گیا۔ آج جنید کی چھٹی تھی اور پہلے چھٹی والے دن یہ لوگ بہت انجوائے کرتے تھے مگر اب کچھ عرصے سے وہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ مگر آج نرگس کا دل چاہ رہا تھا ماضی لوٹ آئے، حال پھر سے خوبصورت گنگناتا بن جائے۔

جنید باتھ لے کر کچھ فریش ہو گیا تھا۔ اُسے گھر کا ماحول پُرسکون اور اچھا لگ رہا تھا۔ اُس نے غور کیا اور سوچا نرگس میں آخر کس چیز کی کمی ہے۔ ہر لحاظ سے ایک مکمل عورت ہے۔ ایک باوفا بیوی، ایک شفیق

ماں، صبح سے لے کر رات گئے تک وہ کام میں لگی رہتی ہے۔ آج ہمارے تین بچے ہیں کل اگر میں حذیفہ سے شادی کرلوں گا۔ اُس کے بھی بچے ہوں گے۔ مہنگائی آسمان کو چھورہی ہے۔ آج نرگس میرا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے کل حذیفہ کے آنے سے شاید وہ لاپروا ہوجائے۔ پھر...... دونوں میں مقابلہ ہوگا کہ جنید کے آرام کا خیال کون رکھے گا۔ اُس کے کپڑوں، جوتے کی پالش دفتر کے جاتے ہوئے...... ہر طرح کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تب یہ لوگ ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالیں گی اور گھر میں عجیب تناؤ کا احساس ہوگا۔ ماحول مکدر ہوگا۔ یہ میرا جذباتی فیصلہ ہے۔ جو آگے جاکر غلط ثابت ہوگا اور پھر حذیفہ نے بھی مجھ سے لاتعلقی اختیار کرلی ہے۔ کیا اب بھی میں اپنے فیصلے پر اٹل رہوں یا اپنے فیصلے میں لچک پیدا کروں؟ سوچ سوچ کر جنید ہلکان ہورہا تھا مگر کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچ رہا تھا۔

☆......☆......☆

نرگس کے گھر سے نکلتے ہی حذیفہ نے ثانیہ کو فون کیا۔

''اگر تمہارے پاس ٹائم ہو تو کچھ دیر کے لیے میرے ہاں آجاؤ۔ مجھے تم سے ضروری مشورہ کرنا ہے۔'' تھوڑی ہی دیر میں ثانیہ نرگس کے پاس پہنچ گئی۔

''اگر تمہیں مجھ سے مشورہ کرنا ہے تو پھر میرے مشورے پر عمل کرنا ہوگا، ورنہ میرے پاس فضول دماغ کھپانے کا وقت نہیں ہے۔'' ثانیہ نے حذیفہ کے بلانے کا مقصد جان کر الٹی میٹم دیا تو حذیفہ نے وعدہ کرلیا کہ وہ اُس کے مشورے پر عمل کرے گی۔ تب ثانیہ نے اُسے دیر تک سمجھایا۔ نرگس کو بُرا بھلا کہا کہ عجیب احمق اور پاگل بیوی ہے۔ میں ہوتی اُس کی جگہ تو دوسری لڑکی کا منہ نوچ لیتی کہ میرے سہاگ پر معصوم تین بچوں کے باپ پر تُو نے ڈاکہ کیسے ڈالا؟ حذیفہ آفرین ہے اُس عورت پر جو اپنے ہاتھوں سے اپنا سہاگ تمہارے سپرد کرنے آئی تھی۔ کچھ تو رحم کرو اُس بے چاری پر۔ تمہیں اُس پر ترس نہیں آرہا ہے؟ اُس کے معصوم بچوں پر پیار نہیں آرہا ہے۔ ارے جو پیارا ہوتا ہے اُس سے منسلک ہر چیز پیاری لگتی ہے اور تم کیسی شقی القلب ہو کہ نہ اُس عورت پر نہ اُن بچوں پر رحم آرہا ہے تمہیں۔ کیوں اپنی زندگی کے ساتھ کئی زندگیاں تباہ کررہی ہو۔ دیکھو اُس عورت کی مثال کہ وہ تم سے کہتی ہے میرا جنید مرجائے گا تمہارے بنا اور میں اپنے جنید کو مرنے نہیں دوں گی کیونکہ میں اُس سے بے پناہ پیار کرتی ہوں...... سنا تم نے، پیار کرنے والے ایسے ایسے امتحانوں سے گزر کر اتنے بڑے فیصلے اور قربانیاں دینے کو تیار رہتے ہیں اور ایک تم ہو کہ اپنے منگیتر کو، اپنے حیدر کو جو تمہیں پاگلوں کی طرح پیار کرتا ہے۔ تمہارے بنا ایک پل جی نہیں سکتا تم اُسے دھوکہ دے رہی ہو۔ اُسے اگنور کررہی ہو۔

''اُس کا کیا بنے گا تمہارے بنا، کبھی یہ سوچا ہے تم نے......؟''

''حذیفہ خود غرض مت بنو۔ اُس کے لیے سنجیدگی سے سوچو جو تمہارے لیے جی رہے ہیں۔ اپنے والدین اور حیدر کا خیال کرو جو تمہارے بنا نامکمل ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، تمہارا یہ فیصلہ کس حد تک درست ہے۔ وہ تین بچوں کا باپ ہے۔

اُس کی ایک باوفا بے حد پیار کرنے والی معصوم سی بیوی ہے۔ وہ بظاہر تم دونوں کے حق میں فیصلہ دے رہی ہے مگر وہ اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ تم سے چھپا رہی ہے۔ اُس کے اندر کا موسم کس قدر خزاں رسیدہ، اُداس ہارا ہوا ہے یہ تو وہی جانتی ہے۔ ابھی تم لوگ شادی کرلو گے۔ جوش جذبہ اور جنون یہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے گا۔ پھر بعد کے حالات...... ٹھنڈے دل سے آرام سے تنہائی میں سوچو تو سہی۔ میں تمہیں ایک ہفتہ دے رہی ہوں۔ ایک ہفتے بعد پھر تم

سے رابطہ کروں گی۔ اب اجازت دو بہت دیر ہوگئی ہے۔ شفاعت میرا انتظار کر رہے ہوں گے او کے۔"

"اللہ حافظ۔" ثانیہ تیزی سے بیرونی گیٹ کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

ثانیہ کے جانے کے بعد حذیفہ نے ایک لمبی سانس ہوا میں خارج کی اور آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت پر سر ٹیک دیا۔ ابھی وہ سوچوں اور مختلف خیالات کی عمیق وادی میں پہنچی ہی تھی کہ سیل نے اُسے اپنی طرف مخاطب کیا۔

اُس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا دیکھا تو حیدر کا نمبر تھا۔ اُس نے فوراً ریسو کرلیا۔

علیک سلیک کے بعد حیدر نے جو خبر دی وہ اُس کے لیے بہت ہی اہم اور فیصلہ کن گھڑیاں لے کر آئی تھی۔ ایک ہفتے بعد حیدر وطن لوٹ رہے تھے اور اسی ایک ماہ میں شادی متوقع تھی۔

"سویٹی تم خوش نہیں ہوئیں کہ اچانک میں کیسے پہنچ رہا ہوں؟ ابھی میرے لوٹنے میں کافی وقت تھا۔" حیدر نے سوال کیا تو حذیفہ نے خود کو نارمل کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔

"دراصل اچانک سرپرائز پر میں حیران ہوگئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کہوں، کیسے اظہار کروں؟" اُس نے صفائی پیش کی۔

"ڈارلنگ! تمہیں جو چاہیے جلدی جلدی مجھے بتادو۔ ویسے تو میں نے ڈھیروں شاپنگ کرلی ہے مگر جانِ عزیز آپ کی فرمائش بھی تو کوئی اہمیت رکھتی ہے۔" حیدر نے شوخی سے کہا۔ تو حذیفہ نے کہا۔

"ابھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ میں ایک دو روز میں فون کردوں گی۔"

"او کے...... او کے جانو اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ۔" اور فون بند ہوگیا۔

حذیفہ نے موبائل ایک طرف رکھا اور صوفے پر نیم دراز ہوگئی۔ وہ ایسی پگڈنڈیوں پر محوِ سفر تھی جہاں پر قدم سنبھل سنبھل کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ سوچوں کا نا ختم ہونے والا سلسلہ تھا اور وہ تھی۔

ایک بار پھر سیل نے اُسے اپنی طرف مخاطب کیا۔ اب کی دفعہ فون جنید کا تھا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد حذیفہ نے سیل اٹھالیا۔

"السلام وعلیکم! پلیز جنید صاحب آج کے بعد مجھے فون نہ کریں پلیز...... مائنڈ نہ کریں۔ ہم دونوں اپنی اپنی منزل سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ ہم یہ جو کچھ کر رہے ہیں دانشمندی نہیں ہے۔ میرا بے حد پیار کرنے والا منگیتر ہے جو اگلے ہفتے شادی کی غرض سے وطن آرہا ہے اور آپ کی بیوی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ جو آپ کو جنون کی حد سے بھی بڑھ کر پیار کرتی ہے۔ آپ کی سلامتی کے لیے آپ کی خوشی کے لیے وہ میرے پاس آئی تھیں۔ میرے پاؤں پکڑ رہی تھیں، ہاتھ جوڑ رہی تھیں، زاروقطار رو رہی تھیں یہ ہی اُن کی محبت، چاہت اور وارفتگی کی مثال ہے کہ وہ مجھے آپ سے شادی کرنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ پلیز جنید صاحب! آپ اپنی جنت کو کھونے لگے ہیں۔ آپ کی بیوی انسان نہیں فرشتہ ہے۔ وہ پوجنے کے قابل ہیں۔ اُن سے پیار کریں۔ اُن کی حق تلفی نہ کریں۔ اپنی جنت کو دوبارہ روشن کریں۔ اپنے بکھرتے آشیانے کے ہر تنکے کو سمیٹ لیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے لیے اپنی جنت میں لوٹ جائیے۔ اور مجھے بھی ایک نئی زندگی کا آغاز خوشیوں کے ساتھ کرنے دیجیے۔ اللہ حافظ۔"

اور فون بند ہوگیا۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی اور مسکرا کر ثانیہ کا نمبر ملانے لگی۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

سنبل

محبت اسمِ اعظم ہے

"بہت بری ہو تم بہت بری اگر تمہیں اندازہ ہوتا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں تو تم مرنا پسند کرتیں مگر ان الفاظ کو منہ سے نکالنا پسند نہ کرتیں۔ مگر نہیں جو لوگ تمہاری طرح غرورِ حسن میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اسی طرح دلوں پر قدم رکھتے ہوئے گزرتے ہیں۔" وہ کہہ کر مڑا اور......

کلاس کے فرق کو مٹاتا، ایک یادگار مکمل ناول

"تم نے دال کو بگھار لگا دیا تمہارے بابا آنے والے ہیں۔" اماں نے اریش کو آواز لگا کر پوچھا۔

"اماں! روٹی ڈال لوں بگھار بابا کے آنے پر تازہ لگاؤں گی۔" اریش نے جواب دیا۔

"مگر آج یہ جوشاندہ بھی بھرنا ہے اور لفافے بھی مکمل کر کے دینے ہیں۔ کل پھر میں سلائی کے تھیلے اور شلواریں لاؤں گی۔" اماں نے ایک ہی سانس میں سب بتا ڈالا۔

"اماں! فکر مت کرو ابھی میں عاشی اور فاطمی کے ساتھ مل کر سب کروا دوں گی۔" اس نے رسوئی سے ہی آواز لگائی۔

"فکر کیسے نہ کروں؟ تم سب کو پڑھنا بھی تو ہوتا ہے۔" انہوں نے محبت سے کہا۔

"کوئی بات نہیں فکر کی اماں! ماشاء اللہ سے تمہاری ساری اولاد ذہین ہے۔ تھوڑا سا پڑھ کر ہی پوزیشنز لیتی ہیں۔" اس نے پھر جواب دیا اور ساتھ ہی روٹی توے پر ڈال کر دوسری روٹی کی چنگیری بنائی اور روٹی پلٹی۔

"ماشاء اللہ!" انہوں نے بھی فوراً کہا۔ "اچھا تم تینوں کے کام ختم ہو جائیں تو اِدھر ہی آ جانا۔" انہوں نے پھر آواز لگائی۔

"اچھا اماں!" اس نے کہہ کر روٹی توے سے اُتار کر آگ پر سینکی اور دسترخوان پر رکھ دی۔

روٹی پک کر مکمل ہوئی تب تک بابا بھی گھر آ گئے۔ ان تینوں نے مل کر کھانا لگایا۔ سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد کچن سمیٹ کر اماں اور عاشی لفافے بنانے بیٹھ گئیں۔ اریش اور فاطمہ جوشاندہ بھرنے لگیں۔ نو بجے تک تمام کام مکمل ہو گیا اس کے بعد انہوں نے نماز پڑھی اور ایک گھنٹے پڑھا اور سونے کے لیے لیٹ گئیں اور ان کا ایک دن اور مکمل ہوا ان کے دن ایسے ہی مشقت بھرے تھے۔

وہ جس علاقے کے رہائشی تھے۔ وہاں تمام عورتیں دوسروں کے گھروں میں کام کرتی تھیں اور مرد پلنگ توڑا کرتے تھے اور بچے یا تو چائلڈ لیبر کا

شکار تھے یا آوارہ گردی کرتے تھے۔ بس یہ واحد گھر تھا جہاں اللہ کا شکر تھا۔ بابا یعنی احسن صاحب کسی آفس میں چپڑاسی تھے۔ اماں مختلف جگہوں سے کام پکڑ لاتی تھیں جنہیں وہ اور ان کی تینوں بیٹیاں مل کر پایہ تکمیل کو پہنچاتی تھیں۔ بیٹے عدنان اور رضوان دونوں بڑے تھے۔ اور دونوں مختلف علاقوں میں ٹیوشنز پڑھا رہے تھے۔ احسن صاحب کو خود پڑھنے کا بہت شوق تھا جس کی تکمیل نہ ہوئی تو انہوں نے یہ شوق بچوں میں منتقل کر دیا۔ ان کے سارے بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ عدنان ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رہا تھا تو رضوان گریجویشن کے بعد انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کرنا چاہتا تھا۔ ابھی ایڈمیشن نہیں ہوا تھا اریش نیوکلیئر فزکس کی جانب راغب تھی۔ ابھی بہر حال وہ بی ایس سی پارٹ ٹو میں تھی اور عاشی اور فاطمی ابھی میٹرک کی اسٹوڈنٹس تھیں۔ وہ سب اپنی پڑھائی کے خرچ خود نکال رہے تھے۔ اس علاقے کے عام چلن کے مطابق انہیں کسی سے مانگنا نہیں پڑتا تھا۔ اور وہ اس کے لیے خدا کے شکر گزار بھی بہت تھے۔

☆.......☆.......☆

اس نے ناگواری سے نشے میں دھت ایڈی کو دیکھا جو کہ ساشا کی عریاں بانہوں میں مچلا جا رہا تھا اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ کسی بھی پارٹی میں وہ سارے Over Drink کرنے کے بعد تمام حدود و قیود کو پھلانگ جاتے تھے۔ آج بھی ساشا کی Birthday کے بعد ان سب نے نائٹ اسٹے کے لیے ایک ریزورٹ کا انتخاب کیا تھا اور حسب معمول احسن دانش (ایڈی) صائمہ شمائل (ساشا) ماہ نور (ماہی) ضوفشاں (ضوفی) دیا احمد (ڈی اے) احمر شاہان (ایش) زہیب خاقان (ذکی) اور وہ خود یعنی ذیشان فواد (ذی) آدھی رات تک ہلے گلے میں مصروف رہے باہر لان میں ٹہل لگائی۔ ایک دوسرے سے ریس لگائی گئی، کارڈز کھیلے، ٹی وی دیکھا اور آخر کار ساشا نے پیگ بنا کر انہیں دیے ذی نے حسب معمول دو کے بعد تیسرے پیگ کو نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا مگر وہ ساتوں جب تک دھت نہ ہو گئے ان کا ہاتھ نہ رکا اور وہ نشے کے بعد جس دوسری چیز کی ضرورت تھی۔ وہ اس میں گم ہو چکے تھے۔

وہ کراہیت سے ان پر ایک نظر ڈالتا اپنی گاڑی کی چابیاں اُٹھاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جس سوسائٹی میں موو کرتا تھا وہاں یہ سب عام تھا۔ اسے اپنی سوسائٹی کی کسی اور بات سے اتنی چڑ نہیں تھی جتنی اس بات سے چڑ تھی۔ اس کے خیال میں انسان اور جانور میں فرق ہونا چاہیے یہ کیا کہ جانوروں کی طرح کسی کے بھی ساتھ کسی بھی وقت نفس کی غلامی کر لی جائے۔

اس کے اُٹھتے ہی ضوفی نے کہا۔

''ہمیں تو آرزو ہی رہی کہ کبھی تمہیں بھی انگور کی بیٹی کا نشہ چڑھے۔'' وہ فل نشے میں دھت تھی۔ لہراتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

''اور یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی۔'' وہ آرام سے کہتا ہوا آگے بڑھا۔

''ہاں حسرت، حسرت بالکل درست ڈیفائن کرتا ہے یہ لفظ میری Condition کو۔ واقعی حسرت ہے مجھے بھی تم میری بانہوں کا سہارا لو۔ نشے میں ڈوب کر میرے کاندھے کو اپنا تکیہ بناؤ اور میری آغوش میں سر رکھو وہ کیا شعر کہا ہے تمہارے فیورٹ پوئٹ نے۔

میں اپنی ہر اک رات اسی رات کو دے دوں
سر رکھ کر میرے سینے پہ سوجا کسی دن

وہ حد سے زیادہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

''اس کی وجہ یہ کہ میں کم ظرف مے نوش نہیں

ہوں۔ اور کسی عورت کی بانہوں کا سہارا نیور، کبھی نہیں۔ یہ میری مردانگی کی توہین ہے۔ عورت سہارا دینے کے لیے ہوتی ہے لینے کے لیے نہیں ہوتی۔'' وہ کہتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔

''کم ظرف، مے نوش! اوہ مائی گاڈ، لگتا ہی نہیں بیکن ہاؤس اور کولمبیا یونیورسٹی کے گریجویٹ ہو۔'' وہ لڑکھڑا کر بولی۔

''کوئی بات نہیں مجھے فرق نہیں پڑتا۔'' وہ بے رخی سے بولا۔

''پلیز! ذی آج رُک جاؤ۔'' وہ صوفے کا سہارا لیتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

''کبھی نہیں میں جانور نہیں ہوں۔ یاد رکھنا یہ بات ہمیشہ، گڈ بائے۔'' یہ کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

''اماں! اگر اس ہفتے ہماری امتحانی فیس نہ گئی تو ہم امتحان نہیں دے سکیں گے۔'' فاطمی اور عاشی نے اماں سے کہا۔

''اللہ مالک ہے بیٹا! ابھی چوڑیوں والے کے پاس جا رہی ہوں۔ چوڑیوں پر نگ لگوانے کا کام آیا ہے۔ وہ بھی لے آؤں گی اور یہ بنی ہوئی بھی دے آؤں گی۔ تو اس سے پیسے بھی لیتی آؤں گی۔ بھلا آدمی ہے ایڈوانس بھی مانگو تو منع نہیں کرتا۔ اور اب تو پچھلا ہوا کام بھی ہے۔'' اماں نے تفصیل سے بتایا۔

''اماں! میرے پاس ٹیوشن کے پیسے رکھے ہیں اگر انتظام نہ ہو تو مجھ سے لے لیجیے گا۔'' عدنان نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا! کچھ پیسے میرے پاس ہیں کچھ کا انتظام اللہ کردے گا، ہوجائے گا۔ تم پریشان مت ہو، تمہیں خود بھی تو فیس دینی ہوتی ہے۔'' اماں نے چوڑیاں سمیٹ کر گتے کے ڈبے میں سلیقے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں تھوڑی لیٹ دے دوں گا مگر فاطمی اور عاشی کے لیے ایمرجنسی ہے اگر فیس نہ جمع کی تو یہ ایگزام نہیں دے سکیں گی۔'' اس نے رسان سے کہا۔

''اچھا دیکھو اگر رات تک انتظام نہ ہوا تو لے لوں گی۔'' اماں کا خدا پر توکل ایسا ہی تھا۔ اور پھر وہ سب ناشتہ کرکے گھر سے نکل گئے۔ اور رات تک پیسوں کا انتظام بھی ہوگیا۔

☆......☆......☆

''یار ذی! تمہیں پتا ہے معاملہ خاصا گھمبیر ہے۔'' ایڈی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اوہ یار! تُو اور تیرے گھمبیر مسئلے سب پتا ہیں۔ کوئی لڑکی قابو میں نہیں آرہی ہوگی۔'' ذی نے سامنے رکھا کلب سینڈوچ اُٹھا کر اس کا بائٹ لیا۔

''اوہ یار! مسئلہ لڑکی پٹانے کا نہیں، پہلے سے پٹی پٹائی لڑکی کا ہے۔'' وہ بے زاری سے بولا۔

''پہلے سے پٹی پٹائی یُو مین ساشا کا؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے ایڈی کو دیکھا جس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اُس کا کیا مسئلہ ہے؟ وہ تو پہلے ہی تمہاری بیوی کا رول بخوبی پلے کررہی ہے۔'' ذی نے سر جھٹک کر کہا۔

''اب رول پلے کرنے کے بجائے وہ سچ مچ بیوی بننا چاہتی ہے۔'' وہ بے زاری کی انتہا پر تھا۔

''مطلب وہ گلے میں گھنٹی باندھنے کو تیار ہے۔'' ذی نے شوخی سے پوچھا۔

''اپنے نہیں میرے، شی از پریگننٹ۔'' وہ جل کر بولا تو ذی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''پھر تو مبارک ہو تمہیں۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''شٹ اپ ذی! میں ویسے ہی پریشان ہوں اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ ایک تو وہ پتا نہیں کس کا

گناہ میرے سر ڈال رہی ہے اوپر سے تم۔'' وہ غصے سے بولا۔

''شٹ اپ! ایڈی تم اچھی طرح سے جانتے ہو ساشا تمہارے علاوہ کہیں اور انوالو نہیں ہے ایک تو تم لوگ تعلقات میں اتنی پستی میں پہنچ جاتے ہو اور پھر ذمے داریوں سے بھاگتے ہو۔'' وہ بھی غصے میں آ گیا۔

''پھر اب کیا کروں؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''کچھ نہیں کرو صرف ولیمہ کھلانے کی تیاری کرو۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''ہونہہ! ولیمہ کھلانے کی تیاری کرو۔ مجھے تو اس کی شکل سے بھی نفرت ہے۔ اور یوں بھی اس کی ذات میں کوئی ایسا راز نہیں بچا جو کہ مجھے خوش کر سکے۔ اور میں اسے اپنے گلے کا ہار بنا ڈالوں۔ اور معصومیت دیکھو بے چاری کی، میں نے کہا کہ اس مصیبت سے چھٹکارہ حاصل کر لو تو کہتی ہے کہ مجھے پتا ہی نہیں چل سکا اب پتا چلا ہے تو دیر ہو چکی ہے اب چھٹکارے میں میری جان کو خطرہ ہے۔ ہونہہ پتا نہیں چلا گھاٹ گھاٹ کا پانی پی ہوئی اور اسے پتا نہیں چل سکا۔'' ایڈی کے لب و لہجے میں پھنکار تھی۔

''بلیک میلر۔'' وہ غصے میں تھا۔

''پھر اب؟'' ذی نے سوالیہ اسے دیکھا۔

''دیکھو کچھ کرتا ہوں ڈیڈ ہی مسئلے کا کوئی حل نکالیں گے۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا اس کے چہرے پر اب چمک سی تھی۔

''بہر حال جو بھی ہو میری ہمدردیاں ساشا کے ساتھ ہیں۔'' اس نے کہا تو ایڈی سر جھٹک کر باہر کی جانب نکل گیا۔

ذی نے نہایت تاسف سے اسے دیکھا۔

☆......☆......☆

ٹھیک ایک ہفتے بعد ہی ایڈی کا فون تھا ذی کے پاس کہ اس کی ڈیل ہو گئی ہے۔'' اور وہ حیران رہ گیا کہ عزتوں کی بھی ڈیلنگز ہو سکتی ہیں۔

''مگر تم نے تو بتایا تھا کہ اب دیر ہو چکی ہے اور اس سب سے اس کی جان کو خطرہ ہے۔'' وہ پوچھ بیٹھا۔

''میری جان! یہ سب طریقے ہیں بلیک میلنگ کے، ورنہ اتنی گھاگ عورت کو پتا نہ چلے اور وہ وقت گزار دے۔ پکی بلیک میلر ہے ان کی فیملی، اس کی بڑی بہنوں کی شادی کا احوال نہیں پتا ہے۔ دونوں نے اسی طرح بزنس مینوں سے شادی کی ہے۔ وہ اس چکر میں پھنس گئے مگر میرا معاملہ دوسرا ہے۔ ہم تو کتا بھی نسل دیکھ کر رکھتے ہیں، خواب دیکھ رہی تھی ہمارے گھر کی بہو بننے کے۔ صرف دس لاکھ میں مان گئی۔'' وہ زہر اُگل رہا تھا۔

''وہ مان گئی؟'' وہ ابھی تک بے یقین تھا۔

''تو نہیں مانتی، ایسے ہی سرجانی سے ڈیفنس تک نہیں آ گئے یہ لوگ۔ مہذب طریقے سے کاروبار شروع کر رکھا ہے۔'' وہ کڑوے لہجے میں بولا۔

اور اس ساری سچویشن سے ذی اتنا بددل ہوا کہ اپنی آپی کے پاس آسٹریلیا چلا آیا اور جب آپی کو اس کے آنے کی وجہ پتا چلی تو وہ بھی کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔

''کیا صرف پانچ سالوں میں پاکستانی معاشرہ اتنی پستی کا شکار ہو چکا ہے؟'' وہ دکھ سے بولیں۔

''پاکستانی معاشرہ نہیں صرف ہماری کلاس آپی! ماں باپ کی طرف سے مادر پدر آزادی ہے۔ پینے پلانے کا شغل کھلے عام ہوتا ہے۔ اور ام الخبائث اپنے اثرات دکھاتی ہے۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا آپی! اس سوسائٹی میں موو کرنے کے لیے یہ مجھے بھی پینی پڑتی ہے مگر میں نے اسے کبھی خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔'' وہ سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔

''مگر حرام تو حرام ہے اس کے لیے ہر دلیل غلط ہے۔'' انہوں نے کافی بنا کر اس کے سامنے رکھی۔

''ہاں ہے تو آپی!'' وہ تھکے تھکے سے انداز میں بولی۔

''اور یہ جو تم نے ساشا والی بات بتائی ہے۔'' انہوں نے اپنا کپ اُٹھا کر لبوں سے لگایا۔

''وہ درست ہے آپی! آج کل کاروبار کو پوش علاقوں میں منتقل کر دیا گیا ہے اور شرفا کی اولادوں کو پھانسا جاتا ہے۔ ساشا کی فیملی کے متعلق ایسی باتیں کافی عرصے سے گردش کر رہی ہیں۔'' اس نے کافی کا سپ لے کر ایک طرف رکھا۔

''ہونہہ! شرفا کی اولادیں، شرفا کی اولادیں کبھی غلط کام نہیں کرتیں۔ اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ وہ شرفا بھی اور ان کی اولادیں بھی۔'' آپی نے تلخی سے کہا۔

''وہ تو ہے۔'' وہ بولا۔

''اگر تمہاری اور میری تربیت گرینڈپا اور مام نہ کرتے تو سوچو ہم بھی پور پور اس گندگی میں نہ لتھڑے ہوتے۔'' وہ آزردگی سے بولیں۔

''ہاں آپی! گرینڈپا اور مام کا بڑا احسان ہے ہم پر کہ ہم برائی کو برائی سمجھتے اور کہتے ہیں، ورنہ وہاں سعدی اور شہزا کو دیکھیں دونوں آپے سے باہر ہیں سمجھاؤ تو ڈیڈ اور مام سے شکایت کر دیتے ہیں اور پھر اپنی دقیانوسیت پر دو گھنٹے کا لیکچر تو پکا ہوتا ہے۔'' وہ بہت آزردہ اور تھکا ہوا تھا۔

''تم فکر مت کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جا کر شاور لے لو۔ اور آرام کرو انشاء اللہ رات کو بات ہو گی۔'' اور اس نے اُن کی بات پر عمل کیا اور یہاں وہ آیا ہی اس لیے تھا کہ سارا ڈپریشن اور پریشانی کہیں ہوا ہو جاتا تھا آپی کے پاس آ کر۔ وہ اس سے محبت کرتی تھیں اور اس کے ذہنی اور دلی طور پر قریب تھیں اتنی جتنی کہ اس کی ماں بھی اس کے قریب نہیں تھی۔

☆......☆......☆

''ٹینا! یہ تم نے کالج کا نمونہ دیکھا ہے۔'' جولی نے ببل سے پٹاخے پھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''کون !! کس کی بات کر رہی ہو؟'' ٹینا نے اپنے بالوں کو کیچر سے جکڑتے ہوئے پوچھا۔

''انہی آنسہ اور اریش بیگم کی بات کر رہی ہوں جو خود کو ہیلن آف ٹرائے سمجھتی ہیں۔'' وہ جل کر بولی۔

''اچھا وہ اچھی بھلی ہے بے چاری۔'' ٹینا نے جولی کی حالت کا مزہ لیا۔

''اچھی بھلی گاڈ نوز پتا نہیں کہاں سے اُٹھ کر آ جاتی ہیں۔ حلیہ دیکھا ہے اس کا لانگ ٹینٹ دوپٹا اس کا۔ فادر ایڈم کے زمانے کا یونیفارم اور سمجھتی ہے خود کو قلو پیٹرا...... فتح کے جھنڈے گاڑتی پھر رہی ہے پورے کالج میں۔ میگزین اس کے بغیر ادھورا ہے، ڈیبیٹ سوسائٹی کی وہ ممبر، پوئٹری، اسکرپٹ رائٹنگ، فلاور ارینج منٹ، بیت بازی، کوئز، بیڈمنٹن، ریس ہر چیز میں اس کا طوطی بولتا ہے۔'' جولی جلی بیٹھی تھی۔

''تو تمہارا کیا لیتی ہے، کون سا تمہارا انٹرسٹ ہے ان میں سے کسی بھی چیز میں۔ اور رہ گئی قلو پیٹرا سمجھنے کی بات تو وہ ڈیزرو کرتی ہے کہ خود کو سمجھے۔ کیسا روک لینے والا حسن اور معصومیت ہے اس کے چہرے پر۔'' وہ دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اچھا تو پھر ذی کو کبھی مت لانا یہاں۔'' اب جولی نے بھی پینترا بدلا۔

''وہ کیوں؟ اور ذی کا کیا تعلق ہے اس بات سے۔'' وہ حیرانی سے بولی۔

''کہیں وہ اس کے روک لینے والے حسن و

معصومیت سے متاثر نہ ہو جائے۔'' وہ مزے لے کر بولی۔

''اوہ! ربش، نیور وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ مجھے ہی نہیں دیکھتا باقی کسی کو کیا دیکھے گا۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''تمہیں بھی نہیں دیکھتا، کہیں اس کا کوئی اسکرو تو ڈھیلا نہیں ہے۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔'' وہ بھی بولی اور پھر دونوں کے قہقہوں کو کئی اسٹوڈنٹس نے رُک کر دیکھا اور سُنا۔

☆......☆......☆

ذی کو اس کے چچا داؤ د انکل کا فون آیا تھا کہ ڈرائیور نے چھٹی کی ہے اور ان سمیت باقی سب مصروف ہیں سو وہ کالج سے ٹینا کو پک کر لے اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ اس نے کچا کریلا چبالیا ہو۔ ایسی ہی کڑواہٹ اُتر آئی تھی اس کے وجود میں۔ اس قسم کی کنڈیشن سے اسے مہینے میں دو سے تین مرتبہ ضرور گزرنا پڑتا تھا اور اس کی وجہ ٹینا ہی تھی جو کہ اس کی کزن ہونے کے ساتھ ساتھ فیانسی بھی تھی۔ وہ ہی داؤد انکل سے کہہ کر اسے مجبور کرواتی تھی اپنی بات ماننے پر ورنہ وہ تو اس کی بات ماننے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ اور وجہ بقول اس کے اس کی سلی قسم کی Celebrations ہوتی تھیں۔

''اس وقت بھی وہ کالج کے باہر اپنی وائٹ کرولا میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جل بھن زیادہ رہا تھا۔ تب ہی باہر آتی ایک لڑکی پر اس کی نظریں جم سی گئیں۔ سرخ و سفید رنگت بڑی بڑی سرمئی آنکھیں، ستواں ناک اور چھوٹا سا دہانہ۔ وہ بڑی فرصت سے اس کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ کالج یونیفارم کا بلیو دوپٹا اس کے چہرے کے گرد چاند کے گرد ہالے کی مانند نظر آتا تھا۔ سرو قد نازک اور اس کے معائنے میں اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب ٹینا نے آ کر کار کا شیشہ ناک کیا تو وہ چونکا۔

''ہائے ہینڈسم! کہاں گم ہو؟'' اس نے طنز سے پوچھا۔

''وہاں۔'' اس نے بے دریغ اریش کی طرف اشارہ کیا۔ ''کون ہے وہ؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''وہ کچرا ہے ہمارے کالج کا، پتا نہیں کہاں سے اُٹھ آتی ہیں۔ اور کالج میں وہ بھی اتنے اچھے، داخلہ کیسے لے لیتی ہیں؟'' وہ تنفر سے بولی۔

''ظاہر ہے ڈفر! اپنی محنت اور ذہانت سے، اب ہر کوئی تو تمہاری طرح سفارشی نہیں ہوتا ناں۔ ویسے ہے کون؟'' اس کی نظریں اب تک اسی پر جمی ہوئی تھیں جو اپنی کسی دوست سے باتیں کرتی آہستہ آہستہ ایک جانب چلی جا رہی تھی۔

''قلوپیٹرا ہے! تم سے مطلب۔ کیا فلرٹ کرنا ہے؟'' وہ جل کر بولی۔

''یہ ٹائپ فلرٹ والی نہیں محبت والی ہے۔ ایسی لڑکیوں سے محبت کی جاتی ہے فلرٹ نہیں کیا جاتا۔'' وہ بڑے جذب سے بولا تو ٹینا فل تپ گئی۔

''یہاں کیوں بیٹھے ہو جا کر اس کی بارگاہ میں اپنا دل پیش کر دو۔'' وہ شدید غصے میں آ چکی تھی۔

''کروں گا، کروں گا یہ بھی کروں گا، فی الحال تو تم بتاؤ تم نے مجھے کیوں خوار کروایا ہے۔'' وہ بات بدل کر بولا۔

''کیا بتاؤں موڈ ہی خراب کر دیا، فی الحال تو کسی فاسٹ فوڈ شاپ پر چل کر کچھ کھلاؤ آئس کریم اور کولڈ ڈرنک کے ساتھ تاکہ موڈ بحال ہو پھر بتاتی ہوں۔'' وہ پورے استحقاق سے بولی اور ذی اسے پینی پیزا میں لے آیا اور اپنی مرضی کے لوازمات سے فارغ ہو کر اس نے پھر فرمائش کی۔

''اب مجھے ریڈ روزز کا بوکے لے کر دو۔''

''کیوں تمہاری Birthday ہے کیا آج؟''

وہ اچنبھے سے بولا۔

''تو تمہیں میری برتھ ڈے بھی یاد نہیں ہے ڈفر، آج 14 فروری ہے، ویلنٹائن ڈے۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''تو پھر میں تمہیں کیوں دوں، اس حسینہ کی بارگاہ میں نہ پیش کروں۔'' وہ مزہ لے کر بولا۔

''جاؤ پیش کردو بیٹھے کیوں ہو؟ تمہاری شکایت انکل سے لگانی پڑے گی زی! میں ان ڈے اے، ماہی، صوفی اور ساشا کو تو برداشت کرسکتی ہوں مگر اس نئے نمونے کو قطعی نہیں۔ ہمارے ہاں کتا بھی نسل دیکھ کر رکھا جاتا ہے، تو دوست کے سلسلے میں کتنا چوزی ہونا چاہیے، تمہیں اندازہ ہوگا۔'' وہ اپنی کلاس کا فیورٹ جملہ بول رہی تھی اور اس وقت اسے ایڈی یاد آرہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔

''ظاہر ہے جب میں تمہارے فرینڈز پر اعتراض نہیں کرتا تو تمہیں بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے ایسا۔'' وہ بے لاگ ولپیٹ بولا۔ ''ویسے سچ کہوں تو آج ویلنٹائن ڈے پر مجھے بھی محبت ہوگئی ہے۔'' وہ دوبارہ بولا۔

''اور وہ ظاہر ہے میں تو نہیں ہوں۔'' اس کے لہجے میں جلن کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور سبز آنکھوں میں نفرت۔

''ہاں تم سے ہونی ہوتی تو اب تک کئی مواقع ایسے آئے مگر، مجھے تو اس حسینہ سے ہونی تھی۔'' وہ آہ بھر کر بولا۔

کتنے دنوں کے لیے۔'' وہ جل کر بولی۔

''دنوں کے لیے محبت تمہیں ہوتی ہے، مائنڈ اٹ۔ ڈینی سے دو مہینے کے لیے، جے ایل سے آٹھ مہینوں کے لیے۔'' وہ آرام سے بولا۔

''تم بہت نیرو مائنڈ ہو، وہ محبت نہیں دوستی تھی۔'' وہ سلگی۔

''اچھا ان دنوں تو تم اسے محبت ہی کہا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہماری منگنی بھی تمہیں وبال لگنے لگی تھی۔'' طنز اس کا شیوہ نہیں تھا بہر حال اسے آئینہ دکھانا ضروری ہوگیا تھا۔

''لیواٹ یار! وہ وقتی اُبال تھا گزر گیا۔ ہماری انگیجمنٹ ختم تو نہیں ہوئی ناں!'' وہ اطمینان سے بولی۔

''کاش ہوجاتی۔'' پتا نہیں اس کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ ایک لمحے کو تو ٹینا خاموش رہ گئی۔

''زی! تم مجھ سے اس قدر بے زار کیوں ہو؟ یہ بات میں نے کئی بار محسوس کی ہے۔ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں۔ ویل آف فیملی سے نہیں ہوں۔ کیا کمی ہے مجھ میں؟'' وہ آزردہ لہجے میں بولی۔

''کوئی کمی نہیں ہے ٹینا! مگر مجھے اپنی لائف پارٹنر جیسی چاہیے تم ویسی نہیں ہو۔'' وہ بولا۔

''ایکسکیوزمی! ڈھائی گز کا ٹینٹ لپیٹ کر ہر کس وناکس کے سامنے میں نہیں شرما سکتی۔'' وہ جل کر بولی تو زی مسکرا دیا۔ اور اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔

'اس کے لیے جس حیا کی ضرورت ہوتی ہے ٹینا میم! وہ تم کہاں سے لاؤ گی۔ تم جو مردوں کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر ان سے اظہارِ محبت کرتی ہو۔ ان کی نگاہوں سے شرما کیسے سکتی ہو۔' اس کی سوچ بہت دور تک اس کی ہمسفر رہی۔

☆......☆......☆

''ہیلو میم! Reccess آف ہوچکی ہے۔'' اریش نے آکر کہا۔ اس کے وائٹ یونیفارم پر نیوی بلیو سلیش پر Prefect لکھا ہوا بتاتا تھا کہ کالج کے رولز منوانا اس کے فرائض میں شامل ہے۔''

''تو۔'' ٹینا نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

''تو یہ میم! کہ اب آپ سب کلاس میں

جائیں۔'' اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کا لہجہ بھی دوستانہ تھا۔

''اور اگر نہ جائیں تو۔'' ٹینا کا لہجہ ویسے ہی بے لچک تھا۔

''تو پھر مجھے مجبوراً مسز فاروقی اپنی انچارج کو بتانا پڑے گا۔'' اب اس کا چہرہ بھی مسکراہٹ سے عاری تھا۔

''تو پھر جاؤ جو تم سے کرتے بنے کر گزرو۔ صرف انچارج ہی نہیں تم پرائم منسٹر آف پاکستان اور پریذیڈنٹ آف پاکستان کو بھی لے آؤ تو میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ سُنا تم نے۔'' وہ چیخی۔

''ٹینی! کیا ہوا ہے۔ کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ واٹس پرابلم وِد یو۔ تم کیوں اس طرح بے ہیو کر رہی ہو۔'' جولی نے بروقت اسے ٹوکا۔ تب تک اریش واپسی کے لیے مڑ چکی تھی۔

''یہ.....'' اس نے جاتی ہوئی اریش کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ اس کی وجہ سے، یہ گندے علاقوں کا Waist یہ بڑے بڑے کالجز میں ایڈمیشن لیتے ہی اس لیے ہیں کہ بڑے گھروں کے لڑکوں کو پھنسا سکیں۔'' وہ تنفر سے بولی۔

''مگر ٹینی! آئم سوری ٹو سے، میں نے اس لڑکی میں یہ برائی دیکھی نہیں ہے۔ اس کا حسن بے خبر و بے پرواہے۔'' جولی نے بغور اس کا مشاہدہ کرتی نظر سے اسے دیکھا۔

''یہ بے خبری اور بے پروائی بھی ان کی ادائیں ہیں۔'' وہ بری طرح سے جلی ہوئی تھی۔

''اب اصل بات بتادو بات کیا ہے۔ تم اتنی ٹینس کیوں ہو؟'' جولی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''کچھ تو ہے۔ جس کی پردہ داری ہے۔'' اس نے انگلی سے ٹینا کی تھوڑی اونچی کی۔

''بس یار! وہ کل ویلنٹائن ڈے تھا ذی کو یہاں بلا لیا تھا۔ اس نے یہاں اس ''Bitch'' کو دیکھ لیا۔ کل سے آہیں بھر رہا ہے۔ آٹھ کالز تو صرف اس 'نیچ'' کا نام معلوم کرنے کے لیے آچکی ہیں۔ میں نے تو اپنا سیل آف کر دیا غصے سے۔'' وہ جل کر بولی۔

''اور وہ کھولن تم نے اس بے خبر پر اُتار دی۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''تو اور کیا کرتی۔'' وہ بری طرح سے کھولی ہوئی تھی۔

''اوہ! لیو اِٹ یار! ہماری کلاس کے لڑکے ایسی شغل مستیاں کرتے ہی رہتے ہیں۔'' جولی نے گویا مکھی اڑائی۔

''نہیں یار! تم ذی کو نہیں جانتیں۔ وہ الگ ہے ہماری کلاس سے بالکل ڈفرنٹ، کوئی مڈل کلاس Soul اس کے اندر بستی ہے۔ اس کا آج تک کوئی اسکینڈل، کوئی افیئر نہیں ہے۔ اس نے آج تک کسی لڑکی کی تعریف نہیں کی۔ تم کل اس کے اس 'Bitch' کو دیکھنے کا انداز دیکھتیں ایسا جذب تھا اس کے اندر گویا کسی 'فیری ٹوپیا کی پرنسز' کو دیکھ رہا ہے۔'' وہ جل بھن کر بولی۔

''ویسے واقعی لگتی تو ہے فیری ٹوپیا کی پرنسز۔'' جولی نے مزے سے کہا تو ٹینا بھی ہنس پڑی۔

''سو تو ہے۔'' وہ بھی بولی۔

''چھوڑو یار! تھوڑے دن اس بے چارے کو بھی کھیلنے دو۔ اس مڈل کلاس کے اتنے پرابلمز ہوتے ہیں۔ تھوڑے ہی دن میں بے زار ہو جائے گا۔ تھوڑا ٹائم اسے بھی رنگین بنانے دو، آخر کو قیدی تو اسے تمہارا ہی بننا ہے۔'' وہ ہنسی تو ساتھ ہی ٹینا بھی مسکرا

دی۔
''ہاں اسے بننا ہی پڑے گا...... ٹینا کا قیدی۔''
''اتنی سی بات کی اتنی ٹینشن لی تم نے خوامخواہ۔ تمہیں پتا ہے ناں! ٹینشن بیوٹی کی دشمن ہوتی ہے۔'' جولی نے کہا تو ٹینا اثبات میں سر ہلا کر ہنس دی۔

☆......☆......☆

وہ پچھلے دو ہفتے سے اسے واچ کر رہا تھا۔ وہ اپنی کسی فرینڈ کے ساتھ واپس جاتی تھی۔ وہ دونوں پیدل جاتی تھیں کسی وین یا بس میں نہیں۔ گویا ان کی رہائش قریب ہی تھی۔ اور آج پورے دو ہفتے بعد قسمت سے اس دوست کا دم چھلا ساتھ نہیں تھا اور وہ اسی وقت کو گنوانے کے موڈ میں قطعی نہیں تھا۔ لہٰذا فوراً ہی اس کے پیچھے چل پڑا۔
''ہیلو مس! پلیز رکیے مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' اس نے چلتے چلتے گلا کھنکار کر کہا اور وہ باقاعدہ بدک کر پیچھے ہٹی۔
''مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ آپ جو کوئی بھی ہیں یہاں سے جائیں۔'' اس نے چلتے چلتے عجلت میں جواب دیا۔
''پلیز صرف دو منٹ۔'' وہ ہر حال میں اسے اپنا حال دل سنانا چاہتا تھا۔
''دو منٹ تو کیا ایک منٹ بلکہ ایک سیکنڈ بھی نہیں۔ آپ کو نہیں پتا یہاں اسکینڈل بننے میں منٹ بھی نہیں لگتا۔ آپ دو منٹ بھگتا کر چل دیں گے اور میں ساری زندگی ان دو منٹوں کا تاوان بھرتی رہوں گی۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی دار پر چڑھا دی جاؤں گی۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے بھی اپنے قدم نہیں روکے تھے۔
''مگر......'' اس کی بات منہ میں ہی تھی کہ اُچک لی گئی۔
''نو اگر نو مگر، آپ چلے جائیں۔ میں آپ کے ساتھ کسی تعاون کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' اس نے کہا اور اس کے چلنے کی رفتار میں بھاگنے والی حد تک تیزی آ گئی۔ اور وہ رُک گیا۔
پھر اس نے اس پوش علاقے کے پیچھے بسی ہوئی ایک کچی بستی کے ایک چھوٹے مگر صاف ستھرے گھر میں اسے داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔
وہ کئی بار اس کے راستے میں آیا ڈیڑھ بجنے سے پہلے پہلے وہ ہر کام ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر چلا جاتا۔ یہ بات ڈیڈ نے بھی نوٹ کی تھی اور ٹینا کی تو اکثر نظر پڑ جاتی تھی۔ مگر وہ تو پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیتی تھی۔ اس نے واضح کہا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ قطعی بے یقین تھی۔
''پلیز! مجھے میری اوقات سے بڑے خواب نہ دکھائیں۔ میں جس جگہ کی باسی ہوں وہیں میری جڑیں مضبوط رہیں گی۔ اس جگہ سے میری جڑیں کھود کر نکالی گئیں تو وہ جل جائیں گی۔ پھر وہ نمونہ پا سکیں گی۔'' وہ جواب دیتی۔ وہ اس پتھر سے سر پھوڑ پھوڑ کر تھک گیا تھا۔
''خدا کے لیے! آپ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اب تو میرے جرم بے گناہی کے قصے میرے گھر تک پہنچنے لگے ہیں۔'' وہ روہانسی سی ہو گئی تھی اور وہ درست کہہ رہی تھی۔ کل ہی تو شمو خالہ نے اور بقول اہل بستی پھاپھا کٹنی نے اس کے گھر آ کر اماں کے سامنے اس سے پوچھا تھا کہ 'وہ اس دن مارکیٹ میں کون لڑکا تھا تمہارے ساتھ۔' وہ ایک دم سے چوری ہو گئی تھی مگر اس نے فوراً خود کو کمپوز کر لیا۔
''کون لڑکا خالہ! مارکیٹ میں تو کئی لڑکے ہوتے ہیں اور آس پاس سے ہی گزر رہے ہوتے ہیں۔ مگر الحمدللہ آج تک کسی نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ سب ہی عزت کرتے ہیں۔'' وہ بہت اعتماد سے بولی۔

"ہاں یہ تو ہے مگر لڑکا اس علاقے کا دکھتا نہیں تھا۔ بڑے پیسے والا دکھتا تھا۔" وہ اپنے بیان پر قائم تھیں۔

"توبہ ہے خالہ! آپ تو رائی کا پربت بنا لیتی ہیں، آپ کو اسے دیکھ کر اس کا پیسا بھی نظر آ گیا۔" وہ بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اور اس وقت ہار ماننے کا مطلب خالہ کے ہاتھوں اپنی ہی رنگین داستان تھمانا تھا۔

"بیٹی! یہ بال چونا لگا کر سفید نہیں کیے ہیں۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں۔ اور امارت لباس سے، انداز سے سب سے نظر آتی ہے۔" خالہ نے بھی ہار نہ ماننے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔

"چلیں خالہ! ایسا ہی ہوگا مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا امیر وکبیر، ویل آف لڑکا مجھ جیسی غریب اور بے چاری نظر آتی لڑکی میں کیوں دلچسپی لے گا۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اچھا تم کہتی ہو تو یقین کر لیتی ہوں۔" خالہ کا لہجہ ایسا تھا گویا کہہ رہی ہوں یقین تو نہیں آتا۔ اور جب وہ چلی گئیں تو اماں نے اسے محتاط رہنے کو کہا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ آج وہ پھٹ پڑی تھی۔ اور ذی سوچ رہا تھا کہ آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔

☆......☆......☆

"کیا بات ہے ابھی تک پٹی نہیں۔" اس دن ٹینا گھر آئی تھی اور اب اسے طنزاً کہہ رہی تھی۔ ذی نے اسے دیکھا اور لاحول کہہ کر نظر جھکا لی۔ وہ اس وقت بلیک نیٹ کی شارٹ شرٹ اور کیپری میں ملبوس تھی اور شرٹ لائننگ کی قید سے آزاد تھی۔

"یہ اس کی شرافت اور حیا کی دلیل ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"ہونہہ! شرافت اور حیا، یہ کہو کہ اپنی قیمت کا اندازہ ہے اسے۔ اپنی قیمت بڑھا رہی ہے۔" وہ پھنکاری۔

"ٹینا! مائنڈ یور لینگویج وہ کوئی بازار میں نہیں بیٹھی ہے کہ قیمت میں اضافہ کرتی پھرے۔" وہ بھی غصے سے بولا۔

"ہونہہ! بازار میں بیٹھی ہوئی ان سے بہتر ہوتی ہیں۔ وہ جو ہوتی ہیں نظر آتی ہیں۔ یہ شریف زادیاں گندی نالی کے کیڑے، اپنی اداؤں سے اپنی قیمتیں بڑھاتی ہیں فکر نہ کرو جلد ہی تمہاری گود میں آ گرے گی، جتنا مانگے دے دینا اور دل بھر کر کھیلنا اور پھر اسے اس کی اوقات یاد دلا دینا۔" نفرت کی شدت سے اس کا رنگ سیاہ ہو رہا تھا۔

"مائنڈ یور اون بزنس! اور ہاں تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ میں جانور نہیں ہوں ورنہ ضوفی اور ماہی وغیرہ ہر گھڑی تیار و کامران ہیں۔ مجھے کھرا کردار اور سچی محبت کی طلب ہے جو ہماری کلاس میں ناپید ہے۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"ہونہہ! سچی محبت پھر تو یہ چیز تمہیں اس سے بھی نہیں مل سکتی جس کے پیچھے تم خوار ہو رہے ہو۔ سچی محبت تو وہاں سے بھی تمہیں نہیں ملنے والی۔ وہ اگر تمہاری جانب جھکی بھی تو خریدار بن کر ہی جھکے گی۔" اس کے لہجے میں کسی سانپ کی سی پھنکاریں تھیں۔

"چلو تم بھی یہیں ہو اور میں بھی یہیں ہوں۔ دیکھ لیتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بڑے دل جلانے والے انداز میں بولا تو وہ بل کھا کر رہ گئی۔

"اور یاد رکھنا ذی! اگر تم اس سے چوٹ کھا کر میری طرف پلٹے تو تم میرے لیے بھی قابلِ قبول نہیں ہو گے۔" وہ پھنکاری۔

"اس عنایت کے لیے پیشگی شکریے کا خواستگار ہوں۔" وہ بولا تو ٹینا "ہونہہ!" کہہ کر بل کھاتے غصے میں ڈیڈ کے کمرے کی جانب بڑھ گئی اور اسے معلوم تھا کہ اب اس کی ڈیڈ کے سامنے پیشی ہونے والی

ہے اور وہ خود کو اس افتاد کے لیے تیار کرنے لگا آخر کار ٹینا ڈیڈ کی اکلوتی لاڈلی بھتیجی اور مام کی لاڈلی بھانجی تھی۔

اور اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ ڈنر کے بعد ڈیڈ نے اسے کمرے میں آنے کو کہا اور اس وقت وہ ان کے سامنے تھا۔ اور انہوں نے فوری طور پر اس سے سوال کیا۔

''ہاں بھئی! مسئلہ کیا ہے؟''

''ٹینا نے غالباً بتا تو دیا ہوگا آپ کو۔'' اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

''ہاں مگر میں تمہارے منہ سے سُننا چاہتا ہوں۔'' وہ رعب سے بولے۔

''ڈیڈ! مجھے محبت ہوگئی ہے کسی سے بے حد و بے تحاشا۔'' وہ بڑے جذب سے بولا۔

''کون ہے؟ کیا نام ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟'' انہوں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''لڑکی ہے، اریش نام ہے، پڑھتی ہے اور ٹینا کے کالج کی بیک پر رہتی ہے۔'' اس نے سنبھل کر جواب دیے۔

''بیک پر یعنی کچی بستی میں۔'' انہوں نے اسے دیکھا۔

''ہاں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''اسے حاصل کرنا تمہارے لیے کیا مشکل ہے؟'' انہوں نے طنزیہ کہا۔

''حاصل کرنا ایسی ہی لڑکیوں کو مشکل ہوتا ہے ڈیڈ! کیونکہ ان کے کردار بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔'' وہ آرام سے بولا۔

''ہوں! پھر تم کیا چاہتے ہو۔'' انہوں نے بغور اسے دیکھ کر پوچھا۔

''ڈیڈ! میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے فوراً کہا۔

''ٹینا کا کیا ہوگا؟'' مام نے اس عرصے میں پہلی بار زبان کھولی۔

''مام! ٹینا کسی مڈل فیملی کی مظلوم لڑکی نہیں ہے۔ اس کی بھی کہیں نہ کہیں ہو جائے گی۔ منگنی ٹوٹنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے ہماری کلاس میں۔'' اس نے ترنت کہا۔

''تو تم اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہو۔'' ڈیڈ نے اندازہ لگانے والی نظر اس پر ڈالی۔

''نو ڈیڈ! وہ نہ ملی تو زندگی تو گزر ہی جائے گی مگر اس کی کمی کے خلاء کو کوئی پُر نہیں کر سکے گا۔ میں بھی بے سکون رہوں گا اور ٹینا بھی۔ بعد کی علیحدگی سے بہتر ہے ابھی راستے الگ کر لیے جائیں۔'' وہ بے لچک لہجے میں بولا۔

''ہوں! تم جاؤ، دیکھتے ہیں کیا ہو سکتا ہے۔'' ڈیڈ نے کہا تو اس نے حیرانی سے ڈیڈ کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ڈیڈ اتنی آسانی سے مان جائیں گے۔ اس کا تو خیال تھا کہ طویل جنگ لڑنی پڑے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

''مگر......'' مام نے کہا ہی تھا کہ ڈیڈ نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا۔

''زندگی اس نے گزارنی ہے۔ وہ جس کے ساتھ گزارنا پسند کرے۔'' انہوں نے پُر رعب لہجے میں کہا تو مام چاپ ہوگئیں۔

☆......☆......☆

''آپ نے اسے اتنی آسانی سے ٹینا کے علاوہ کسی اور سے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔'' مسز امینہ فواد نے غصے سے کہا۔

''وقتی اُبال ہے، اُتر جائے گا۔ کرنے دو اسے من مانی، آخر کو ٹینا نے ہی ہماری بہو بننا ہے۔'' وہ لاپروائی سے بولے۔

''کیا آپ کے ذہن میں کوئی پلان ہے۔'' مسز فواد نے مشکوک نگاہوں سے اپنے شوہر فواد کو دیکھا۔

''نہیں کوئی پلان نہیں ہے۔ یہ سازشیں اور پلاننگز وغیرہ کو مڈل کلاس تک ہی محدود رہنے دو۔'' وہ ہنس کر بولے۔

''پھر؟'' مسز فواد نے سوالیہ پوچھا۔

پھر یہ کہ اسے بھی اپنی خوشی پوری کرنے دیتے ہیں۔ یہ عشق محبت شادی سے پہلے تک کے قصے ہیں۔ وہ ڈھکی چھپی لڑکی ہے سو بیٹے کو اس میں کشش محسوس ہو رہی ہے۔ جب شادی ہو جائے گی تو بھوت اُتر جائے گا اور جب سوسائٹی میں مو نہیں کر سکے گی تو بے زاری محسوس ہوگی اور یوں یہ قصہ اختتام پذیر ہو جائے گا۔'' وہ لاپروائی سے بولے۔

''اور داؤد بھائی اور میراں آپی کو کیا جواب دیں گے۔'' وہ غصے سے بولیں۔

''انہیں میں سمجھا لوں گا۔ تم فکر مت کرو۔'' انہوں نے بے فکری سے کہا۔

☆......☆......☆

اور ہوا بھی یہی رشتہ لینے داؤد بھائی اور میراں آپی بھی ساتھ گئے تھے۔ مگر ان لوگوں نے بڑی شائستگی سے معذرت کر لی بقول ان کے ''ہم رشتہ اپنے برابر والوں میں کریں گے۔ اس طرح رشتہ نبھانے میں آسانی رہتی ہے۔ ایک ایسا رشتہ جس میں ایک احساسِ برتری اور ایک احساسِ کمتری کا شکار رہے کبھی پنپ نہیں سکتا، سو ہماری طرف سے معذرت ہے۔ آپ ہمارے گھر آئے، ہمیں عزت دی آپ کا بہت شکریہ۔'' اریش کے بابا نے بڑی سہولت سے معذرت کی۔

اور جب یہ انکار ذی نے سُنا تو وہ خاموش سا ہو گیا۔ تب ڈیڈ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''Don`t Worry My Son میں ایک بار اور کوشش کروں گا۔'' انہوں نے اسے تسلی دی تو اس نے مسکرانے کی ایک ناکام سی کوشش کی۔

☆......☆......☆

اس دن ٹینا بلاوجہ جا کر اس سے اُلجھ پڑی۔ اور اس کے الفاظ انتہائی جاہلیت سے پُر تھے۔

''اے! تُو سمجھتی کیا ہے خود کو Bitch۔'' وہ جا کر اپنی دوست سے بات کرتی اریش کے سر پر کھڑی ہو کر چلائی۔

''مس! آپ ہوش میں ہیں یا اپنی کلاس کے مروجہ اصول کے مطابق Drink کر کے آئی ہیں۔'' اپنی بے عزتی پر اریش کی آنکھوں سے بھی شعلے نکلنے لگے۔

''میں تو Drink کر کے آئی ہوں اور تُو گنگا نہا کر آئی ہے۔ فاحشہ! اونچے گھرانوں کے لڑکوں پر ہاتھ مارتی ہے۔ انہیں اپنی اداؤں سے رجھاتی ہے۔ اپنی قیمت بڑھاتی ہے۔'' وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

''اپنی زبان کو لگام دو، ورنہ......'' اور وہ ورنہ کہہ کر رُک گئی۔

''ورنہ......ورنہ کیا کر لے گی ہاں۔'' وہ اس پر چڑھی۔

''ورنہ۔'' اور اس کے ساتھ ہی اریش کا ہاتھ اُٹھا اور پوری قوت سے ٹینا کے چہرے پر پڑا اور وہ جنونی ہو کر ٹینا کی طرف لپکی مگر اس کی دوستوں لیزا اور جولی نے اسے قابو کر لیا۔ اور پھر یہ معاملہ پرنسپل کے آفس تک پہنچ گیا۔ پہلے ٹینا نے انتہائی برے الفاظ میں اپنا مقدمہ پیش کیا تو پرنسپل نے اریش کو دیکھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔

''میم! ان کے کزن نے مجھے پتا نہیں کہاں دیکھا، بہر حال وہ کافی عرصے سے میرے پیچھے

پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں منع کیا تو انہوں نے گھر رشتہ بھیج دیا، جسے میرے بابا نے انکار کردیا۔'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''ہونہہ منع کردیا۔ تُو نے خود کہا ہوگا کہ رشتہ بھیجے اور اب اپنی قیمت بڑھانے کو انکار کردیا۔ بول کیا قیمت ہے تیری۔ دلواتی ہوں ذی سے۔'' اس نے طیش میں کہا تو اریش کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''ٹینا ٹینا داؤد! اپنی زبان سنبھالو، آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کسی کی اس طرح بے عزتی کریں اور اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ زیادتی کس طرف سے ہوئی ہے۔ جو اریش احسان کا ہاتھ اٹھا ہے۔ آپ کو تو میرا لحاظ بھی نہیں ہے۔ چلیں سوری کریں اریش احسان سے۔'' پرنسپل نے غصے سے کہا۔

''ہونہہ مائی فٹ! سوری کرتا ہے میرا جوتا۔ ان جیسوں کو تو میں جوتے کی نوک پر رکھتی ہوں۔'' وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکل گئی۔

''اریش! پلیز کول ڈاؤن۔ یہ ایلیٹ کلاس کی لڑکیاں، ایسے ہی آپے سے باہر رہتی ہیں۔ ہم بھی مجبور ہیں، ورنہ دور دراز کے علاقوں کے ٹرانسفر بھگتیں۔ تم اس لڑکی سے فاصلہ رکھو۔'' پرنسپل نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔

''میم! میں خود ان سے فاصلہ رکھتی ہوں مگر یہ خود۔ لیکن آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں کوشش کروں گی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''جاؤ بیٹا! با ادب با نصیب، بے ادب بے نصیب۔'' انہوں نے کہا تو وہ جبراً مسکرائی۔

☆......☆......☆

اور ٹینا یہاں سے سیدھی فواد صاحب کے پاس پہنچی وہ اپنے آفس میں تھے۔

''انکل! آپ سب مل کر میرے ساتھ بڑا اچھا گیم کھیل رہے ہیں۔'' وہ غصے میں تلملاتی ہوئی ان کے سامنے کھڑی تھی۔

''اوہ مائی بے بی! مائی ڈاٹر، کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے اُٹھ کر اسے گلے سے لگایا۔

''ہونا کیا ہے وہ Bitch مجھے بتاتی ہے کہ ذی کا پروپوزل اس کے لیے آیا تھا اور وہ ریجیکٹ کر چکی ہے۔ ہونہہ مائی فٹ، کیا ہے انکل یہ سب۔ انگیجمنٹ رنگ میں پہن کر گھوموں اور پروپوزل اس کال گرل کو بھیجے جائیں۔'' وہ غصے سے بے حال تھی۔

''اوہ! مائی سوئیٹ چائلڈ! بس اتنی سی بات، یہ پروپوزل تمہارے فیوچر کی خوشیوں کے لیے دیا ہے۔ اگر ابھی ذی کو اس لڑکی سے محروم کردیا جائے تو وہ اس کے لیے Pain بن جائے گی، کسک بن جائے گی۔ اور وہ کبھی تمہارا نہیں ہوسکے گا اور تم لوگوں کی لائف ڈسٹرب رہے گی۔ مگر جب ذی اس سے بددل ہو کر تمہاری طرف آئے گا تو تمہارا پرستار، تمہارا قدر بن کر رہے گا ہول لائف۔'' وہ اسے کاندھوں سے تھامے آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

''مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔'' وہ مشکوک سے انداز میں بولی۔

''اس کی ضمانت ہے ہمارا تجربہ۔ 49 سال میری عمر ہے اور اتنے عرصے میں، میں نے گھاس نہیں کاٹی ہے۔ بالوں کو Paint نہیں کیا ہے۔ یہ سب تجربہ ہے جو بالوں کی سفیدی سے ظاہر ہوتا ہے۔'' وہ شوخی سے بولتے بولتے آخر میں سنجیدہ ہوگئے۔

''اور ہاں تمہارے لاسٹ سمسٹر کب تک ہو رہے ہیں۔'' وہ پوچھنے لگے۔

''After Two Weeks۔'' اس نے بے زاری سے کہا۔

''یعنی کہ نیکسٹ منتھ کی تمہاری ٹکٹس کرادی

جائیں۔'' وہ سوچنے والے انداز میں بولے۔
''ٹکٹس ...... وہ کیوں اور کہاں کی؟'' اس نے حیرانی سے فواد ارسلان کو دیکھا۔
''جہاں کی تم کہو اور میرا تو خیال ہے ورلڈ ٹور کرلو 6 To 8 منتھ کا جب واپس آؤ گی تو لائن کلیئر ہوگی۔'' وہ اطمینان سے بولے۔
''آر یو شیور۔'' وہ مشکوک سے انداز میں بولی۔
''یس آئم شیور! اور اگر نہ بھی ہوئی تو ہم اپنی سوئیٹی کے لیے کروادیں گے۔'' وہ انگلیوں کی پوروں سے اس کا گال چھوتے ہوئے بولے۔
''اوہ! انکل I Love You۔'' وہ ان کے گلے سے لٹک گئی۔
''مائی سوئیٹ بے بی! آئی لو یو ٹو۔'' وہ اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ ''اور ہاں وہ تم نے سُنا نہیں ہے Patience Bears Good Fruit۔'' انہوں نے دوبارہ کہا تو وہ دل سے مسکرائی۔

☆......☆......☆

اماں بڑی خوش خوش گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ انہیں چوڑیوں کا ایک بہت بڑا آرڈر ملا تھا جسے ان چاروں نے جلد ہی مکمل کرلیا تھا۔ اس کے اماں کو کافی پیسے ملے تھے کچھ ان کے پاس پہلے سے جمع تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ ان پیسوں سے اریش کے جہیز کی ایک دو چیزیں بنوا کر رکھ دیں گی۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی انہیں یہ روح فرسا خبر ملی کہ عدنان کا یونیورسٹی سے واپسی پر شدید نوعیت کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ ہاسپٹل میں ہے اور بے ہوش ہے۔ اس کی دائیں ٹانگ شدید متاثر ہے جس کا فوری آپریشن ہونا ضروری ہے۔
ان کے گھرانے پر تو یہ ایک قیامت تھی۔ وہ سفید پوش لوگ تھے جتنا جمع جتھا تھا وہ سب دو دن کی ہی دواؤں میں اُٹھ گیا۔ اب اللہ کا نام باقی تھا۔ بابا اور رضوان پیسوں کے لیے پریشان پھر رہے تھے تو گھر میں اریش کے جہیز کا ٹرنک خالی ہو رہا تھا۔ ایسے میں فواد ارسلان کی آمد نے اماں اور بابا کو چونکا دیا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں اپنے پیون سے عدنان کا پتا چلا ہے جو یہاں قریب ہی رہتا ہے۔'' مگر اس وقت کسی کو جستجو نہیں تھی کہ وہ اس پیون کا پتا لگائیں جو کہ فواد ارسلان کے آفس میں کام کرتا ہے۔ اس وقت سب کو یہ تجسس تھا کہ فواد ارسلان کیوں آئے ہیں۔ اور پھر یہ معمہ بھی حل ہوا کہ بقول ان کے وہ عدنان کا مکمل علاج کروانے کو تیار تھے مگر ان کی گزشتہ آفر کی قبولیت کے بعد۔ گھر والے اب بھی ہچکچا رہے تھے مگر اریش نے آگے بڑھ کر ہاں کردی اور عدنان کا علاج شروع ہوگیا۔ اماں بابا نے کہا بھی کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ پتا نہیں ان لوگوں کا کیا مقصد ہے؟ کیا غرض ہے؟'' مگر وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔
''اب تو کوئی بھی مقصد اور غرض ہو۔ بھائی کی زندگی اور ان کے مستقبل سے زیادہ نہیں ہے۔'' اماں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔
''مگر بیٹا......'' مگر اس نے ان کی بات درمیان میں کاٹ دی۔
''کوئی اگر مگر نہیں اماں! آپ اس لاش کو کفن پہنانے کی تیاریاں کریں۔'' وہ اسی بے تاثر لہجے میں بولی اور اماں خاموشی سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

عدنان کے پاؤں میں راڈ پڑی تھی۔ اور اس کا آپریشن کامیاب ہوا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ چلنے پھرنے کے لائق ہوسکتا تھا۔ ہاسپٹل کا بل تمام دواؤں کے خرچ کے علاوہ بھی فواد ارسلان نے ان لوگوں کو پانچ لاکھ الگ سے دیے تھے۔
اور اب اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی تھی۔

سو بہترین ممالک کی درجہ بندی

یہ دنیا کے بہترین ممالک کی پہلی فہرست ہے۔ اس میں جو ترتیب ہے وہی کسی ملک کی پوزیشن کا اظہار ہے۔ ظاہر ہے ابتدائی یعنی ٹاپ ٹین بہترین ہیں اور جیسے جیسے نمبر بڑھتا جاتا ہے 'اچھائی' کم ہوتی جاتی ہے۔ اس فہرست سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اعداد و شمار ہمیشہ پورا سچ نہیں بولتے۔ یہ صورتِ حال کو دیکھنے کا ایک طریقہ ہے لیکن کچھ دیگر طریقے بھی وقتاً فوقتاً اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تو ابتداء ہے۔ فہرست یوں ہے۔ (1) فن لینڈ (2) سوئٹزرلینڈ (3) سویڈن (4) آسٹریلیا (5) لکسمبرگ (6) ناروے (7) کینیڈا (8) ہالینڈ (9) جاپان (10) ڈنمارک (11) امریکا (12) جرمنی (13) نیوزی لینڈ (14) برطانیہ (15) جنوبی کوریا (16) فرانس، سو ممالک کی اس فہرست میں ملائیشیا 37 ویں، کویت 40 ویں، متحدہ عرب امارات 43 ویں، بھارت 78 ویں، بنگلہ دیش 88 اور پاکستان 89 ویں نمبر پر ہے۔

یہ فہرست تمام مجموعی عوامل کو سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی۔

کرن اظہر کا حسنِ انتخاب۔ کراچی سے

شادی کا فنکشن فواد ارسلان نے ہی پی سی میں ارینج کروایا تھا۔ ذی کے گھر سے آئے انتہائی بیش قیمت لباس، زیورات اور ماہر بیوٹیشن کے باکمال ہاتھوں نے اسے اپسرا کا روپ عطا کیا تھا کہ ہر کوئی مبہوت ہوکر اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ لوگ اظہارِ خیال بھی کررہے تھے۔

''مسز فواد! آپ کی Daughter In Law تو بہت خوبصورت ہے۔ کہاں سے ملا آپ کو یہ Diamond اور بیٹا کا کیا ہوگا۔'' کسی بے تکلف فرینڈ نے امینہ فواد سے پوچھا۔

''ہوں Thanks ذی کی پسند ہے۔ سوچا تھوڑے دن دل بہلالے ویسے میری Daughter In Law تو بیٹا ہی بنے گی۔'' مسز فواد نے اس کے سر پر ہی کھڑے ہوکر کسی کی تسلی کی تو اس نے اپنی حیثیت کا تعین فوراً کرلیا۔

اور جب ذی کمرے میں داخل ہوا تو وہ بیڈ پر نہیں تھی۔ کھلے دریچے سے رات کی گھور تاریکی میں پتا نہیں کیا تلاش کررہی تھی۔

''مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ تم اس کمرے میں موجود ہو۔ میری بیوی، میری زندگی بن کر۔'' وہ اس کے پیچھے جاکر کھڑا ہوا اور اس نے اسے کاندھوں سے تھام لیا۔ اور پھر اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''حالانکہ آپ کو تو پُر یقین ہونا چاہیے مسٹر ذیشان فواد۔'' وہ بغیر مڑے زہر خند لہجے میں بولی۔

''ہوں تو اب تک ناراض ہو۔'' اس کے ہاتھ اس کے کاندھوں سے پھسل کر اس کی کمر کے گرد حمائل ہوچکے تھے۔

''ناراض؟ غلام ناراض نہیں ہوا کرتے۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

''غلام! کون؟ ارے غلام تو ہم ہیں آپ کے، بے دام غلام۔'' وہ بہک رہا تھا۔ تب ہی وہ اس کے بازوؤں کا حصار توڑ کر ایک جھٹکے سے مڑی۔

''آپ نہیں میں !!آخر اتنی بڑی مجبوری خریدی ہے آپ نے ہماری۔ میرے بھائی کا علاج کروایا ہے آپ نے، معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے مسٹر ذیشان فواد کہ وہ ایکسیڈنٹ کروایا بھی آپ ہی لوگوں نے ہوگا۔'' وہ اسی زہر خند لہجے میں بولی۔

''ایکسیڈنٹ، علاج؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا کیونکہ وہ تو ہر بات سے لاعلم تھا۔

''ہاں مسٹر ذیشان فواد، اور میں حیران ہوں کہ اتنی بڑی مجبوری خریدی آپ نے ہماری اور تب بھی شادی جیسا گھاٹے کا سودا کیا۔ حالانکہ آپ چاہتے تو مجھے اپنی رکھیل بھی رکھ سکتے تھے۔'' اس نے کہا اور اسی لمحے ذی کا بھاری ہاتھ اُٹھا اور اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔ اس کی نتھ کا پتا نہیں کون سا کونا اس کے کہاں چبھا کہ خون کی ننھی سی لکیر بہہ نکلی اور اریش نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''بہت بری ہو تم بہت بری، اگر تمہیں اندازہ ہوتا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں تو تم مرنا پسند کرتیں مگر ان الفاظ کو منہ سے نکالنا پسند نہ کرتیں۔ مگر نہیں جو لوگ تمہاری طرح غرورِ حسن میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ اسی طرح دلوں پر قدم رکھتے ہوئے گزرتے ہیں۔'' وہ کہہ کر مڑا اور تیزی سے چلتا ہوا باہر نکل گیا اور پتا نہیں کیوں اریش کو لگا کہ اسی لمحے اس کا دل ذیشان کے باہر جاتے قدموں کی طرف دوڑا تھا۔

☆......☆......☆

اس کے نکلتے ہی اریش کے آنسو بہہ نکلے جو پتا نہیں کب کے رُکے ہوئے تھے۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر تقریباً نوچنے والے انداز میں اپنے تمام زیورات اُتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکے، اس وقت اسے کمرے میں شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا، کچھ دیر وہ کمرے میں ہی ٹہلتی رہی اور آخر کار ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ باہر بڑی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی اور اس ہوا کی خوشگواریت نے اس پر خوشگوار اثر ڈالا اور وہ کچھ دیر والی بے بسی، بے چارگی، غم و غصے اور ٹینشن والی کیفیت سے نکل آئی۔ اور پھر وہ ٹہلنے لگی۔ اسے اس فل مون نائٹ میں ٹہلنا بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ حالانکہ اس کا فرشی غرارہ اس کے چلنے میں کافی حائل ہو رہا تھا مگر وہ دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے غرارہ تھامے خراماں خراماں چلتی کسی مغلیہ شہزادی کی یاد تازہ کر رہی تھی۔ اور پھر ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اندر سے آتی باتوں کی آوازوں اور الفاظ نے اس کے قدم ٹھٹکا دیے۔

☆......☆......☆

کمرے سے نکل کر ذی کچن کی طرف آیا۔ اس وقت پورے گھر پر سناٹے کا راج تھا۔ تمام لوگ سونے کے لیے جا چکے تھے۔ تمام ملازمین سرونٹ کوارٹر میں جا چکے تھے یا تو سب سو چکے تھے یا سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے کچن کی لائٹ آن کی، فرج کھولا اور پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگالی اور ڈیڑھ لیٹر والی بوتل کا وہ آدھے سے زیادہ پانی پی گیا لیکن اس کے اندر کی تپش اور الاؤ میں کسی طور کمی نہیں آئی، تب اس نے بوتل سنک میں پھینکی اور اس کے قدم ڈیڈ اور مام کے روم کے سامنے جا کر رُک کے۔ اور اس نے دروازہ ناک کیا۔

''کون؟'' اندر سے ڈیڈ کی آواز آئی۔

''اِٹس می ڈیڈ!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''ذی کیا ہوا؟ اندر آجاؤ۔'' انہوں نے کہا اور ساتھ ہی دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی ڈریسنگ اسٹول پر بیٹھی مام میک اپ اُتار رہی تھیں۔ انہوں نے شیشے کی اور سے اسے دیکھا۔ سوال ان کے چہرے پر بھی کھدا ہوا تھا۔

''ہاں بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' وہ رسان سے پوچھنے

گئے۔
''کیا بتاؤں کیا ہوا ہے ڈیڈ! میں اسے محبت سے تسخیر کر کے اپنی منکوحہ بنانا چاہتا تھا مگر آپ نے تو اپنی دولت اور طاقت سے زیر کر کے میری مفتوحہ بنا ڈالا۔'' وہ بڑے تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

''اتنی سی بات! میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟'' مام لاپروائی سے کہہ کر کلینزنگ کریم چہرے پر لگانے لگیں۔

''واقعی تم اتنی معمولی بات کے لیے اتنا پریشان ہو رہے ہو۔ تمہیں وہ چاہیے تھی وہ تمہیں مل گئی۔ کیسے؟ اس چکر میں نہ پڑو۔ پھل کھاؤ پیڑ مت گنو۔ جب تک دل چاہتا ہے رکھو پھر چھوڑ دینا۔'' انہوں نے لاپروائی اور سفاکی سے کہا اور وہ کئی لمحے خاموش رہا۔

''آپ شادی کو کیا سمجھتے ہیں محض کسی کے جسم کا حصول، اپنے نفس کی تسکین مگر میں ایسا نہیں سمجھتا شادی ایک معاہدہ ہے دو فریقین کے درمیان، ایک دوسرے سے محبت کا عہد اور وفا کی پاسداری کا۔ ایک گھر کی بنیاد رکھنے کا، اپنے آنگن میں کھلکھلاتی کلکاریاں سُننے کا، اور پھر اپنی نسل کو پروان چڑھا کر انہیں زندگی میں شامل کرنے کا۔ ڈیڈ! اریش میرے لیے جسم نہیں ہے۔ وہ میرے جسم میں میری روح کی مانند ہے اور رہ گئی جسم کے حصول کی بات۔ تو اس کلاس میں جسم بہت۔ ایک عرصے سے صوفی اور ماہی میری فرینڈز ہیں اور وہ میرے ایک اشارے پر تیار رہتی ہیں مگر مجھے اپنی لمٹس کا پتا ہے۔ اور صوفی اور ماہی پر ہی کیا موقوف ہے یہاں تو تمام سو کالڈ شرفا کی اولادیں کبھی بھی باآسانی نائٹ اسٹے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ اور گھر پر ایک کال کرنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ اور وہ سو کالڈ شرفا خود بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان کی اولادیں کہاں ہیں؟ ان پر بیک ورڈ ہونے کا الزام آ جاتا ہے۔ اگر مجھے اپنی لمٹس کا احساس نہ ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی بہت عرصے سے میری بیوی کا رول پلے کر رہی ہوتی اور رہ گئی اریش کو چھوڑنے کی بات تو اس بات کو تو آپ چھوڑ ہی دیں۔ میری زندگی میں تو یہ ناممکن ہے۔'' وہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ذی! آج تو تم نے ٹینا سے متعلق اتنی فضول بات کر دی ہے آئندہ نہ سنوں۔ میری بہو وہی بنے گی۔ اور اتنے بڑے بڑے دعوؤں کی وجہ بھی یہی ہے کہ ابھی ابتدا ہے۔ جب وہ سوسائٹی میں موو نہیں کر سکے گی تو سب سے زیادہ بے زاری بھی تمہیں ہی ہو گی۔ اور ہماری کلاس کی اچھائی کہہ لو یا برائی ہم ساتھ نہ چل سکیں تو علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ مڈل اور لوئر کلاس کی طرح بچوں کی خاطر ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے ساتھ نہیں گھسیٹتے۔'' مام نے تیز لہجے میں کہا۔

''ٹینا! نیور! کبھی نہیں۔ میں نے اس ماحول میں بھی خود کو ستھرا رکھا ہے مام۔ اور ٹینا، میں ڈینی سے اور جے ایل سے اس کے تعلقات کی نوعیت جانتا ہوں۔ ایسے ہی ان دونوں نے اسے نہیں چھوڑ دیا۔ اور یہ پتا نہیں پاکستانی معاشرے کی اچھی بات ہے یا بری، اس میں کلاس ڈفرنس بھی نہیں پایا جاتا کہ جو شادی سے پہلے حاصل ہو جائے اس سے ہمارے ہاں کے لڑکے شادی نہیں کرتے۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''ڈیئر! ابھی نیا نیا خمار ہے۔ ہم اس پر بعد میں بات کریں گے۔'' مام نے ٹشو سے فیس صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں واقعی ہم قبل از وقت بحث میں مبتلا ہیں۔'' وہ کہتا ہوا باہر نکلا۔

''میں ٹینا کے ساتھ کوئی زیادتی برداشت نہیں کروں گی فواد۔'' وہ اس کے نکلتے ہی بولیں۔

"ڈونٹ وری ڈارلنگ! نیا نیا خمار ہے۔" وہ بولے تو وہ بھی سر ہلانے لگیں۔

☆......☆......☆

دو دن بعد ولیمہ تھا۔ ولیمے کی ارینجمنٹ شیرٹن میں تھی اور آج وہ شادی والے دن سے بھی زیادہ حسین اور پُرسکون لگ رہی تھی۔ ٹینشن جو ریلیز ہو چکی تھی۔ مگر ذیشان اس کے پاس نہیں آ کر بیٹھا تھا۔ فوٹو سیشن کے لیے بھی اسے زبردستی بلایا جا رہا تھا۔ اور اس کا چھوٹا بھائی سعدی جو کہ خاصا منہ پھٹ تھا بول پڑا۔

"کیا بات ہے B.B کیا بھابی نے کاٹنا شروع کر دیا ہے تین ہی دن میں۔" تو ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

"شادی کر لو پھر تمہیں پتا چلے گا کہ بیوی کیسا اور کہاں کاٹتی ہے۔" بے باکی ان کے ماحول کی عام بات تھی، سو جواب بھی بے باکانہ تھا۔ وہ لجا کر رہ گئی۔

"کم از کم سعدی تمہاری طرح کچرا نہیں اُٹھا کر لائے گا۔" شزا نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ پیش گوئی کرنے والی تم کون ہوتی ہو، ہو سکتا ہے میں بھی B.B کے نقشِ قدم پر ہی چلوں اور جب کچرا اتنا دلنشین ہو تو ضرورت کیا ہے پھیکے شلجم لانے کی، اور شادی سراسر ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں غیر متعلقہ افراد کی انٹر فیرنس ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔" سعدی نے ناگواری سے کہا۔ وہ شزا کا اکھڑا اکھڑا رویہ کافی عرصے سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ بہت آزاد خیال لڑکا تھا۔ اس کا خیال تھا یا تو مام ڈیڈ پہلے سے اسٹینڈ لیتے یا اب انہیں اریش کو دل سے قبول کر لینا چاہیے۔

"کچرا کچرا ہی ہوتا ہے، اسے کتنا ہی اچھا ریپر عطا کر دیا جائے۔" وہ تنفر سے بولی۔

"تم اپنی فکر کرو، شہر کے اندیشے میں مت گھلو۔" وہ لاپروائی سے بولتا ہوا اریش کی طرف جھکا۔

"Don`t Mind Sister In law"

اس کا ایک اسکرو ڈھیلا ہے۔" اس نے باآواز بلند سرگوشی کی اور شزا پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

اریش کے گھر سے سب آئے تھے اور اس کو مطمئن اور خوش دیکھ کر وہ سب بھی مطمئن ہو کر گئے۔ مگر اب فواد ارسلان اور مسز فواد کے انداز میں نخوت اور استہزا ان سب نے محسوس کی تھی، سو وہ رُکے نہیں تھے جلد ہی واپس چلے گئے تھے۔

☆......☆......☆

اس محل نما گھر میں مام کے علاوہ تقریباً سب ہی صبح خیز تھے۔ ڈیڈ، ذی، سعدی اور شزا سب باقاعدگی سے جاگنگ پر جاتے تھے۔ اس کے بعد سب آ کر ہلکا پھلکا ناشتہ کرتے اور سعدی یونیورسٹی، شزا کالج چلے جاتے۔ ڈیڈ اور ذی آفس چلے جاتے تھے۔ پھر یہ اکیلا بھائیں بھائیں کرتا ہوا گھر ہوتا تھا۔ ملازمین کی فوج ہوتی تھی جو بغیر کسی آواز و آہٹ کے اپنے فرائض منصبی پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ اور وہ اکتا سی جاتی تھی۔ بڑے سے لان میں ٹہل ٹہل کر، اسے پورے لان میں پودوں کی ترتیب، ان کے نام ازبر ہو چکے تھے۔

مام عموماً ساڑھے بارہ یا ایک بجے جاگتیں۔ فریش ہو کر ایک گلاس جوس کا لیتیں اور تیار ہو کر نکل جاتیں۔ پھر ان کی کب واپسی ہوتی، اسے معلوم نہیں تھی۔ یوں بھی وہ اسے لفٹ ہی نہیں کراتی تھیں۔ وہ گھر میں ہوتیں یا نہیں، عموماً اس کے لیے دونوں کنڈیشن ایک سی تھیں۔ شزا بھی کالج سے آ کر کچھ دیر آرام کرتی پھر جم چلی جاتی۔ وہیں سے کوچنگ اور پھر واپسی پر تیار ہو کر کسی دوست کی طرف نکل جاتی۔

یہی حال ڈیڈ کا تھا۔ آفس سے واپسی پر کچھ

آرام اور پھر پارٹنرز اور کیدرنگز...... سعدی البتہ اسے کم سہی مگر وقت ضرور دیتا تھا۔ کیونکہ اس کلاس میں کسی کے پاس بھی کسی کے لیے وقت نہیں تھا۔ ذی آفس سے آکر اگر کوئی ضروری میٹنگ یا پارٹی نہیں ہوتی تو گھر پر ہی رہتا تھا۔ سعدی اس سے اکثر کہتا B.B، Sister In Law کو کس کے رکھیں، آپ نے بڑا آزاد چھوڑا ہوا ہے۔ سمجھدار بیویاں وہی ہوتی ہیں جو شوہروں کی لگامیں کس کر رکھیں۔'' وہ بڑی ترنگ میں کہتا۔

''تمہارا B.B پہلے ہی شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے اور کتنا کسوانا چاہتے ہو تم۔'' وہ آ کر اس کا کان پکڑ لیتا۔

''اوہو! Star Plus کی ساسوں اور نندوں کی طرح فوراً سن گن لینے آجاتے ہیں۔ Tips بھی نہیں بتانے دیتے Sister In Law کو شوہر قابو کرنے کے۔'' وہ کان سہلاتا۔

''Tips تو میں بتاؤں گا تمہاری مس رائٹ کو تمہیں قابو کرنے کی۔'' وہ بھی اس کی بات کا مزا لیتا۔ ''مر گئے ہمیں قابو کرنے والے، ہم تو آزاد پیدا ہوئے ہیں، آزاد ہی مریں گے۔'' وہ مزے سے کہتا۔

''دیکھیں گے۔'' وہ بھی اس کی بات اُڑاتا۔

آپی کا اکثر فون آتا رہتا تھا وہ شادی میں شرکت نہیں کر سکی تھیں۔ مگر انہیں وہ تصویروں اور بات کرنے میں اچھی لگی تھی وہ اکثر اس سے بات کر لیا کرتی تھیں۔ انہیں مام اور شزا کے رویوں کا اندازہ تھا۔ وہ اسے تسلی بھی دیتی رہتی تھیں اور ثابت قدم رہنے کا درس بھی۔

مام اور شزا کا رویہ تو اس کے ساتھ عجیب سا تھا۔ اکثر وہ دونوں جیولری اور کپڑوں وغیرہ کو ڈسکس کر رہی ہوتی تھیں اور وہ آجاتی تھی۔ تو وہ دونوں خاموش ہو جاتیں اور پھر وہاں سے اُٹھ جاتیں۔ وہ دونوں مختلف تقریبات میں پہننے کے کپڑے آپس میں ڈسکس کرتی تھیں۔ مام اور شزا کا فگر غضب کا تھا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ماڈل لگتی تھیں۔ مام کے دو بوتیک تھے جس کے پورے ملک میں آؤٹ لیٹس تھے۔ شزا بھی لندن سے فیشن ڈیزائننگ کا کورس کا ارادہ رکھتی تھی۔ اور یہ سب معلومات اسے سعدی کی طرف سے ملتی تھی۔ مام اور شزا جو جیولری استعمال کرتی تھیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ دونوں ہر ہفتے باقاعدگی سے پارلر جاتی تھیں۔

مام تیس سالہ آپی اور 28 سالہ ذی کی ماں تھیں مگر خود بامشکل تیس، بتیس سال کی نظر آتی تھیں۔ وہ اپنی بہت کیئر کرتی تھیں ان کا فگر چار جوان بچوں کی موجودگی میں بھی لڑکیوں والا تھا۔ وہ کھانے پینے میں بہت احتیاط کرتی تھیں اور پھر ان کو کون سی فکریں تھیں جو وہ بوڑھی ہوتیں۔ فکریں تو ان کے ہاں تھیں۔

اس کی اپنی ماں شادی کے وقت محض 14 سال کی تھیں اور اب بائیس سال بعد جب کہ ان کی عمر صرف 36 سال تھی وہ پچاس پچپن سال کی لگا کرتی تھیں۔ ان کا پورا سر سفید ہو چکا تھا۔ چہرہ بے رونق اور مدقوق ہو چکا تھا۔ اور اس پر تھکی تھکی اور پژمردہ چال۔

☆......☆......☆

دن بڑے بے کیف اور بوجھل تھے۔ اس دن اس نے نہ کپڑے بدلے نہ ہی بال بنائے تھے۔ اس کے سنہری بال اس کے چہرے کے گرد بکھرے اپنی ناقدری پر ماتم کناں تھے۔ وہ بے زاری سے بہت دیر تک کتاب ہاتھ میں پکڑے سامنے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ جبھی کھنکھار کر عاشی اور فاطمی اندر اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اور وہ ایک دم سے خوش ہوگئی۔ کتاب اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور بھاگ کر ان دونوں سے

لپٹ گئی۔
"تم دونوں کس کے ساتھ آئیں؟" اس نے فوراً سوال جڑ دیا۔

"ذیشان بھائی لائے ہیں۔ آپی ہم تو بہت ڈرے ہوئے تھے اس شادی سے مگر ذیشان بھائی تو بہت اچھے ہیں۔" فاطمی نے بڑے معصوم انداز میں کہا۔

"تم نے کیا اچھائی دیکھ لی ذیشان میں۔" اس نے یونہی ایک سوال پوچھ لیا۔ یا شاید وہ اپنی خوش نصیبی کا احوال اپنی بہنوں کے لبوں سے سُننا چاہتی تھی۔

"آپ تو آتی ہی نہیں ہو۔ بڑی لوگ جو ہوگئی ہو۔ مگر بھائی ہر ہفتے پابندی سے آتے ہیں۔ بڑے بھائی کی انہوں نے بڑی اچھی جگہ جاب لگوادی ہے۔ چھوٹے بھائی پڑھائی کے ساتھ ٹیوشنز اور پارٹ ٹائم جاب بھی کررہے ہیں۔ اماں نے کام چھوڑ دیا ہے۔ ہم نے پرانا گھر بیچ دیا ہے۔ بھائی نے ہمیں کچھ پیسے ملا کر بفرزون میں گھر دلوادیا ہے اور جو پانچ لاکھ تمہارے سسر نے دیے تھے۔ ان سے بابا نے لیاقت آباد مارکیٹ میں کپڑے کی دکان کھولی ہے۔ دکان کرائے کی ہے اب تو بڑا اچھا گزارہ ہوتا ہے۔" عاشی کی ریل چل پڑی اور وہ حیران سی اسے سُن رہی تھی۔ یہ درست تھا کہ وہ پچھلے ایک ماہ سے گھر نہیں گئی تھی۔ حالانکہ آخری فیصلہ خود اسی کا تھا مگر پتا نہیں کیوں وہ گھر والوں سے بھی ناراض تھی۔

"حیرت ہے اتنی تبدیلیاں آگئیں اور مجھے پتا ہی نہیں لگا۔" وہ خاصی حیرت سے گویا ہوئی۔

"آپی! تم اپنی خودساختہ مظلومیت سے باہر آؤ تو تمہیں پتا بھی چلے کہ باہر کیا کچھ ہورہا ہے۔" فاطمی عاشی کے مقابلے میں سمجھدار اور کسی حد تک منہ پھٹ تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" وہ تھوڑا تیز ہوئی۔

"مطلب یہ ہے کہ ایسا محلوں سا گھر اور راجکماروں سا جیون ساتھی۔ ہم جیسے لوگوں کے تو خوابوں میں بھی نہیں آتے ایسے راجکمار۔" وہ استہزائیہ ہنسی "اور اس پر مستزاد یہ کہ مخلص اور وفادار اور اپنی بے زاری اور حلیہ دیکھیے۔ قسم سے تمہارے ہاں کے ملازم تم سے زیادہ صاف ستھرے اور فریش نظر آرہے ہیں۔ یہ ملگجا لباس اور اُلجھے بال...... ایسے استقبال کرتی ہو تم روزانہ جیجو کا۔ قسم سے آپی اپنے علاقے کے سب سے صاف ستھرے گھر کے، سب سے زیادہ صاف ستھرے لوگ تھے ہم۔ آپی رب کی اس نعمت پر خدا کا شکر ادا کرو۔ اپنے خودساختہ دکھ سے باہر آؤ کہ وہ کبھی دے کر آزماتا ہے اور کبھی لے کر۔" وہ بولی تو بولتی چلی گئی اور اس نے سر جھکالیا۔

وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی وہ لوگ واقعی ہمیشہ صاف ستھری اور فریش نظر آتی تھیں۔ پھر اب کیا تھا۔ کہیں کوئی چیز تھی جو اسے کھٹکتی ضرور تھی۔ کوئی خوف، کوئی چبھن اور اب تو ایک نیا درد، نیا خوف مستقل ڈیرہ جمائے بیٹھا تھا اور وہ نیا درد تھا محبت...... وہ چپکے چپکے ہی ذی سے محبت کر بیٹھی تھی اور اسے خوف تھا کہ کہیں مام کی بات درست نہ ہوجائے۔ کہیں ذی اسے......
اور اس سے آگے اس کی سوچ زہریلی اور آنکھیں مرچوں سے بھر جاتی تھیں۔ وہ کئی بار تنہائیوں میں رو چکی تھی مگر یہاں آکر وہ بے بس تھی۔ تقدیر نے اسے کیا عطا کرنا ہے یا کیا چھین لینا ہے، وہ بے خبر تھی۔ کیا وہ کمپرومائز کرپائے گی۔ نہیں اس کا دل کسی معصوم بچے کی مانند ایڑیاں رگڑتا اور روتا تھا۔ اور پھر اس پر پژمردگی طاری ہوجاتی تھی۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوجاتا تھا۔ وہ خود سے بھی لاپروا ہوجاتی تھی۔ اور اس وقت وہ سوچ رہی تھی۔ واقعی وہ اس وقت اسے دے کر آزمارہا ہے اور وہ اس کی آزمائش

میں پورا نہیں اُتر رہی ہے۔ وہ ایک بار بھی سجدۂ شکر نہیں بجا لائی تھی۔ وہ تو نمازوں کو بھولی بیٹھی تھی۔ واقعی یہ خود ساختہ دُکھ و مظلومیت ہی تو تھی۔ وہ حال پر شاکر اور قانع ہونے کے بجائے مستقبل کے اندیشوں میں گرفتار تھی۔ اور وہ تو خود کہتا ہے کہ تم مجھ پر جیسا گمان رکھو گے میں تمہیں ویسا ہی دوں گا۔ تو وہ خوش گمان کیوں نہیں رہتی اور وہ تو کہتا ہے کہ اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔ تو وہ شکر کیوں نہیں کرتی۔ اس کا دل اچانک رقیق ہو گیا اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم دونوں بیٹھو میں ابھی Change کر کے آتی ہوں۔'' اس نے کہا اور انٹر کام پر ملازمہ سے فریش جوس اور اسنیکس لانے کا کہا اور وارڈ روب سے ایک خوبصورت سا لباس منتخب کر کے ڈریسنگ روم میں چلی گئی اور فاطمی بڑے انداز سے مسکرائی۔

''فاطمی! تم الفاظ کی جادوگر ہو۔ کیا زبردست اثر ہوا ہے تمہاری بات کا۔'' عاشی نے اسے شاباش دی۔

''نہیں عاشی! تمہیں پتا ہے یہ دل کی بری نہیں ہے مگر یہ کسی خوف، کسی اندیشے کا شکار ہے۔ اور اس خوف اور اندیشے کو شیئر بھی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ نہ ہم سے نہ جیجو سے، بس خود سلگ رہی ہے اور دھواں بنتی جا رہی ہے۔'' فاطمی نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

''ہاں فاطمی! ایسا تو مجھے بھی محسوس ہوا ہے۔ آپی کسی خوف کا شکار ہے۔'' اس نے اتفاق کیا۔

''مجھے یقین تو نہیں ہاں اندازہ ہے کہ یہ مستقبل کے اندیشوں میں گرفتار ہے کہ کیا ہوگا؟ جبکہ میرا خیال ہے کہ ان معاملات کو خدا پر چھوڑ دو کہ جو وہ چاہے گا وہ ہوگا۔ اور جو وہ چاہے گا وہ ہمیں قبول کرنا ہے بس۔ یہی بندگی ہے۔'' اس نے آرام سے کہا۔

''فاطمی! تمہاری سوچ بڑی واضح اور صاف ستھری ہے مجھے رشک آتا ہے تم پر۔ خدا تمہارے راستے آسان رکھے۔'' عاشی نے فاطمی کو دعا دی تبھی اریش باہر آئی۔ لباس کی تبدیلی اور بالوں کے سنوار اور ہلکی سی لپ اسٹک نے اس کو اتنا پیارا بنا دیا کہ ان دونوں کی نظروں میں ستائش اُتر آئی۔ اور تب ہی ذی کی اندر داخل ہوتے ہوئے اس پر نگاہ پڑی تو اس کے لبوں پر بڑی پیاری مسکان اُتر آئی۔ جسے اس نے رُخ موڑ کر لبوں میں دبا لیا۔

اور پھر دو دن عاشی اور فاطمی وہاں رہیں اور انہوں نے خوب انجوائے کیا۔ رات ڈنر باہر اور پورا دن کراچی کی خاک چھانتے گزرتی۔ سی سائیڈ، پارکس، اور شاپنگ پلازہ، وہ سارا دن گھومتیں۔ واپسی میں اس نے انہیں خاصا لاد کر بھیجا۔ وہ دونوں تو لے جانے کو تیار نہیں تھیں مگر وہ بھی انہی کی بہن تھی۔

☆......☆......☆

اس دن شام میں اس نے چائے لان میں ہی پی تھی کافی دیر تک لان میں ٹہلتی رہی تھی۔ ذیشان واپس آ چکا تھا اور وہ اوپر کمرے میں ہی تھا۔ جب وہ اکیلے ٹہلتے ٹہلتے بے زار ہو گئی تو تھکے تھکے قدموں سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے ہی ذیشان ایک ہاتھ بیڈ پر ٹکائے نیم دراز کسی فائل کے مطالعے میں مصروف تھا اور اسے دیکھ کر بھی اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ یہاں بھی کچھ دیر بے مقصد ٹہلتی رہی آخر تھک کر بیڈ کے دوسرے کنارے پر آ بیٹھی۔ ان دونوں میں بے تکلفی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ دونوں صرف ضرورتاً بات کرتے تھے۔ جس فاصلے کی بنیاد اریش نے شادی والی رات ڈالی تھی۔ ذی نے اسے مستقل کر دیا تھا۔ اس نے اس کے بعد مزید کوئی پیش قدمی نہیں کی تھی۔ اس لیے اس سے بات کرنے اریش کو جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن بات تو کرنا تھی، سو

مجبوری تھی۔ اس نے آخرکار ہمت کر ہی لی۔
''سنیں۔'' اس نے گلا کھنکھارا۔
''ہوں۔'' اس نے بھی ہنکارا بھرا۔
''وہ میرے پاس پورا دن کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میں بور ہو جاتی ہوں۔'' اس نے جلدی جلدی کہا۔
''تو آپ کسی کلب کی ممبر شپ لے لیں۔ میں دلوا دیتا ہوں۔ کوئی کورس کرنا چاہتی ہیں تو وہ کر لیں۔ کسی کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ کو جوائن کر لیں۔ کمپیوٹر پر تو ایک جہان آباد ہے۔ آپ کی ساری بوریت دور ہو جائے گی۔ اگر مطالعے کا شوق ہے تو ہماری اپنی لائبریری میں بہت اچھی بکس ہیں۔ ان سے استفادہ کر سکتی ہیں۔'' اس نے بغیر سر اٹھائے۔ مصروفیات کی ایک لمبی فہرست اسے تھما دی۔
''میں یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتی ہوں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔
''ٹھیک ہے! میں معلوم کرتا ہوں۔ اگر ایڈمیشن اوپن ہو گئے ہوں گے تو آپ کو فارم لا دیتا ہوں۔'' اس نے بات ختم کر دی۔ اور وہ کسی بات کا بہانہ ڈھونڈتی رہ گئی۔ نہ کوئی اعتراض نہ انکار، مکمل رضا ہی رضا۔ کیا وہ کھو سکے گی اس پیارے سے بندے کو اس نے ایک بار اسے جھڑکا تھا اور وہ کبھی اپنی طلب سے مغلوب ہو کر بھی اس کی جانب نہیں بڑھا تھا۔ کتنا مضبوط تھا یہ بندہ اور کتنا مکمل۔

☆......☆......☆

اس کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو گیا۔ صبح ہی ذی اسے آفس جاتے میں ڈراپ کر دیتا تھا اور واپسی میں ڈرائیور پک کر لیتا تھا۔ اب مصروفیات ہو گئی تھیں۔ واپسی پر وہ لنچ کر کے سو جاتی تھی اور شام میں چائے وغیرہ پی کر اپنی اسٹڈی میں مصروف ہو جاتی تھی۔ اسائنمنٹ بن رہے ہیں پریزنٹیشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بکس کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر سے بھی استفادہ کیا جا رہا ہے۔ اب اس کے پاس بور ہونے کا وقت بھی نہیں تھا۔ ہاں مگر رات اس کی بڑی ڈسٹرب ہوتی تھی اور بے چین رات کی چغلی صبح اس کی آنکھوں کی لالی کر رہی ہوتی تھی۔ اور وہ اس سے آنکھیں چُرا رہی ہوتی تھی۔ اور اس کی ڈسٹربنس کی وجہ اس سے معمولی سے فاصلے پر سویا ہوا ذی ہوتا تھا۔ وہ دونوں ایک بیڈ پر سونے والے دریا کے دو الگ پاٹ تھے۔

اب اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ابتدائی رات کی مانند اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرے۔ اسے بتائے کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ اور وہ کیا وجہ تھی جس نے اسے متاثر کیا تھا کہ اس نے کلاس ڈفرنس کا بھی خیال نہیں کیا اور اسے حاصل کر چھوڑا۔ اور اب جب حاصل کر لیا ہے تو یہ لاتعلقی کیوں ہے؟ ٹھیک ہے پہلے دن اس کا رویہ خراب تھا۔ مگر کچھ خدشات اور ابہام تھے۔ جنہوں نے اسے روڈ کر دیا تھا۔ اس کے بعد کا قصہ تو اس کے سامنے تھا۔ اس کا شرمندگی لیے رویہ، اس کا کمپرومائزنگ انداز سب واضح تھا۔ مگر ذی کسی پتھر کی مانند سخت ہو چکا تھا جسے جونک لگ ہی نہیں پا رہی تھی۔
وہ روز اسے چھوڑنے جاتا مگر ایسے جیسے کوئی فرض ادا کر رہا ہوں، نہ کوئی بات، نہ اس کی طرف دیکھنا اور ایک دن وہ چڑ ہی گئی۔
''سنیں! آپ کو بات کرنا ناپسند ہے یا مجھ سے بات کرنا ناپسند ہے۔'' اس نے چڑ کر پوچھا۔
''دونوں ہی باتیں نہیں ہیں۔'' جواب نہایت سنجیدگی سے آیا۔
''تو پھر میرے ساتھ سفر کرنا ناگوار محسوس ہوتا ہے۔'' اس نے مزید کہا۔
''ایسا بھی نہیں ہے اور پلیز آپ مزید اندازوں

میں اپنے ذہن کو نہ تھکائیں۔ آپ سے بات کرنا، سفر کرنا، آپ کے ساتھ رہنا یا آپ خود مجھے ناپسند ہوتیں تو آپ میرے گھر میں میرا روم شیئر نہیں کر رہی ہوتیں۔'' جواب اسی سنجیدگی سے آیا۔ گویا فلسفے کا کوئی دقیق مسئلہ حل کر رہا ہو۔ مگر اس گفتگو کے دوران وہ اسے خود اُمیدی کا ایک جگنو تھما گیا تھا یا آپ خود کی صورت میں اور پھر باقی کا تمام راستہ K.U کے مسکن گیٹ تک خاموشی سے کٹا۔

☆......☆......☆

اور اس دن مام کے دربار میں ذی کی پیشی تھی۔

''ذی! یہ نیا ڈراما کیا ہے؟'' انہوں نے بے زاری سے کہا۔

''میں سمجھا نہیں مام۔'' وہ حیرانی سے بولا۔

''بس بہت ہو چکی۔ چار مہینے ہو گئے ہیں، اب فارغ کرواسے۔ ناں کہ تم اسے ایڈمیشن دلا کر بیٹھ گئے اور اب اس کے ڈرائیور بنے ہوئے ہو۔'' وہ بری طرح سے تپی ہوئی تھیں۔

''مام! ڈرائیور بنے ہونے کی بات کیا ہے۔ وہ میری ہاف بیٹر ہے، میری ذمے داری ہے۔'' اس نے رسان سے کہا۔

''اچھا اب اس ذمے داری کو فارغ کرو۔ ٹینا واپس آنے والی ہے۔'' انہوں نے سابقہ موڈ میں کہا۔

''ٹینا سے اس سارے معاملے کا کیا تعلق، اور میں نے غالباً آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ میرا اریش کو فارغ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کیپ اِن یور مائنڈ (Keep In Your Mind) مام۔'' اس نے اسی ٹھنڈے انداز میں کہا۔

''ٹینا سے اس معاملے کا تعلق کیوں نہیں ہے۔ شی از یور فیانسی۔ کیپ ان یور مائنڈ۔'' انہوں نے بھی اسی کا لہجہ اپنایا۔

''اِز ناٹ مام واز، جب کسی کی شادی ہو جاتی ہے تو سابقہ منگنیاں خود بخود ٹوٹ جاتی ہیں۔'' اس کا لہجہ بڑا ٹھنڈا ٹھار تھا۔

''مگر یہاں ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں ٹینا سے شادی کرنی ہوگی۔'' انہوں نے بھی بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا تو وہ ہلکا سا ہنس کر کھڑا ہو گیا۔

''اور ہاں اپنی بیوی کو بتا دینا۔ وہ جن حرکتوں میں مصروف ہے، ان سے بے خبر نہیں ہوں میں۔ اب میرے دوسرے بیٹے کو پھانسنے کے لیے اپنی جو بہنوں کو یہاں لا لا کر رکھ رہی ہے۔ اگر آئندہ یہ ہتھکنڈے استعمال کیے تو اسے اس کی بہنوں سمیت نکال کر گھر سے باہر کھڑا کر دوں گی۔'' وہ تپ کر بولیں۔

''انہیں وہ نہیں میں لایا تھا۔'' اس نے آرام سے کہا۔

''اگر تم بھی لائے تھے تو آئندہ ایسا مت کرنا۔'' انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر وارننگ دی۔

☆......☆......☆

اس دن بدھ تھا۔ ذی اسے یونیورسٹی گیٹ پر چھوڑتے ہوئے پہلی بار مخاطب ہوا تھا۔

''شام کو تیار رہیے گا آج ہم ڈنر باہر کریں گے۔'' اور وہ حیرت سے مڑی بھی مگر وہ گاڑی لے اڑا اور اس کے لبوں پر بڑی پیاری مسکان آئی تھی اور پھر اسے اس دن اس کی کئی دوستوں نے ٹوکا تھا۔ اور اس کی خوشی کا سبب پوچھا تھا مگر ہر بات کے جواب میں ایک اور مسکان اس کے لبوں کا احاطہ کر لیتی تھی۔

شام میں وہ بہت دل لگا کر تیار ہوئی تھی۔ اس نے بلیک ہلکے سے کام والی ساڑی باندھی اور اپنے گھنے لمبے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ ہلکے سے میک اپ بلیک اسٹون کی جیولری میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی یہ گواہی آئینے کی تھی۔

ذی اس دن جلدی آ گیا تھا۔ اس نے یونہی ایک اچنتی نظر اس پر ڈالی اور پھر وہ نظر ٹک گئی۔ اریش کو اس کی نگاہوں کا احساس ہوا تو وہ مڑی مگر تب تک ذی رُخ موڑ کر اپنی بے خودی چھپا چکا تھا مگر ایک نرم مسکراہٹ نے اس سے بھی اس کے لبوں کو چھوا تھا۔

''آپ تھوڑی دیر ویٹ کریں پلیز! میں ابھی فریش ہو کر آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور واش روم میں چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی بلیک تھری پیس سوٹ میں ملبوس، خوشبوئیں لٹاتا، اپنے وجود کی پوری رعنائی اور دلکشی سمیت اس کے سامنے تھا۔

وہ دونوں ساتھ چلتے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ سعدی انہیں دیکھ کر چونک گیا۔

''واپس آ کر نظر اُتر وا لیجیے گا B.B بدخواہوں کی نظر لگ جاتی ہے۔'' اس نے باہر جاتی شزا کو دیکھ کر کہا تو وہ 'اونہوں' کہہ کر باہر نکلتی چلی گئی۔ اور وہ دونوں مسکرا دیے۔

☆......☆......☆

وہ اسے لے کر شیرٹن آیا تھا۔ راستے میں اس نے بوکے بھی خریدا تھا ریڈ روز ز بوکے۔ یہاں ان کی ٹیبل ریزرو تھی۔ وہ اپنی ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے Glass Wall سے باہر کا نظارہ صاف نظر آ رہا تھا۔ لائٹنگ کی ارینجمنٹ نے ماحول کو خوابناک بنا رکھا تھا۔ وہ اس کے بالکل سامنے اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ موجود تھا۔ اور دل کی دھڑکنیں کسی مدھم لے پر تھرک رہی تھیں۔

ویٹر نے ان کے سامنے منرل واٹر کی بوتل لا کر رکھی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد بلیک فاریسٹ کیک لا کر ٹیبل پر سجا دیا، ایک خوبصورت ربن سے سجے نائف کے ہمراہ۔ اس نے حیرت سے ذی کی جانب دیکھا۔

''جنم دن مبارک ہو May You Have Many More'' اس نے مسکراتے ہوئے نائف اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے نائف تھام بھی لیا۔ اور اب اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہو رہی تھی۔ اسے کب کسی نے اتنی اہمیت دی تھی۔ اس نے اپنی Birth Day صرف اپنے برتھ سرٹیفکیٹ پر یا پھر اپنی اسناد پر دیکھی تھی۔ اور یقیناً وہیں سے ذی نے بھی دیکھی تھی۔ Birth Day کی یہ اہمیت بھی ہو سکتی ہے، اسے آج ہی پتا چلا تھا۔ اور اس نے اپنا سر سامنے ٹیبل پر ٹکا دیا۔

''کیا ہوا ہے؟ تمہیں برا لگا؟'' ذی کی آواز آئی۔

''نہیں بالکل نہیں۔ مجھے بہت اچھا لگا Thanks'' وہ سر اٹھا کر بولی اور سامنے سے ٹشو پیپر اُٹھا کر اس نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کر کے کیک کاٹا۔ ذی نے اسے وش کیا اور اس کے سامنے دو گرے مخملیں باکس رکھے۔ پہلا بڑا ڈبہ کھول کر اس نے اس کے سامنے رکھا اس میں ایک گولڈ کا سیٹ تھا جس میں ڈائمنڈ جڑے تھے۔

''یہ تمہارا رونمائی کا سیٹ ہے۔ جو ابھی تک میرے پاس ہے۔'' اور پھر اس نے دوسرا باکس کھولا اس میں خوبصورت سا گولڈ کا بریسلیٹ تھا۔ ساتھ ہی اس نے بوکے بھی اس کی جانب بڑھایا۔

''اور یہ تمہارا Birth Day گفٹ ہے۔'' اس نے بڑے دلنشین انداز میں کہا اور اریش نے سیٹ والا باکس بند کر کے اپنے سامنے رکھ لیا اور دوسرا باکس ذی کے سامنے ہی پڑا رہنے دیا۔ اور پھر اس نے اپنی کلائی آگے بڑھا دی۔ مگر اس سارے عمل میں اس کی نگاہیں جھکی ہوئی اور چہرے پر شرم و حیا کی لالی تھی۔

ذی کے لبوں کو بڑی جاندار مسکراہٹ نے چھوا تھا۔ اور اس نے بریسلیٹ باکس سے نکال کر اس

طرح سے اسے پہنایا کہ اس کی ایک انگلی نے بھی اس کی کلائی کو 'مس' نہیں کیا اور اس چیز کو اریش نے محسوس کیا تھا۔ اور وہ اس گریز کی وجہ جاننے سے قاصر تھی کہ وہ اس پر اتنا مہربان ہے تو یہ گریز کیسا اور کیوں ہے۔ دوسری طرف ذی تھا۔ جسے اس کے ایک لفظ 'رکھیل' نے بہت ہرٹ کیا تھا۔ وہ اس کی محبت تھی اس کا عشق، وہ اسے اپنی عزت بنا کر لایا تھا۔ اور اس نے اپنے لیے کتنا گھٹیا اور کتنا گرا ہوا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس کا خود سے عہد تھا کہ جب تک وہ اس لفظ کے لیے اس سے سوری نہیں کرے گی۔ وہ اس کے اور اپنے درمیان فاصلوں کو ختم نہیں کرے گا۔ وہ اس کی محبت تھی۔ اس کو دیکھ کر اس کا دل ہمکتا تھا۔ اس کو چھونے، اسے اپنی محبتوں کی برسات میں بھگونے کو اس کا من مچلتا تھا مگر اس نے خود پر بڑے کڑے ضبط کے پہرے بٹھا رکھے تھے۔ مگر وہ اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی کیئر کرتا تھا۔ اس تک کوئی آنچ نہیں آنے دیتا تھا۔

ابھی ڈنر سرو نہیں ہوا تھا کہ قریب سے ہی 'ہائے ذی' کی آواز ابھری۔ دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس رومانٹک ماحول میں اریش کو یہ آواز کسی منحوس گدھ کی طرح محسوس ہوئی تھی۔ سامنے ہی ایک خوبصورت سی لڑکی ایک لڑکے کے سامنے کھڑی تھی۔ پھر وہ لڑکے کی جانب مڑی۔

''ایزی! تم چلو میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ واپس ذی کی طرف مڑی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔'' اس نے بڑے انداز سے ذی کی جانب جھک کر کہا وہ لڑکی بلیک کلر کے کیپری پر مسٹرڈ کلر کے نیٹ کے ٹاپ میں ملبوس تھی جو کہ لائننگ کی قید سے آزاد تھا۔ اریش نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

''ہاں بنو کباب میں ہڈی۔'' ذی نے جل کر کہا تو اس نے چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگایا۔

''اچھا تو یہ ہے تمہاری مس رائٹ۔'' اس نے خاصی دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ''خوبصورت تو بہت ہے اور تمہاری ڈیمانڈ کے عین مطابق Shy بھی بہت ہے۔ ایکچولی میں تم لوگوں کی شادی اٹینڈ نہیں کر سکی تھی۔ میں ماریشس میں تھی۔ میں نے پہلی بار دیکھا تھا تمہاری مسز کو She Is So Innocent So Beautiful So Cute So Lovely'' وہ اس وقت بھی پیے ہوئے لگ رہی تھی سو بہک رہی تھی۔

''ڈفر تعارف تو کروادو۔'' آخر کار وہ بولی۔

''ہاں! اریش یہ میری فرینڈ ہے ضوفی اور You Know She Is My Wife Arish'' اس نے تعارف کی رسم نبھائی۔

''Yes! I Am Zofi, I Am Admirer Of Your Husband But He Is A Hard Nut ناک پر مکھی ہی نہیں بیٹھنے دیتا۔ تم خوش قسمت ہو تمہیں اس کلاس میں ایسا خالص اور ایسا سولڈ انسان ملا ہے۔ ورنہ ہماری کلاس میں جہاں مادر پدر آزادی ہے، کوئی دودھ کا دھلا نہیں ہے۔ مگر اس بندے پر میں قسم کھا سکتی ہوں۔ یہ واقعی دودھ کا دھلا ہے۔ ایسے ایسے مقام پر جہاں ڈیول ننگا ناچ رہا ہوتا تھا۔ یہ وہاں سے بھی آرام سے صاف ستھرا نکل جاتا تھا۔ کسی کی دعائیں ہیں اس کے سر پر، کسی نیک روح کی۔'' وہ بڑے جذب سے بول رہی تھی۔ اور اریش اس کے چہرے اور بولتے لبوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور ذی حیران ہو رہا تھا کہ آج ضوفی کو ہوا کیا ہے؟ کیوں سچ کی دیوی بنی ہوئی ہے۔

''اور ہاں ذی! جو میں نے ابھی کہا ہے وہی میرا تحفہ ہے تم دونوں کی شادی کے لیے۔ May! You Live Long To Each

Other'' کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ ذی نے حیرت سے اسے جاتے دیکھا جبکہ اریش نے اسے شانتی سے باہر جاتا دیکھا۔ ایک کانٹا جو کبھی کبھی پن کرتا تھا کہ اس کلاس میں اور آس پاس حسین چہروں اور اداؤں کی موجودگی میں کہ ذی بھی کہاں بچا ہوگا۔ وہ بھی نو سو چوہے کھائے بیٹھا ہوگا۔ وہ نکل گیا تھا اور ذی اس انوکھے تحفے پر غور کر رہا تھا۔ جو بہت خوبصورت تھا۔

☆......☆......☆

ٹینا آٹھ ماہ کے ورلڈ ٹور کے بعد پاکستان واپس آچکی تھی۔ مام اور ڈیڈ خاصے غصے میں تھے۔ اس کی دو تین بار کلاس ہو چکی تھی مگر وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ مام نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے اسے نہیں نکالا تو میں اسے دھکے دے کر نکال باہر کروں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی مام! میں اسے خود ہی یہاں سے لے جاؤں گا۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''کسی بھول میں مت رہنا ذی۔ تمہیں سب یہیں چھوڑنا پڑے گا۔ تمہاری تمام مراعات ضبط کر لی جائیں گی اور تمہیں فنانشلی بھی سپورٹ نہیں کیا جائے گا۔'' فواد ارسلان نے نخوت سے کہا۔

''نو پرابلم ڈیڈ! میں کوئی اندھا، لنگڑا، لولا، اپاہج، معذور یا محتاج ہوں؟ اپنے زورِ بازو سے اپنے اور اپنی بیوی کے لیے خدا کی زمین سے رزق تلاش کر سکتا ہوں۔'' اس نے تحمل سے کہا۔

''ہماری مدد کے بغیر پاکستان میں تو تم اندھے، لنگڑے اور محتاج و معذور سے بھی گئے گزرے ہو۔'' وہ غرور سے بولے۔ وہ سمجھ گیا وہ اپنے اختیارات اور اپنی پہنچ باور کرا رہے ہیں اسے۔

''رزق کے لیے پرندوں کو اڑان بھرنی ہی پڑتی ہے ڈیڈ! ہم بھی بھر لیں گے۔ پاکستان کوئی آخری سرزمین تو ہے نہیں کمائی کے لیے۔'' اس کے تحمل اور اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''کیا کرو گے باہر جا کر۔'' انہوں نے طنزیہ کہا۔

''ویسے تو میری ایجوکیشن کے مطابق مجھے کوئی بھی وائٹ کالر جاب آسانی سے مل سکتی ہے مگر ایسا نہ ہوا اور اسٹور کیپری بھی کرنا پڑی تو کروں گا۔'' اس نے رسانیت سے کہا۔

''وہاں کی مہنگائی کا اندازہ ہے تمہیں۔ ان مراعات کے جن کے عادی ہو، ان کے بغیر رہ سکو گے۔'' انہوں نے طنزیہ پوچھا۔

''نہ بھی رہ سکا تو کوشش ضرور کروں گا۔ محبت سب سکھا دیتی ہے ڈیڈ۔'' وہ سکون سے بولا۔

''ہونہہ! خالی پیٹ کی محبت کی کوکھ سے ہی نفرت دبے زاری جنم لیتی ہے۔'' وہ جل کر بولے۔

''جس کی کوکھ سے نفرت جنم لے وہ محبت نہیں ہو سکتی۔ محبت اپنی کوکھ سے محبت کو ہی جنم دیتی ہے نہیں تو اپنی کوکھ ہی بنجر کر دیتی ہے۔'' اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''ہونہہ! گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔'' وہ پھنکارے۔

اب بہر حال بھتیجی انہیں اتنی بھی عزیز نہیں تھی کہ وہ اس کے لیے بیٹے کو در بدر کر دیتے۔ اسے بہر حال انہوں نے کچھ وقت انتظار کا کہا تھا۔ مگر ٹینا میں صبر و برداشت کہاں تھا؟ اس کے لیے تو یہ بات ہی سوہانِ روح تھی کہ جسے وہ ایک زمانے سے ذلیل کر رہی تھی۔ وہ ذی کی جلوتوں اور خلوتوں کی حصے دار تھی۔ جسے وہ دو کوڑی کا کہتی تھی وہ اس پرنس کی پرنسز تھی۔ جس کی بھی وہ بلا شرکت غیرے حقدار تھی۔ جو اس کلاس کا ہو کر بھی الگ تھا منفرد، جسے دیکھ کر اسے اپالو کا دھیان آتا تھا۔ جس کی وینس وہ خود بننا چاہتی تھی

مگر کوئی اور بن بیٹھی تھی۔

☆......☆......☆

وہ سنڈے کا دن تھا۔ اس دن اریش اور ذی نے اپنے روم میں ہی ناشتا کیا تھا۔ اور اب ذی واش روم میں تھا۔ اور وہ ایک میگزین کی ورق گردانی کررہی تھی۔ وہ ان تمام کہانیوں سے بے خبر نہیں تھی جو آج کل گھر میں ہو رہی تھیں اور وہ اس سلسلے میں ذی کی مضبوطی کی معترف تھی۔ اس سلسلے میں تو سعدی بھی ذی کا ہمنوا تھا اور آپی کا ووٹ بھی انہی کی طرف تھا۔ اور اس کی نظریں میگزین پر مگر اس کا دھیان انہی باتوں کی طرف تھا۔ کیا ہونے والا ہے کیا نہیں وہ خوفزدہ تھی۔ وہ کل بابا کے گھر گئی تھی۔ وہاں اس نے اماں سے بھی اپنے لیے دعا کے لیے کہا تھا۔ مگر اماں کو یہ سب اس کے خدشات لگے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ذی بہت اچھا ہے اور وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ دل تو اس کا بھی یہی کہتا تھا مگر یہ جو دماغ رکھ چھوڑا ہے ناں اللہ نے سر میں۔ وہ سب سے بڑا بیری ہے دل کا، اسے ساری زندگی دل سے اختلاف ہی رہتا ہے۔ اور یہ دماغ ہی تھا جو اسے ریڈ سگنل دیتا تھا جبکہ دل کے تو سارے ہی سگنل گرین تھے۔

اور تب ہی بغیر کسی دستک کے دروازہ دھاڑ سے کھلا اور ٹینا اندر داخل ہو کر اس کے سامنے تن کر آ کر کھڑی ہوگئی اور اسے دیکھ کر اریش بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کو کسی کے روم میں داخل ہونے کے مینرز نہیں آتے ہیں ٹینا داؤد۔'' اس نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''اوہو! بڑی مینرز والی بن رہی ہے۔ کسی کے فیانسی کو رجھالینا کون سے مینرز میں شمار ہوتا ہے۔'' وہ پھنکاری۔

''اب تو ریجھ ہی گیا ناں، اب کیا ہوسکتا ہے ڈیئر!'' اریش نے ایک عرصے اس کی بدتمیزیاں برداشت کی تھیں۔ اسے اس طرح جلتے بھنتے دیکھ کر اسے مزہ آ رہا تھا۔ سو بڑے دلکش انداز میں ہنس کر بولی۔

''بہت کچھ ہوسکتا ہے ڈیئر۔'' سامنے بھی ٹینا

وہ لمحہ جو میرا تھا

وہ لمحہ جو میرا تھا
اک دن
تم نے مجھ سے کہا تھا
دھوپ کڑی ہے
اپنا سایا ساتھ ہی رکھنا
وقت کے ترکش میں جو تیر تھے کھل کر برسے ہیں
زرد ہوا کے پتھریلے جھونکوں سے
جسم کا پنچھی گھائل ہے
دھوپ کا جنگل، پیاس کا دریا
ایسے میں آنسو کی اک اک بوند کو
انساں ترسے ہیں
تم نے مجھ سے کہا تھا
سے کی بہتی ندی میں
لمحے کی پہچان بھی رکھنا
میرے دل میں جھانک کے دیکھو
دیکھو سات رنگ کا پھول کھلا ہے
وہ لمحہ جو میرا تھا، وہ میرا ہے
وقت کے پیکاں بے شک تن پر آن لگے
دیکھو اس لمحے سے کتنا گہرا رشتہ ہے
خوشبو بند دریچے کھول رہی ہے
چاندنی راتوں سا موسم بھی
کلیاں بھی ہیں شبنم بھی
یہ سب میرے آئینے ہیں
اور ہر آئینے میں تم ہو!

شاعرہ: ادا جعفری

داو تھی ۔۔۔ تو کیا سمجھتی ہے تُو دنیا کی آخری حسین ہے کہ تجھے کچھ ہوگیا تو ذی آستانہ بنا کر بیٹھ جائے گا۔ دو دن میں بھول جائے گا۔'' وہ بھی اسی کی طرح ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

تو اس کے لیے تم کیا کرو گی۔ کرائے کے قاتل بلاؤ گی، میری سپاری دو گی، یا یہ نیک کام خود اپنے ہاتھوں سے انجام دو گی، یا کسی ملازم سے زہر دلواؤ گی۔ یا کسی جھوٹے ڈرامے سے یہاں سے نکلواؤ گی کیونکہ الحمد اللہ میں ہر لحاظ سے فٹ ہوں۔ Heart` Brain` Kidneys` Liver اور Stomach سب اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ یہ میں نہیں میری Physical رپورٹ کہتی ہے۔ کوئی کینسر یا ٹیومر بھی نہیں ہے اگر میری طبعی موت کا انتظار کیا تو تم خود بوڑھی ہو جاؤ گی۔ اور رہ گئی آستانہ بنانے یا نہ بنانے کی بات تو وہ ذیشان پر ہی چھوڑ دو۔'' وہ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''کچھ نہیں کروں گی۔ تجھے اس چہرے پر بڑا ناز ہے ناں! اسی کے بل پر تو ذی پر قبضہ کر کے بیٹھی ہے ناں! میں اسے ہی بگاڑ دوں گی۔'' وہ سفاکی سے بولی اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ شولڈر بیگ میں رینگا اور باہر آیا تو اس میں ایک دوا کے سائز کی بوتل تھی۔

''اسی چہرے سے ذی کو محبت ہے ناں! اسی چہرے نے میرے ذی کو مجھ سے چھینا ہے ناں! میں یہ چہرہ ہی جلا ڈالوں گی۔ تجھے پتا ہے اس شیشی میں کیا ہے۔ اس شیشی میں تیزاب ہے اور تیزاب بھی ایسا کہ وہ پھر تیرے چہرے پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گا۔'' وہ بڑے زہریلے انداز میں گویا ہوئی۔ اور اریش کے چہرے پر خوف سا لہرایا اور اس کے چہرے کا خوف محسوس کر کے وہ بڑے زہریلے انداز میں مسکرائی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے ڈھکنا کھولا اور اسے اریش کے سامنے اچھالا مگر اسی لمحے اس کے اور اریش کے درمیان میں ذی آ گیا۔ اور ٹینا نے ہاتھ کو روکنا چاہا تو اس اچھالنے اور روکنے کی کیفیت میں کچھ تیزاب ذی کے کاندھے پر گرا جو کہ اس وقت بنیان میں ملبوس تھا۔ اس کے لبوں سے سسکی برآمد ہوئی اور اریش کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے دوپٹے سے بہتا ہوا تمام Acid پونچھ ڈالا۔

''ذی میں تم پر نہیں......'' وہ خوفزدہ سی بولی۔

''مجھے پتا ہے ٹینا مجھ پر نہیں تمہارا ٹارگٹ تو اریش تھی۔ کیونکہ تم سمجھتی ہو کہ مجھے اس کے چہرے سے محبت ہے۔ تم اس کا چہرہ جلا ڈالو گی تو مجھے اس سے محبت نہیں رہے گی۔ تم کیا سمجھیں تھیں تم اس کا چہرہ جلا ڈالتیں تو مجھے اس سے محبت نہ رہتی۔ بہت غلط سمجھیں تم۔ اریش کے چہرے سے میں متاثر ہوا تھا۔ اس کی مضبوطی سے مجھے محبت اور اس کے کردار سے مجھے عشق ہوا ہے۔ تم اس کا چہرہ جلا ڈالتیں میں تب بھی اس سے عشق ہی کرتا۔ وہ میری محبت ہے، تھی اور رہے گی۔'' وہ شدید تکلیف میں تھا۔ اور وہ تکلیف اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ اور اریش بھاگ کر فرسٹ ایڈ باکس اٹھا لائی تھی۔

''ذی! مجھ میں کیا کمی ہے۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کوئی کمی نہیں ہے ٹینا! مگر ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے۔ تمہاری سوچ عین اس کلاس کے مطابق ہے اور میں اس کلاس میں موو کرنے کے باوجود مڈل کلاس سوچ اور ایسی ہی لڑکی پسند کرتا ہوں۔ بعد میں کلیش اور علیحدگی سے بہتر ہے ہمارا رشتہ اور دوستی برقرار رہے۔'' وہ آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

''ذی! سب سہی ہے مگر میں اس دل کا کیا کروں جو تمہارے لیے دھڑکتا ہے اور تمہاری تمنا

کرتا ہے۔'' وہ روہی اور آئنٹمنٹ لگاتی اریش نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کبھی تنہائی میں غور کرنا ٹینا میں تمہاری تمنا نہیں ہوں۔ تمہارا احساسِ شکست ہوں جو تمہیں چین نہیں لینے دیتا۔ تمہیں اریش کی جیت اور اپنی ہار چین نہیں لینے دیتی۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو تم ان سوال و جواب کی بجائے اریش کی جگہ تم میرے لیے پریشان ہوکر مجھے مرہم لگا رہی ہوتیں۔'' وہ پل بھر میں اسے اس کا چہرہ دکھا کر لاجواب کر گیا۔ اور وہ اپنا ہی چہرہ آئینے میں نہ دیکھ سکی اور پلٹ کر بل کھاتی باہر نکلی۔

''ذیشان! آپ فوراً ڈاکٹر کے پاس چلیں۔'' وہ حد درجہ پریشانی سے بولی۔

''مسیحا نے مسیحائی کردی اب کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔'' وہ بولتا ہوا پلٹا اور نئی شرٹ اٹھا کر پہننے لگا۔

''پلیز! ذیشان فار گاڈ سیک آپ.....'' اس کی بات اس نے درمیان سے اُچک لی۔

''تم نے فوراً صاف کردیا تھا Acid، اس وجہ سے اس کا زیادہ اثر نہیں ہوا بس Burnning ہورہی ہے۔ وہ بھی چلی جائے گی۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''پھر بھی ذیشان Acid تھا یہ۔ ڈاکٹر کو دکھا لیں تو بہتر ہے۔ اس کنڈیشن میں لاپروائی اچھی نہیں ہے۔'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''تم کہتی ہو تو دکھا دوں گا۔'' وہ بول کر پلٹا اور باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

اس کی بے ساختگی اس کا راز کھول گئی تھی۔ اور راز تو اس کا پچھلا رویہ بھی کھول رہا تھا مگر یہ لفظ 'رکھیل' کی جلن نہیں جاتی تھی۔

مام اور ڈیڈ کو جب سے ٹینا کی حرکت کا پتا چلا تھا وہ دونوں بھی ٹینا سے متنفر ہوگئے تھے۔ ہاں مگر اریش سے ابھی ان کے رویے میں بہتری نہیں آئی تھی۔ اور اس وقت بھی ذیشان اپنے زخموں پر ٹیوب سے لے کر مرہم لگا رہا تھا تب اس نے مرہم لگانے کی آفر کی تھی۔

''لایئے میں لگا دیتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نو تھینکس اٹس او کے۔'' اس نے بغیر مڑے کہا اور اپنا کام جاری رکھا۔ وہ اس کی جانب دیکھنے لگی۔ لاشعوری طور پر اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ پھر اچانک گویا ہوئی۔

''ذیشان! آئم سوری۔'' وہ مرہم لگا کر فارغ ہوچکا تھا۔ اس نے مرہم فرسٹ ایڈ باکس میں رکھا اور باکس جگہ پر اور کھڑا ہوکر شرٹ پہننے لگا۔

''سوری فار واٹ۔'' اس نے سوال کیا۔

''ہر اس بات کے لیے جو آپ کو ناگوار گزری، ہر اس بات کے لیے جو آپ کو بری لگی، اپنے پہلی رات کے رویے کے لیے، ہر اس بات کے لیے جو رکاوٹ ہے ہماری زندگی کی خوشیوں کی۔'' وہ آہستہ آہستہ بولتی چلی گئی اور بڑی خوبصورت مسکراہٹ نے ذیشان کے لبوں کا احاطہ کیا اور وہ شرٹ کے بٹن لگاتا اس کی طرف گھوما اور اب اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور وہ قدم اٹھاتا اس کے روبرو جا کھڑا ہوا اور وہ خاموشی سے اس کا سنجیدہ چہرہ اور بڑھتے قدم دیکھ رہی تھی۔ اور اس نے رُک کر اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ تھام کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا اور اگلے ہی لمحے وہ اس کے سینے سے لگی اور ذی نے اپنے دونوں ہاتھوں کا گھیرا اس کے گرد قائم کردیا۔

''سوری اور اتنی دور سے۔ اب کہو کیا کہہ رہی تھیں؟'' وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ اور اب اریش کی نہ آواز نکل رہی تھی اور نہ شرمگیں نگاہیں اُٹھ رہی تھیں۔

''کیا ہوگیا ہے؟ اب کہو ناں!'' وہ شوخ ہورہا تھا اور وہ شرم سے پانی پانی ہوتی اس کے سینے سے لگی

ہوئی تھی۔

''اریش! اپنی نئی زندگی کی ابتدا کرنے سے پہلے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جو گلے شکوے ہیں وہ دور ہونے چاہئیں۔'' وہ اسے خود سے الگ کرتے ہوئے بولا۔

''پہلے تم کہو۔''

''مجھے آپ سے کوئی شکایت، کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے ذیشان! اور جو تھے وہ بھی آپ کے رویے، آپ کی محبت نے دھوڈالے۔ ذیشان! آپ نے تو مجھے محبت کرنا سکھایا ہے۔ محبت تو سب ہی کرتے ہیں مگر محبت کرتے کیسے ہیں یہ آپ نے سکھایا۔ کسی کا خیال کیسے رکھا جاتا ہے، محبت میں قربانی کیسے دی جاتی ہے؟ کسی کے دکھ تکلیفیں کیسے سمیٹی جاتی ہیں۔ اس کے لیے دنیا سے لڑا کیسے جاتا ہے۔ اس تک آتے حادثوں کو خود پر منتقل کیسے کیا جاتا ہے۔ آپ میرے لیے سردی کی دھوپ کی مانند ہیں، گرمی کے نرم و خوشگوار جھونکوں کی مانند، بہار کے سبزے جیسے۔'' وہ سر جھکائے بولے جارہی تھی۔

''لیکن تم میرے لیے سمندر کی لہروں کی مانند ہو، قریب آتے ہی بھاگنے والی۔ ویسے راز کی بات ہے مجھے اور بھی بہت کچھ سکھانا آتا ہے کہو تو سکھاؤں۔'' وہ کہتا ہوا اس کی جانب جھکا اور وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

''نہیں پہلے آپ اپنے گلے شکوے دور کریں۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''یعنی اس کے بعد اجازت۔'' وہ شرارت سے بولا اور اریش نے مکا جما کر اس کے کندھے پر مارا اور اس کی مبہم سی سسکاری نے اسے بتادیا کہ اس نے غلط کندھے کا انتخاب کیا ہے۔

''اوہ! سوری ذیشان۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''اوہ نو! اٹس اوکے۔'' وہ فوراً بولا۔

''اریش! محبت روشنی کی مانند ہوتی ہے جو دلوں سے پھوٹتی ہے اور اپنے آس پاس کی ہر شے کو منور کر دیتی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔ جب میری محبت نے نکاح کے بولوں میں بھی بندھ کر تمہاری ذات کو منور نہیں کیا۔ مجھے تمہارا غصہ بجا لگا تھا۔ مگر تمہارا اپنے لیے 'رکھیل' کا لفظ استعمال کرنا مجھے جھلسا گیا۔ میں نے تم سے محبت کی تھی۔ تم میرا جنون، میرا عشق تھیں۔ میں نے سب سے ٹکر لے کر تم سے شادی کی تھی۔ نکاح کے مقدس رشتے میں جوڑا تھا۔ اس کے باوجود تمہاری بدگمانی نے مجھے توڑ دیا۔ تب میں نے خود سے عہد کیا تھا کہ میں تمہیں ہر خوشی، ہر آسائش دوں گا مگر یہ فاصلے تب ہی سمٹیں گے جب تم اپنے ان الفاظ پر سوری کروگی۔ اور وہ دن بالآخر آ ہی گیا۔'' وہ بولتا چلا گیا۔

''ذیشان! ان الفاظ کی وجہ تھی۔'' اور پھر وہ مام، شزا اور دوسرے لوگوں کے کمنٹس اسے بتاتی چلی گئی۔

''اریش! ٹینا مام کی بھانجی اور ڈیڈ کی بھتیجی ہے۔ ان کا ردعمل فطری تھا۔ مگر بہرحال انہوں نے، ڈیڈ نے اور شزا نے عام Star Plus کی ساس اور نندوں کی طرح تمہارے ساتھ چالیں تو نہیں چلیں ناں۔ تمہاری راہ میں رکاوٹیں بھی نہیں کھڑی کیں۔ جو کچھ کہا وہ زبانی جمع خرچ ہی رہا اور مام ڈیڈ تم سے محبت کریں گے۔ مگر وقت لگے گا۔'' وہ اسے اعتماد دے رہا تھا تو وہ کیوں نہ کرتی۔ پہلے ہی اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں اپنی محبت کے دروازے اپنے ہاتھوں سے بند کیے بیٹھی تھی۔ اور اب اس نے خود ہی محبت کے دروازے پر لگے زنگ آلود قفل کو کھول کر پھینک دیا تھا۔ اور محبت کی رم جھم اس پر برس رہی تھی۔

اس نے مسکرا کر محبت کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنا سر ذیشان کے سینے سے ٹکا دیا اور ذیشان کے مضبوط بازوؤں نے اس کے گرد ہالا بنالیا۔

☆☆......☆☆

افسانہ

پروین حیدر

مکلی سے بہشت تک

مجھے معلوم تھا کہ اب آنے والے لمحے میرے لیے اذیت ناک ہوں گے۔ لیکن ان لحات کو آنا ہی تھا ایک ایسے ہی اذیت ناک لمحے میں تم نے فون پر اطلاع دی تھی کہ بہشت نے تمہیں پروپوز کیا ہے۔ لیکن جواب کے لیے تمہیں وقت درکار ہے جوابھی......

یادوں کی ستم گری لیے، ایک یادگار افسانہ

میرا ماضی کرب کا اتھاہ دریا بن کر دل کی پیاسی زمین کو سیراب کر رہا ہے۔ یادیں نمو پا کر سرسبز و شاداب درخت بن کر اپنی جڑیں میرے پورے وجود میں پھیلا چکی ہیں۔ وقت کے غبار کے جزدان میں لپٹی

اَن مٹ یادیں دل کی محراب پرسب سے اوپر رکھی ہوئی ہیں۔ ذرا سا غبار چھٹا اور یہ مجسم ہو کر میرے روبرو بیٹھ جاتی ہیں۔ دو ہارے ہوئے اور تنہا رہ جانے والوں کی یادیں، ایک انجان راہ کے دو مسافروں کی یادوں جو اضطراب و بے چینی اور رنج وخوشی میں ایک دوسرے کے برابر کے شریک ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے نہ ہو سکے۔

''مکلی۔'یہی نام رکھا تھا ناں تم نے میرا؟'' میری پیدائش کے وقت تم چار سال کے تھے۔ بابا نے میرے کان میں اذان دینے کے بعد مجھے اپنے کشادہ سینے سے لگاتے ہوئے بے ساختہ کہا تھا۔ ''کلی' میرے آنگن میں کھلنے والی پہلی خوبصورت کلی! اور تم جو چچی کی گود میں بیٹھے اپنے ہاتھوں سے میرے لمس کو محسوس کر کے خوش ہو رہے تھے۔ بے اختیار بولے تھے۔

''بلے (بڑے) ابو میری مکلی ہے یہ۔'' پھر اسی نام سے مجھے تم نے پکارا، مکلی جو ایک چھوٹے سے شہر سے زیادہ اپنے قدیم قبرستان اور منقش مقبروں کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے، نہ جانے کب سے یہاں آسودہ خاک ہونے والوں کی وجہ سے یاد رکھا جاتا ہے۔ تم کہتے تھے۔

''جیسے مکلی کے اجڑے قبرستان میں صدیوں سے روحیں بھٹکتی پھرتی ہوں گی، بالکل اسی طرح تم بھٹکتی اور کھوجتی پھرتی ہو، کسے کھوجتی ہو؟ اپنے آپ کو یا اپنی روح کو۔'' اور میں سہم کر کہتی تھی۔

''حسین شاہ خدا کے لیے مجھے میرے نام کلی ڈاڈل شاہ کے نام سے پکارا کرو۔ مجھے ڈر لگتا ہے 'وحشت ہوتی ہے' صدیوں پرانے ویران اور اجاڑ مقابر کے نام سے، اچھا خاصا نام ہے میرا ''کلی۔''

''اونہہ...... کلی جیسی نزاکت، لچک، مہک یا خوبصورتی ہے تم میں؟ ایک عام سی لڑکی جس میں کوئی خاص بات ہے ہی نہیں، پھر میں تمہیں کلی کیوں کہوں مکلی؟'' اس لمحے اپنی بے آواز ہنسی چھپانے کے چکر میں تمہاری آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگتے تھے اور میں ماں کے قریب بیٹھ کر تمہیں منہ چڑاتے ہوئے کہتی تھی۔

''اچھی باتیں انسان کا سرمایہ ہی نہیں اس کی شناخت بھی ہوتی ہیں، مگر یہ زعم شاہ زادے، تم انسان کب ہوا پنی ان ہی حرکتوں اور دوسروں کی دل آزاری کرنے کی پاداش میں ایک دن سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔''

''تو یہاں کون سی جنت میں ہوں۔ ماں، بابا، بڑے ابو، بڑی ماں سب کی نگاہوں کا مرکز تو تم ہو، میں مسلسل نظر انداز کی جانے والی چیز سے زیادہ اہمیت کہاں رکھتا ہوں، جو اس ماحول میں خوش ہوں۔ جیسا یہاں ماحول ہے وہاں بھی ایسا ہی ہوگا۔ بس دعا کرو جلد یہ مرحلہ بھی طے ہو اور اس خاندان کی اکلوتی حکمران تم ہی بنی رہو۔'' تم قنوطیت بھرے لہجے میں کہتے اور میں دہل جاتی تھی۔

''اللہ نہ کرے اللہ نہ کرے۔ حسین کبھی تو کوئی اچھی بات کرلیا کرو۔ تمہارے وقت بے وقت موت و حیات کی باتیں کرنے سے میری جان نکلتی ہے۔''

''تم دیکھنا مکلی یہ مرحلہ بھی طے ہوگا اللہ کرے گا۔''

تم یہ بات اتنی قطعیت کے ساتھ کہتے تھے۔ جیسے یہ سب تمہارے ہی اختیار میں تھا۔ چچا چچی، اماں بابا سب تمہارے اس جملے' اللہ کرے گا' سے پریشان ہو جاتے تھے۔ لیکن تم نے اسے اپنا وظیفہ بنالیا تھا۔ تمہاری زبان سے بارہا سنا یہ جملہ آج بھی کمان سے نکلے تیر کی طرح میرے شعور میں پیوست ہے۔

دادا مرحوم کے کشادہ گھر کے فراخ دل لوگ بند مٹھی کی طرح ایک ساتھ رہتے تھے۔ آدھا پورشن تم لوگوں کے استعمال میں تھا۔ آدھے اور کافی بڑے پورشن میں ہم لوگ تھے۔ پھوپی سکینہ (جو بیوہ ہو چکی

تھیں) ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ گھر کی پچھلی طرف بنی بڑی سی اوطاق ہمارا مہمان خانہ تھی۔ دادا بہادر نڈر اور برادری کے سردار تھے۔ ان کے بعد سرداری کا منصب بابا سائیں کو عطا ہوا تھا۔ گویا ہم دونوں اُس گھر کی ریاست کے حکمران تھے۔ چہیتے، لاڈلے سب کی آنکھوں کا تارا اور اپنی اپنی ہر ضد اور ہر بات منوانے والے۔ ہم اکٹھے رہتے، اکٹھے پڑھتے، اکٹھے ہنستے، اکٹھے روتے، ہم دونوں میں بچپن سے ایک گہرا تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ اعتماد، بھروسے اور اٹوٹ دوستی کا تعلق۔ ایک مرتبہ چچی نے کہا بھی تھا۔

''خدا نظر نہ لگائے بڑے ہوکر دونوں کی جوڑی کتنی پیاری لگے گی۔'' اور میں نے کہا تھا۔

''چاچی، اللہ نہ کرے۔ ہم صرف دوست ہیں اور دوست ہی رہیں گے۔'' مگر یہ میرے بچپن کی کہی ہوئی بات تھی اور یہ بچپن بھی زیادہ دیر ہمارے ساتھ کہاں رہا تھا، ہماری کم عمری ہی میں میں کتنے ایسے دکھ بھرے لمحات آئے تھے جو ایک ایک کرکے اپنی تخلیق کی ساعت میں قید ہوتے چلے گئے تھے۔

بالکل اچانک پہلے چاچا، پھر ماں، ان کے تھوڑے عرصے بعد بابا، پھر چاچی تھوڑے تھوڑے وقفے سے عدم کے سفر پر روانہ ہوگئے، نہ جانے کس کی بدنظر بھرے کنبے کو ختم کرگئی۔ پے در پے اپنے بہت پیاروں کی رخصتی کے لمحات میری کتابِ دل پہ لکھے وہ اَن مٹ اور اندوہ ناک باب ہیں، جنہیں میں کبھی بھول ہی نہیں پائی۔ وقت کی دھند میں لپٹی اِن کی یادیں آج بھی خون کے آنسو رُلاتی ہیں۔ بے یقینی، تنہائی اور بھری دنیا میں اکیلے رہ جانے کے احساس نے ہم دونوں کو بکھیر کر رکھ دیا تھا، کہنے کو ہماری دلجوئی کرنے کے لیے نوکر چاکر بھی تھے۔ بابا سائیں کے عقیدت مند بھی تھے، لیکن یہ ہمارے اپنے کہاں تھے۔ زبیدہ ماسی جنہوں نے ہمارے گھر میں ہی شعور سنبھالا اور ہمیں گودوں کھلایا تھا، ہمیں لمحہ لمحہ سنبھالتی تھیں۔ وہ یہ کہہ کر ہماری دلجوئی کرتی تھیں کہ بچو! یہ قسمت کی وہ باتیں ہیں جنہیں کوئی ٹال ہی نہیں سکتا۔ اس دکھ کے احساس سے سمجھوتا کیے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہوجائے گی۔ حوصلہ رکھو کہ حوصلہ زندگی کے لیے مہمیز ہے۔''

تم مرد تھے، اس لیے تم نے دکھ اپنے اوپر طاری نہیں کیے۔ میں عورت تھی جس کی تخلیق ہی دکھ کی مٹی سے کی جاتی ہے، دکھ کی اس کٹھن گھڑی میں تمہاری سنجیدہ و پیچیدہ بے معنی و بامعنی باتیں مجھے اندر سے سلجھاتی تھیں۔

☆......☆......☆

بقراط تو تم بچپن سے تھے، گھمبیر اور مشکل باتیں کرنے والے پڑھاکو۔

اپنے اطراف سے بے خبر رہ کر ہم نے بے رحم اور سفاک وقت کو روٹھتے، ہنستے، لڑتے صلح کرتے کب بِتا دیا، پتا ہی نہیں چلا۔ وقت کی سب سے بڑی اچھائی یہی تو ہے کہ یہ بُرا ہو یا بھلا گزر ہی جاتا ہے۔ تم نے اپنی اسکولنگ ختم کرنے کے بعد میرے بھی کالج میں جانے کے لیے دو سال کا بریک دیا تھا، ہم کالج میں بھی ساتھ ساتھ تھے۔ کالج کی کینٹین کے ایک گوشے میں جہاں کلاس ختم ہونے کے بعد ہم روز بیٹھا کرتے تھے، وہاں اس روز کے لیکچر سے لے کر جانے کتنی بار تم نے موت وحیات اور قانونِ فطرت کے ادق فلسفے پر اتنی بے ربط اور ثقیل گفتگو کی تھی کہ ہمارے گروپ کے لڑکے لڑکیوں نے ہمارے ساتھ وہاں بیٹھنا ہی چھوڑ دیا تھا اور تمہاری اس روز روز کی گفتگو سے بور ہوکر میں کہتی تھی۔

''حسین شاہ! تجریدی کہانیوں کی طرح تمہاری اُلجھی باتیں اور بہت پیچیدہ فلسفہ سُن سُن کر میں بور ہوجاتی ہوں۔ کبھی کوئی خوبصورت بات، کوئی موہنا جملہ بھی کہہ دیا کرو۔''

''مکلی! میرے ذہنی لیول تک آؤ، عام انسانوں کی طرح کی گفتگو مجھ سے کیوں سننا چاہتی ہو؟ اور اچھی طرح جانتی ہو کہ سطحی باتیں میں کر ہی نہیں سکتا۔'' تم بہت بارعب لہجے میں جواب دیتے تھے اور تمہارا وہ لہجہ آج بھی یادوں کی زنجیر میں جکڑے قیدی کی طرح میرے نہاں خانۂ دل میں مقید ہے۔

''دانش ور کی طرح مطالعہ کرو، اعلیٰ معیار کی ادبی کتابیں پڑھو اور سیکھو کہ لفظ کیسے برتے جاتے ہیں، جملوں کا دروبست کیا ہوتا ہے، گفتگو کتنا سلیقہ مانگتی ہے اور پھر یہ کہ اپنی باتیں کتنی تہہ داریوں میں لپیٹ کر ابلاغ کے کتنے اہتمام کے ساتھ دوسروں تک پہنچائی جاتی ہیں۔ لو یہ پڑھو۔'' تمہارے ہاتھ میں ''کربِ تمام'' تھی۔

''ٹھہرو ٹھہرو'' تم نے آنکھوں پر چشمے کو جماتے ہوئے کتاب میرے ہاتھ سے لے کر صرف ایک لفظ کا اضافہ کر کے کتاب مجھے تھما دی تھی۔ ''کربِ نا تمام''

''کیوں حسین، کربِ تمام، کیوں نہیں۔'' میں بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ اس طرح کہ میرے اندر کی ہلچل، اندر کا کرب، قہقہوں کی صورت سسک سسک کر ہونٹوں تک آ کر مچلتا رہا اور تم اپنے خوبصورت خم دار ہونٹوں کے گوشے سکیڑتے لاتعلق بنے کھڑے رہے۔

وہ کتاب آج بھی میرے تکیے کے نیچے موجود ہے۔ تمہارے حرف ایک مقدس امانت کی صورت اس کتاب میں محفوظ ہیں۔

''حسین، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں تمہیں اسی طرح یکسر نظر انداز کر دوں، جیسے پچھلے پانچ گھنٹوں سے لائبریری میں میرے ساتھ بیٹھنے کے باوجود تم فلسفے کی کتابوں میں اُلجھے مسلسل مجھے نظر انداز کر رہے ہو اور بہت بہتر یہ ہوگا کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔''

میں نے پیر پٹختے ہوئے اپنی اور تمہاری مشترکہ لائبریری سے نکلتے ہوئے کہا، اور اس وقت اضطراب کے عالم میں تم نے اپنے ہاتھ میں پکڑے چائے کے کپ کو ایک جھٹکے سے میز پر ایسے پٹخا تھا کہ وہ کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

''کیوں؟ کیا میرے بغیر رہ نہیں سکو گے؟'' میں نے میز پر سے کرچیاں سمیٹتے ہوئے یہ سوال اس یقین سے پوچھا تھا کہ جواب وہ ہوگا جو میں چاہتی ہوں، مگر ایسا نہ ہوا۔

''مکلی! ذہنی سکون کے لیے فضول و بے کار باتوں اور تلخیوں سے بچنا ثواب ہے اور ثواب کمانے کے لیے انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ چائے کی پیالی تو کیا اپنا اور تمہارا سر بھی پھوڑ سکتا ہے۔'' تم نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر نہایت اطمینان سے جواب دیا تھا۔ میں سارتر کے ان الفاظ سے متفق ہوں کہ ہر وہ لفظ جو ہم دوسرے کے سامنے ادا نہیں کر سکتے، ہماری ہار کا سخت اعتراف ہے۔''

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''مکلی تمہارے ساتھ بیٹھا بھی نہیں جا سکتا اور تمہارے بغیر رہا بھی نہیں جا سکتا۔'' تم نے اپنی گردن کو ہلکے سے جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

اُن دنوں کہ جب ہمارے کالج کی چھٹیاں تھیں، تم تصوف کے رموز، فلسفۂ حیات، سائنس، جدید سوشیالوجی اور جدید فلسفے کی کتابوں میں اتنے مگن تھے کہ تمہیں اپنے گردوپیش کی بھی خبر نہیں تھی۔ ماسی زبیدہ گرم گرم کھانا ٹیبل پر سرو کر کے تمہیں بار بار کھانا کھانے کے لیے بلاتی اور تم بھول جاتے تھے کہ تمہارے انتظار میں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور میں بھوکی بیٹھی ہوں۔

گھنٹوں بعد کسی کام سے تم ڈائننگ روم میں آتے تو تمہارے ہاتھ میں فلسفے کی کوئی ضخیم کتاب ضرور ہوتی تھی۔

''مکلی! یہ کتاب ضرور پڑھنا میرا خیال ہے اس قسم کی فلسفیانہ تصانیف کثرت سے چھپنی چاہئیں۔ فلسفے کے ساتھ جانے کیوں ہمارا رویہ اتنا معاندانہ ہے کہ ہم

نے تو اسے اپنی یونیورسٹیوں سے خارج کر دیا ہے۔ سرکاری سطح پر فلسفہ پڑھنے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ فلسفہ بالخصوص جدتی مادیت کے فلسفے کو نصاب میں شامل کیا جائے۔'' تم جیسے اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے اور میں چیخ کر کہتی تھی۔

''حسین خدا کے لیے بس کرو، کھانا کھاؤ، تمہارا فلسفہ اور لایعنی باتیں دیوانگی کی بھیانک شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں اور مجھے تم پر ترس آ رہا ہے، پلیز اپنے ذہن کے بکھرے ہوئے تار و پود کو یکجا کرو۔''

''کیا مطلب؟'' تم غیر ارادی طور پر بے اختیار چونکتے ہوئے پوچھتے تھے۔

''مطلب یہ کہ پھر تمہیں مجھ سمیت کوئی نہیں پوچھے گا کھانے کے لیے بھی نہیں۔'' پھر میں بھوک سے مغلوب ہو کر اکیلے ہی کھانا کھانے بیٹھ جاتی تھی اور تمہیں اُس وقت یاد آتا تھا کہ بھوک تو شاید تمہیں بھی لگ رہی تھی۔

☆......☆......☆

ہم نے امتیازی پوزیشن لے کر شاندار کامیابی کے ساتھ گریجویشن کر لیا تھا اور کالج کی خوبصورت فضا کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا تھا۔

''چلو اب ایک دوسرے کی ذات سے نکل کر ایک اور دنیا میں چلیں، ورنہ صرف تمہاری پناہ میں رہ کر میں گوشہ نشین ہو جاؤں گا۔'' تم نے اپنا اور میرا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کا فارم مجھے دیتے ہوئے ایک ادا سے کہا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، ملک خدا تنگ نیست۔'' میں نے خوش دلی سے تمہیں جواب دیا تھا۔ میں نے ایم ایس میں ایڈمیشن لیا تھا اور تم ایم فل کرنا چاہ رہے تھے۔ ایم فل میں فُل مارکس لے کر تم چاہتے تھے کہ تمہیں اسکالر شپ مل جائے اور تم پی ایچ ڈی کرنے ملک سے باہر جاؤ۔ پھوپی سکینہ جو کہ صاحبِ فراش ہو چکی تھیں اور تقریباً اپنے بستر کا حصہ بن چکی تھیں۔ وہ تمہارے اس دانشمندانہ فیصلے سے بہت خوش تھیں۔ انہیں فخر تھا کہ ان کے خاندان کا اکلوتا چراغ باہر سے ڈگری لے کر آئے گا۔ ابھی وہ مرحلہ بہت دور تھا، جب تم اونچی اور کھلی فضاؤں میں آزاد پنچھی کی طرح اڑان بھر کے بلندی پر اپنا آشیانہ بناتے، لیکن تمہارے چلے جانے کا روح فرسا احساس وقت سے بہت پہلے مجھے ہلکان کیے جا رہا تھا۔ افسردگی جیسے میرے وجود سے لپٹ کر رہ گئی تھی۔ بہ قول کسی کے 'غموں کی اپنی اتھاہ گہرائیاں ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ جوانِ گہرائیوں میں ڈوب گیا درد کی کٹھنائیاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔'

اپنے خدشات کو تم سے چھپائے میں بہت پریشان رہتی تھی۔ لیکن کتابیں ہاتھوں میں لیے یونیورسٹی کا گاؤن کاندھے پر لٹکائے میں فخر سے تمہارے ساتھ یونیورسٹی کیمپس میں دندناتی پھرتی تھی۔ یہاں باوجود لاکھ کوشش کے کسی بھی گروپ کا کوئی لڑکا میرے قریب بھی آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ پوری یونیورسٹی میں میری شناخت صرف تم تھے۔ کلی ڈاڈل شاہ، حسین، پریل شاہ۔ حسین، کلی، کلی حسین اور یہ شناخت میری سب سے بڑی ڈھال تھی۔

☆......☆......☆

تھرڈ ایئر شاندار کامیابی سے مکمل کر کے ہم فورتھ ایئر میں آ گئے، یونیورسٹی کے ہنگامے، ہلا گلا، الیکشن، سیاست ہر چیز میں ہم دونوں پیش پیش ہوتے تھے۔ ہمارا گروپ سب سے بڑا تھا۔ ہم سارے دوست چائے کے وقفے میں پوری کینٹین میں اس طرح سما جاتے کہ کسی اور کے لیے کوئی کرسی خالی ہی نہیں ہو پاتی تھی۔ یہاں ہم ہر موضوع پر دل کھول کر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں آپس میں شیئر کر کے بچوں کی طرح خوش ہوتے تھے۔ مجھے

خوبصورت، پُرکشش لوگ اور کسی بھی ٹاپک پر بنی تلی مدلل گفتگو ہمیشہ Convince کرتی رہی ہے۔ سارہ، نمرا، زویا، فاہم، ماریہ، کشف، فضہ، عمر، صدیق، شاہد، شاہ زیب، لالہ عرفان، تاصف، ابراہیم، یمسن، سب کے سب خوبصورتی کے ساتھ ذہانت کی دولت سے مالا مال تھے۔ سوائے لالہ رخ کے...... آنکھوں پر بہت پاور کا قدیم فیشن کا چشمہ لگائے بقراط کے خاندان کا فرد بننے کے چکر میں وہ بھی بہت شوق سے تمہاری طرح لاحاصل اور بے ربط گفتگو کرتی تھی اور اس گفتگو میں تم اتنے منہمک ہوجاتے تھے کہ کسی کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے تھے۔ یونیورسٹی میں بے دھیانی اور مجھے نظر انداز کرنے کے کئی واقعات تھے۔ جنہوں نے اکثر مجھے تم سے شاکی کیا تھا اور جہاں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگیں، وہاں یقین چپ چاپ ایک گوشے میں پڑا سوتا رہتا ہے۔ ایسی ہی کئی بے یقینی کی باتوں سے زچ ہوکر ایک دن میں تم سے بہت لڑی تھی کہ لاوا اندر ہی اندر پکتے پکتے ایک دن تو پھٹنا تھا۔

''حسین، کبھی کبھی ہم ان لوگوں کو مسلسل نظر انداز کررہے ہوتے ہیں، جو ہر لحہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، ایسے لوگ ایک بار ٹوٹ جائیں تو کانچ کی طرح بکھر جاتے ہیں، تمہاری بے ربط سوچیں اور پاگل نظریات میرے نظریات سے ٹکرانے لگے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں کسی دن ایسا دھما کہ ہو کہ پھر کچھ بھی باقی نہ رہے۔'' تم نے بہت نرمی سے کہا تھا۔

مکلی یہ ٹکراؤ ہی دراصل ہماری Identification ہے اور یہ شناخت ہی نہ رہی تو تمہیں کون پوچھے گا، میرا مطلب ہے ہمیں کون پوچھے گا؟'' تم نے کن انکھیوں سے میرے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اور یہ سچ ہے کہ وقت اور حالات کے جبر نے ہمیں تنہا کر کے اس قابل چھوڑا ہی کہاں کہ کوئی ہمیں پوچھنے کا تکلف کرتا۔ لوگ اپنی تکالیف کے ازالے کے لیے میرے پاس آتے ہیں۔ ہمارا زخم کسی نے کہاں دیکھا۔ رفاقتوں، محبتوں اور قرابت داریوں کے لہولہان لاشے ہم نے اپنے ناتواں کاندھوں پر تنہا اٹھائے اور اسی ناآسودگی سے ہم نے اپنے جینے کا جواز پیدا کیا ہے۔ ایک دوسرے کے خوابوں، واہموں اور تیقن پر اعتبار کیا ہے۔ تمہاری انا، تمہارے نظریات، تمہاری خواہشات کے میرے پاگل نظریات سے ٹکرانے کے بعد بھی تمہیں اپنے آپ میں سے نکال دینے کا مطلب اپنے ہونے کی نفی کرنا ہے اور پگلی مکلی، تم سمجھتی کیوں نہیں کہ بچپن سے لے کر اب تک زندہ رہنے اور کچھ کرلینے کی تگ و دو نے میرے اندر کا حوصلہ نچوڑ لیا ہے۔ میں اب تک بنا کسی منزل اور بغیر کسی نشان کے سفر کرتا رہا ہوں، مجھے کس راہ جانا ہے، کیا کرنا ہے؟ میں خود نہیں جانتا اور یہ میری زندگی کا سب سے زیادہ اُلجھا ہوا مرحلہ ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو مجھے معاشرتی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں، میں اپنی زندگی اپنے فلسفے کے مطابق گزارتا رہا ہوں اور گزارنا چاہتا ہوں۔ تمہارا جواب ناقابل تسخیر اور اٹل تھا۔

''ٹھیک کہتے ہو حسین شاہ، جن بے نام محبتوں پر یقین کا لیبل نہ لگا ہو، وہ محض دلوں سے نکل کر ابہام و اوہام کی فضاؤں میں منتشر ہوجانے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اور پھر یکطرفہ جذبوں کی کوئی دلیل کب ہوتی ہے؟'' میری آواز رندھ گئی تھی تم خاموشی سے ایک نسبتاً تاریک گوشے میں بیٹھے اس طرح سگریٹ پھونکتے رہے، جیسے میری باتوں کو دھوئیں میں اُڑا رہے ہو، پھر ایک گہرا سانس لے کر اپنے آپ کو روشنی کے رُخ لاکر کہا تھا۔

''بس دعا کرو اللہ کرے تمام مراحل جلد طے

ہو جائیں۔“

”بس حسین بس وہی بار بار کا دہرایا ہوا جملہ ”اللہ کرے۔“ وہی زندگی سے بیزارگی کی بے تکی خواہش، اب خدا کے لیے خوشی خوشی اپنے باہر جانے کی تیاری کرو اور جاتے جاتے مجھے بہت اعتماد سے یہ یقین دلاتے جانا کہ تم مجھے بھلا دو گے۔ میں بہ قول تمہارے ایک عام انسان جسے تم نے کبھی قابل اعتنا سمجھا ہی نہیں جس کی ذات سے رہائی پا کر تم دنیا کے ساتھ چل بھی سکو گے اور خوش بھی رہو گے۔“ میں اپنی رو میں کہتی چلی گئی۔

”مکلی، اس کا جواب تو زندگی کے ابدی کھیل سے متعلق ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جیت ہمارا مقدر نہیں، ہم بلا مقابلہ ہارنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ مقدر ہمارا سب سے بڑا حریف ہے۔ ہم چال چلتے ہیں، وہ ہمیں شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وقت اگر تمہیں بھلا دینے کی شہ دے گا تو میں اسے مات دینے کی کوشش بہر حال کروں گا۔ تم میری عادت بن گئی ہو اور بری عادتیں اتنی جلدی اور آسانی سے نہیں چھوٹتیں۔ بائی داوے کیا زندہ رہنے کے لیے بھلا دینے کی شرط ضروری ہے؟ پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی یاد ہی نہ آئے۔“ تم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں ایک بات اور وہ یہ کہ کیا تمہاری زندگی میں کبھی دانائی کا سورج طلوع ہو گا؟“

میرے اندر بہت سی نازک چیزیں ایک چھناکے سے ٹوٹ کر مجھے لہولہان کر گئیں۔ یونیورسٹی کو کامیابی سے خیر باد کہنے کے بعد اب تمہارے باہر جانے کا مرحلہ درپیش تھا، میرے لیے اعصاب شکن اور صبر آزما مرحلہ کہ جب تک کوئی خواب، کوئی خیال، کوئی خواہش ہمارے ساتھ ساتھ رہتی ہے، تب تک جینے کی امنگ بھی باقی رہتی ہے۔ اب اذیت کی کوکھ سے ایک مہیب اور پریشان کن عرصہ نمودار ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی بچپن سے اکیلے پن اور بے بسی کے آشوب کے مدو جزر سے گزرنے کے ایک لمبے سفر کے بعد بھی وقت کا کوئی ایک لمحہ کبھی میری زندگی میں خوشیوں کی نوید لائے گا بھی یا نہیں کون جانے؟

”حسین کیا وہاں جا کر تم اکیلے رہ سکو گے؟“ میں نے شمع کی لو کی طرح لرزتے دل کو سنبھالتے ہوئے تم سے پوچھا تھا۔

”اس احساس کے ساتھ پوری زندگی گزاری جا سکتی ہے کہ بہت سے لوگ ہمیں عقیدت کے اونچے سنگھاسن پر بٹھا کر ہمارا احترام کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہم سے اُنسیت رکھتے ہیں اور بہت سے لوگ ہمارے نظریات کو پسند کرتے ہیں۔“ جواب دیتے ہوئے تمہارے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”ٹھیک ہے میں تمہارے چہرے کی اس مسکراہٹ کو ختم نہیں کرنا چاہتی بس آج آخری بار یہ ضرور کہوں گی کہ تمہارے نزدیک زندہ اور جان دار جذبوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر صرف احساسات کے ساتھ پوری زندگی گزاری جا سکتی ہے تو پھر یہ چیخ چیخ کر کہا جا سکتا ہے کہ اب میرے یعنی مُکلی ڈاڈل شاہ کے احساس کی خلوت میں کوئی مخل نہ ہو، کسی کی یاد بھی نہیں۔ اب خدا کے لیے مجھے بھلا دینا کہ ضبط کی صلیب پر لٹکے لٹکے میں ہلکان ہو چکی ہوں۔“ میں نے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں خلا میں گاڑتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا۔

”حسین اس وقت میری آنکھیں ہیں، احساسات ہیں اور میں ہوں اور پتا نہیں یہاں میں ہوں بھی یا نہیں، مجھے کائنات کے پژمردہ چہرے پر تھکن کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔“ تم تھوڑی دیر تک حیرت سے مجھے دیکھتے رہے تھے، پھر غصے سے میرے سامنے رکھی تپائی کو الٹ دیا تھا۔

”ٹھیک ہے تم مجھے بھول جاؤ میں بھی تمہیں بھولنے کی کوشش کروں گا اور خدا کرے یہ مرحلہ......“

☆......☆......☆

تمہارے جانے سے کچھ عرصہ پہلے سکینہ پھوپی بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ ان کی تدفین کے بعد تم گھر آکر حیران ہوکر کہہ رہے تھے۔ 'وادیٔ حسین' کیا شاندار جگہ ہے، کراچی کا سب سے بڑا قبرستان جو نیٹ پر بھی ہے۔ صاف ستھرا اور شہر کے ہنگاموں سے دُور میرا تو خیال ہے آدمی مرے تو ایسی ہی جگہ دفن ہونا پسند کرے گا، جہاں اس کے اپنوں کے علاوہ کوئی اور اس کی تنہائی میں مخل نہ ہو۔ شاید میں بھی جاتے جاتے اپنی دو گز زمین کی بکنگ یہیں کرواتا جاؤں گا۔'' اور میں نے سہم کر اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ پھر نا معلوم وقت کی طویل چھلانگ نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا میں اور زبیدہ ماسی یہاں اکیلے رہ گئے اور تم اپنے تئیں دشوار گزار منزلوں کی طرف بڑھ گئے۔ ہم سب عدم سے ابد تک کے تنہا مسافر ہیں زندگی اور وقت اس سفر میں ہم سے کیا کام لینا چاہتا ہے کوئی نہیں جانتا، ہر نیا منظر پس منظر بنتا چلا جاتا ہے اور ہر پس منظر یاد بنتا چلا جاتا ہے۔ تم نے اپنے احساسات کی ملکیت میں اگرچہ میرے حصے کی گنجائش چھوڑی ہی نہیں تھی، پھر بھی تمہارے بعد میری روح کو کچلتا، روندتا اکیلے پن کا احساس مجھے بے کل کیے رکھتا تھا۔ ہر لحہ دل میں رہنے والے لوگ اتنی آسانی سے کہاں بھلائے جاسکتے ہیں۔ تم تو ہر لحاظ سے منفرد تھے۔ اپنے ہونے کا یقین دلانے والی شخصیت، تمہارا ذوق فلسفہ و پیچیدہ مدلل و مبہم ذہانت سے بھرپور گفتگو، تمہارے ہر ہر عمل میں ایک ایسا طلسم تھا جس کے حصار سے میں آج تک باہر نہیں نکل سکی۔

☆......☆......☆

ایبراڈ پہنچ کر تم نے اپنے ایک ایک لمحے سے مجھے باخبر رکھا تھا۔ وہاں یونیورسٹی میں تم نے داخلہ لے لیا تھا۔ اُس یونیورسٹی کا پُروقار ماحول، اسٹوڈنٹ کا نظم و ضبط اور صحیح معنوں میں اسٹڈی کیا ہوتی ہے، تم فون پر بتاتے رہتے تھے۔ یہاں اب مجھے کرنے کو کوئی کام ہی نہیں تھا، سوچا تھا ملازمت ہی کرلوں تاکہ ذہن بٹے۔ گھر کے کونے کونے سے لپٹی یادوں کے ہجوم سے نکل کر کچھ وقت باہر بھی بتا سکوں، سو میں نے ایک فرم میں ایگزیکٹو پوسٹ کے لیے اپلائی کیا اور مجھے یہ معرکہ سر کرنے میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ آفس میں سارا دن گزار کے شام ڈھلے تھکن سے چُور بدن کے ساتھ میری واپسی ہوتی تھی۔ ماسی زبیدہ کافی ضعیف ہوجانے کے باوجود گھر داری میں منہمک رہتی تھیں۔ ہم رات میں دیر تک باتیں کرتے، کھانا کھاتے، ٹی وی دیکھتے، پھر وہ ماں کی طرح میرا سر اپنی گود میں رکھ کر ہلکے ہلکے ہاتھوں سے میرا سر دباتیں اور وہ ناقابلِ بیان سُرور مجھے خواب وادیوں میں لے جاتا۔ جہاں تم میرے ساتھ ہوتے تھے۔

☆......☆......☆

ایک دن دفتر سے واپسی پر ماسی نے مجھے تمہاری ڈائری دی تھی، جو گھر کی صفائی کے دوران انہیں بک شیلف کی ایک دراز میں سے ملی تھی۔ نیلے رنگ کی ڈائری جو تم نے اتنی احتیاط سے رکھی تھی کہ اس پر پلاسٹک شیٹ لگی ہوئی تھی اور وہ کتابوں کے ڈھیر میں چھپا کے رکھی گئی تھی۔ شاید تم اسے اپنے ساتھ لے جانا بھول گئے تھے۔ شروع سے آخر تک اس ڈائری میں تم نے مجھ سے باتیں کی تھیں۔ وہ باتیں جو میں تمہاری زبانی سننا چاہتی تھی، آخری چند صفحات پر تحریر تھا۔

''مکلی تمہیں علم نہیں کہ بے شناخت ہونا معاشرتی موت ہے، لیکن تمہاری خوشی کے لیے مجھے یہ بھی قبول ہے۔ بلا مقصد ایک سرد جنگ کا آغاز تم نے کیا ہے، رد کرنے کا آغاز تمہاری طرف سے ہوا ہے، بھول جانے اور بھلا دینے کا اصرار تمہارا ہے اور اتنی پیاری، اتنی عزیز از جان ہستی کی بار بار کی استدعا کا بھرم رکھتے ہوئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی میں یہاں سے بہت

دور جانے والا ہوں، حالانکہ میرا ہر راستہ تمہاری طرف ہی آتا ہے۔"

اگلے صفحے پر تحریر تھا۔

"تمہاری زندگی پُر پیچ سہی پھر بھی مجھے اُمید ہے کہ وقت اور حالات کا کوئی داؤ تم پر چل جائے گا اور تم سب کچھ بھلا کر اپنے جینے کا جواز پا لوگی اور سچ یہ ہے کہ میرے جینے کا جواز صرف تم ہو۔"

اس سے اگلے صفحے پر تحریر تھا۔

"مکلی پگلی! تم بچپن سے اتنی جذباتی ہو کہ ہر معاملے میں تم نے دماغ کے بجائے دل سے سوچا اور میں نے دل کے بجائے دماغ کو فوقیت دی پگلی! بہت سے جذبے اظہار کے مرہونِ منت نہیں ہوتے۔" انہیں صرف محسوس کیا جاتا ہے۔ اظہار کے بعد وہ اپنی افادیت کھو دیتے ہیں اور میں اس لطیف و پاکیزہ جذبے کی افادیت کھونا نہیں چاہتا۔" ایک اور صفحے پر تحریر تھا۔

"کیا واقعی تم مجھے بھلا پاؤ گی؟ تمہیں بھلانے میں میرا جو نقصان ہوگا اس کی تلافی کون کرے گا؟ منافع تمہیں حاصل ہوگا اور خسارے میں میں رہوں گا۔ خیر ضروری نہیں کہ امتحان میں ہر ایک کو کامیابی حاصل ہو، کسی کسی امتحان سے اپنی قوتِ برداشت کا کتبہ اٹھائے واپس بھی آنا پڑتا ہے ناں۔"

اس کے بعد کیا کیا لکھا تھا، اسے پڑھنے کے لیے اب مجھ میں حوصلہ کہاں باقی بچا تھا۔ اپنی زندگی اپنے ہاتھوں تہہ و بالا کر دینے کے احساس کو چھپا کر جینا، ہنسنا اور اتنا ہنسنا کہ لوگ دھوکہ کھا جائیں، کمال ہے اور اس دن مجھے یہ کمال آ گیا تھا۔ شدتِ ضبط سے میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ میں ماسی زبیدہ کے مہربان کاندھوں پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونا چاہتی تھی۔ مگر پتھرائی ہوئی آنکھیں میرا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے ڈائری اپنے تکیے کے نیچے رکھی اور اپنی بربادی پر کتنی ہی دیر ہنس کے جشن مناتی رہی، شاید میں پاگل تھی یا اُس وقت پاگل ہو گئی تھی۔ حسین شاہ! میری قوتِ برداشت کا اتنا سخت امتحان؟ جس طرح حساس دل لوگ دل کے کھاتے کا پورا پورا حساب رکھتے ہیں۔ اسی طرح انسان ہونے کے ناتے میں بھی کچھ احساسات رکھتی تھی اور تم ہر لحہ اپنے ادق فلسفے اور لایعنی باتوں میں اُلجھا کر مجھے اس منزل تک آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ جہاں لمس کی حرارت زندگی کی لو کو تیز کر دیتی ہے۔ میں نے تم سے محبت کی بھیک مانگی تھی اور تم نے میرے خالی کشکول میں اپنی ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔

☆......☆......☆

ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ اس دن ٹوٹ گیا تھا۔ جس دن تم نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ تمہیں 'بہشت' مل گئی ہے۔ تمہاری کلاس فیلو جو تمہاری ہم مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ آریہ مہر خاندان کی ایرانی شہزادی تھی اور میں ایک عام سی لڑکی جس میں بہ قول تمہارے کوئی خاص بات تھی ہی نہیں۔ جو بچپن سے اپنی انا کے حصار میں قید تھی۔ مگر اس کے باوجود میں آس لگائے بیٹھی تھی کہ تم میرے جذبوں کے سامنے ہار مان کر مجھ سے مانگ لو گے۔ تمہارا کہنا تھا کہ بہشت میری طرح جذباتی نہیں، بلکہ اپنی فکر کو اپنے شعور کی کسوٹی پر پرکھ کر مثبت انداز میں آگے بڑھانے والی لڑکی ہے۔ اس کی گفتگو اور رکھ رکھاؤ میں ایک جہت اور ایک سمت کا احساس ہے، جس میں اس کا اپنا نقطہ نظر اور ساتھ ساتھ اس کے عقائد وافکار کی گہری چھاپ ہے۔ اس کی سب سے متاثر کن بات یہ ہے کہ وہ اختلاف کے اندر اتفاق کے پہلو نکال لینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور تم اتفاق میں بھی تضاد ڈھونڈھ نکالتی ہو، خیر اپنا بہت خیال رکھنا کہ اب تم اکیلی ہو اور جواب میں میں نے کہا تھا۔ حسین پلیز! اب تم اپنی بہشت میں خوش رہو اور مجھے

اس جنم میں جینے دو۔ اب مجھے کوئی یاد نہیں آتا تم بھی نہیں۔ میں نے تمہیں بھلا دیا۔ پھر تم نے میرے لہجے میں میرے جنون کو محسوس کر کے خدا حافظ کہہ کے فون بند کر دیا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ اب آنے والے لمحے میرے لیے اذیت ناک ہوں گے۔ لیکن ان لمحات کو آنا ہی تھا ایک ایسے ہی اذیت ناک لمحے میں تم نے فون پر اطلاع دی تھی کہ بہشت نے تمہیں پرپوز کیا ہے۔ لیکن جواب کے لیے تمہیں وقت درکار ہے جو ابھی تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس دن، اس پل مجھے بہشت کی ذہانت پر رشک آیا تھا کہ اس نے تمہارے اندر کے آدمی کو اپنی سوجھ بوجھ کے ساتھ دریافت کر لیا تھا۔ دکھ دینے والی حقیقت یہ تھی کہ تم نے میرے اندر کی عورت کو دریافت نہیں کیا۔ شاید اس تعلق کو نبھانے کا سلیقہ مجھ میں نہیں تھا یا پھر ہم دونوں کو اپنے اپنے جذبوں کے اظہار کا طریقہ ہی نہیں آتا تھا۔ میں جو چاہتی تھی وہ تم نے نہیں جانا اور جو تم نے پایا اس نے ہم دونوں کے درمیان ایک لمبی خلیج حائل کر دی۔ جب تم اپنی منزل پا ہی چکے تھے تو میں راستوں کا غبار اوڑھے اپنے بے سمت سفر کو کیوں جاری رکھتی، سو ہم ایک دوسرے کے لیے بیگانے بن گئے اور میرے احساسات نے لمحہ لمحہ زندہ رہ کر بھی موت جیسا عذاب سہا۔ حیرت ہے اتنی ذہنی اذیتوں کے بعد بھی میں زندہ رہی۔ دل تھا کہ مکلی کے اجاڑ و ویران مقابر کی طرح خالی ہو گیا تھا۔ مجھے پریشان اور بولائے بولائے پھرتا دیکھ کر ماسی زبیدہ ہلکان ہو کر مجھے اپنا گھر بسانے کی نصیحتیں کرتی رہتی تھیں۔

آخر کار ایک دن خاموشی سے وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئیں، سو میرے لیے تو میرا گزرا ہوا ہر پل اپنے پیچھے عذاب کے اَن مِٹ نقوش چھوڑتا گزرا۔ نقش جو ایک دفعہ کُندہ ہو جائیں تو پھر کبھی نہیں مٹتے۔ کیا میری حیثیت محض ایک کشتی کی سی تھی جو دوسروں کو منزل تک پہنچا کر پھر بیچ دریا میں آ جاتی ہے کہ اس کا خود کوئی کنارہ نہیں ہوتا...... اکثر میں یادوں کے ہجوم میں بھی تنہا رہ کر سوچتی تھی سب اپنی اپنی دنیا میں جا بسے میں بکھر گئی تو میرے ناکارہ وجود کو اب کون سمیٹے گا۔

☆......☆......☆

حسین! تمہارے جانے کے بعد یہ چار سال مجھ پر چار صدیاں بن کر گزرے تھے پھر ایک دن تم نے یہ مژدہ سنایا کہ تم نے مقالہ مکمل کر لیا اور اب بہشت تم سے کورٹ میرج کر رہی ہے، مگر تم ایک مرتبہ یہاں آنا چاہتے ہو، اپنے پیاروں کی قبروں کو سلام کرنے اور مجھ سے آخری رخصت لینے کے لیے پھر خدا جانے کب اور کن حالات میں ملاقات ہو۔ میں اب تم سے ملنا نہیں چاہتی تھی، لیکن تمہارے پیارے مجھے بھی بہت پیارے تھے، ان کی قبروں پر سلامی دینے سے تمہیں کیسے روک سکتی تھی کہ ان پیاروں سے میرا اور تمہارا تعلق ازل سے بھی پہلے کا تھا۔

☆......☆......☆

فون کی مسلسل بیل پر میں چونک کر جاگی تھی، ایک طویل اور بھیانک خواب تھا جو میں دیکھتے دیکھتے ہڑبڑا کر اٹھی تھی، تو کیا میں میز پر سر رکھے رکھے دوپہر سے سو رہی تھی اور اب رات گہری ہو چلی تھی۔

میرے خدا کتنا ڈراؤنا اور دل دہلا دینے والا خواب تھا میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے فون کا رسیور اٹھایا جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا جیسے کوئی اندوہ ناک حادثہ ہونے والا ہے، دوسری طرف کوئی بری خبر میری منتظر ہے۔

''ہیلو۔'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔ فون ایبراڈ سے آیا تھا۔

''ہیلو۔''

''خانم کلی میں بہشت ہوں۔ ابھی اسپتال سے کچھ لمحوں کے لیے حسین کے فلیٹ میں پہنچی ہوں، ان کی

ڈائری سے آپ کا نمبر لینے کے لیے اور آپ کو ایک بُری خبر دینے کے لیے۔'' اس نے سسکتی آواز میں کہا۔

''بری خبر؟ بہشت جلدی کہو کیا بات ہے۔'' میں نے متوحش لہجے میں دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

''خانم کلی آغا حسین کا کار ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ وہ میرے ساتھ کہیں کام سے جا رہے تھے، زخمی تو میں بھی ہوئی ہوں، لیکن میری انجری اتنی سیریس نہیں ہے۔ حسین کی حالت نازک ہے۔ ڈاکٹر انہیں بچانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ التماسِ دعا ہے۔''

''بہشت، بہشت۔'' میں دیوانوں کی طرح چیختی رہ گئی مگر بہشت فون رکھ چکی تھی۔

خالی ذہن اور بے پناہ کرب کے احساس کے ساتھ میں نے سجدے میں سر جھکا کر تمہاری زندگی کی دعا مانگی تھی۔ تمہاری سلامتی کے لیے گڑگڑا گڑگڑا کر التجا کی تھی۔ مشکل کشائی کی اس گھڑی میں کوئی بھی تو نہیں تھا جو مجھے ڈھارس دیتا۔ میری حاجت روائی کے لیے کون آگے بڑھتا، کون تھا جو میری جاں کنی کے اس لمحے میں مجھے سنبھالتا۔ میرے آنسو پونچھتا، شاید جس لمحے میں نے دستِ طلب دراز کیا تھا بابِ حاجت بند ہو چکا تھا۔ میری مراد وہاں سے ٹکرا کر لوٹ آئی تھی۔ میں بہشت کا دوسرا فون آنے تک کرب کی سولی پر لٹکی رہی تھی۔ اس کا فون آیا تھا اور اس نے بلک بلک کر روتے ہوئے مجھے اطلاع دی تھی کہ ایک ہفتے بعد تم آ رہے تھے، اپنی وصیت کے مطابق مجھ سے آخری رخصت لینے کے لیے۔ ایک ہفتہ میرے آفس کے کولیگ نے مجھے اور میرے گھر کو سنبھال کر تمہارے استقبال کے انتظامات کیے تھے اور تمہاری خواہش کے مطابق تمہیں تمہاری آخری آرام گاہ 'وادی حسین' لے جایا گیا۔ حسین میں نے تمہاری زندگی میں نہ سہی 'لیکن تمہارے آخری سفر کے وقت تمہارے لمس کی ٹھنڈک کو اپنے وجود میں اُترتا محسوس کیا تھا اور سوچا تھا بہشت، مکلی دونوں ناموں میں اتنی مماثلت، ان کے معنی و مفاہیم میں اتنی یکسانیت، مکلی اجاڑ و ویران آسودگانِ خاک کے مقابل، بہشت زہرہ ایران کے شہرِ خموشاں کا نام، جہاں میں شہداء کے لیے فاتحہ خوانی کرنے گئی تھی۔ ایک پُر رونق، آباد اور انسانوں کے ہجوم سے بھرا پُرا قبرستان، جہاں قدم قدم، روش روش گلاب و یاسمین کھلے تھے۔ اتنا سرسبز و شاداب قبرستان کہ قبریں گلاب کے پھولوں سے ڈھکی تھیں۔ وہاں میں نے دعا مانگی تھی۔

''اے خدا! میں نے اجڑے مقبرے کی طرح اپنے گھر میں زیست بسر کی ہے، اب اس آباد جگہ میں مجھے آسودۂ خاک ہونا نصیب کرنا کہ یہاں جتنے لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آتے ہیں، صرف اپنوں کی قبور پر ہی فاتحہ نہیں پڑھتے تمام قبور پر فاتحہ بھی پڑھتے ہیں اور ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ بھی کرتے ہیں۔ اور میں تو ویسے بھی جنم جلی ہوں، ٹھنڈک کی مستحق اور ہجوم کی متلاشی۔''

آج میں مکلی کے کسی ٹوٹے ہوئے مقبرے کی طرح اپنے شکستہ جسم کے منہدم قبرستان میں تمہاری یاد کا کتبہ لگائے سوچ رہی ہوں جانے والوں اور تنہا رہ جانے والوں کی روحیں وقت کے برزخ میں کب تک سلگتی رہتی ہوں گی اور جن کی جنم کنڈلی میں صرف دکھ تحریر ہوں، کیا وہ مر کر بھی سکھ پاتے ہوں گے یا ان کی بے چین روح کسی اور عذاب کا روپ بدل کر اپنے آپ کو کھوجتی پھرتی ہوگی...... ابد تک کے لیے۔

حسین یہ تجربہ کیسے کروں؟ اگر تم یقین دلاتے تو میں تجربہ کر گزرتی کہ کائنات کے اسراروں میں موت بھی تو ایک تجربہ ہے۔ مکلی، بہشتِ زہرہ، وادی حسین، سوچتی ہوں کہ ان ناموں کی مثلث کو اسی طرح یکجا ہو کر بچھڑ جانا رقم ہوا تھا لوحِ محفوظ میں۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

نعمان اسحٰق

میرے پرندۂ دل

''نینا سمجھداری سے کام لو تم۔ ڈیڑھ مہینے سے اوپر ہو گیا ہے حادثے کو ہوئے اور تم ابھی تک...... ویسے میں تو تمہیں سمجھدار سمجھتا تھا۔ جو کچھ ہو گیا ہے اسے قبول کرو کھلے دل کے ساتھ اور جب تم وہاں غالب کے پاس جاتی ہو اس وقت بھی تمہارے انداز ایسے پریشان کن ہوتے ہیں۔ بھئی اگر تم لوگ ایسا کرو گے تو غالب کو......

زندگی کی کٹھنائیوں کو عیاں کرتے، ایک خوبصورت ناولٹ کا پانچواں حصہ

نینا کے پاس مینا کو بتانے کے لیے بہت سارے قصے تھے۔ گھر میں ہنسی مذاق کے قصے، نیلوفر کے قصے...... مینا کے پاس بھی نینا کو بتانے کے لیے بہت سی باتیں تھیں۔

فلم انڈسٹری کی باتیں، بولی وڈ کی باتیں......

''تم نے باقاعدگی سے موویز دیکھنا شروع کر دی ہیں۔'' نینا نے پوچھا تھا۔

اسے مینا کی باتیں کچھ زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ شوبز نیوز اور انفارمیشن میں گہرائی تک دلچسپی لے رہی تھی۔

''ہاں! حرج ہی کیا ہے۔'' مینا نے نینا کے ساتھ اپنے آپ کو بھی کہا تھا۔

''سارا دن تو فارغ ہوتی ہوں۔ اچھی خاصی ریفریشمنٹ ہو جاتی ہے۔ تم بھی دیکھ لیا کرو۔''

''ہاں دیکھ لیتی ہوں کبھی کبھار۔ دو تین موویز دیکھ چکی ہوں۔ صحیح ہے آخر دو الفاظ کہتے ہوئے نینا کی آواز کافی دھیمی تھی۔

''اچھا کون کون سی؟'' مینا نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔ نینا کو اس کا اشتیاق عجیب لگا تھا۔

''دل والے دلہن کو لے جائیں گے۔'' نینا نے سوچتے ہوئے کہا تھا۔

''دل والے دلہن کو لے جائیں گے نہیں بلکہ دل والے دلہنیا لے جائیں گے۔'' مینا نے تصیح کی۔

''کیسی لگی تمہیں فلم؟''

''اچھی تھی۔''

''مجھے تو بہت اچھی لگی۔ شاہ رخ اور کاجول کا کیا شاندار کپل ہے۔ اس کپل نے تو ساری سپر ہٹ فلمیں دی ہیں۔ اور یہ فلم تو میگا ہٹ ہے ابھی تک 1995ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اب اتنے سال گزر گئے ہیں ابھی تک مراٹھا مندر سنیما پر موجود ہے۔ بہت اچھی فلم

ہے اور اس فلم کا وہ گانا ''ہو گیا ہے تجھ کو تو پیار سجنا'' واقعی کیا کمال گانا ہے۔ کاجول اس فلم میں بہت اچھی لگ رہی ہے۔ ویسے میری فیورٹ ایکٹرس بھی کاجول ہے۔ فنا میں کتنی اچھی لگ رہی ہے کاجول۔''

نینا بغیر پلکیں جھپکائے مینا کو دیکھے گئی۔ ''اس قدر۔'' دو الفاظ بھی اس کے ذہن میں اٹکے تھے۔ اس گانے کے بول میں موجود ''پیار اور سجنا۔'' مینا تو وہ لڑکی تھی جو ڈائجسٹوں میں بھی لو اسٹوریز اور پیار عشق والے اشعار ناپسند کرتی تھی اور یہ فلم جس کی کہانی محبت پر ہے۔ اف نینا کو کچھ ناگواریت محسوس ہوئی۔

''اتنا کیسے پتا ہے تمہیں۔'' نینا نے کچھ وقفے سے پوچھا تھا۔

''وہ میری دوست ہے نا ماریہ۔ اسے بہت دلچسپی ہے فلم انڈسٹری میں، تو بس مجھے بھی۔ وہ فلمی میگزین بھی لیتی ہے۔ تو میں نے اس سے چند پرانے فلمی میگزین پڑھنے کے لیے لیے ہیں، تو بس اب ......

ویسے کوئی حرج تو نہیں۔'' مینا نے خود ہی اپنے پچھلے ہوئے مسئلے کو بے ضرر قرار دیا اور نینا بس دیکھ کر رہ گئی۔
'کچھ صحیح نہیں ہے شاید۔' نینا نے سوچا تھا۔
......☆☆☆......
پورچ سے بیڈ روم آنے تک طٰہٰ حسب معمول ایکسائیٹڈ تھا۔
'مینا حسب معمول بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوگی۔ کتنی خوبصورت لگتی ہے مینا اس طرح میرا انتظار کرتے ہوئے۔' طٰہٰ بشاشت سے سوچ رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی طٰہٰ کے جوش میں کچھ کمی آ گئی تھی۔
مینا اسی طرح بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بس ایک فرق تھا۔ وہ میگزین پڑھ رہی تھی، فلمی میگزین۔
اس فیچر کا بس ایک چھوٹا سا پیراگراف رہتا تھا جو مینا پڑھ رہی تھی۔ بس اب اسے بھی پڑھ لوں۔ مینا اس پیراگراف کو پڑھ کر طٰہٰ کے پاس آئی۔
چند لمحے کی دیر ہوئی تھی مینا کو طٰہٰ کے قریب جاتے ہوئے، اور طٰہٰ کو یہ چند لمحوں کی دیر بھی بہت بری طرح کھلی تھی۔ کچھ چیزوں کے لیے چند لمحے بھی بہت ہوتے ہیں۔
''آ گئے آپ! بہت تھکے ہوئے ہوں گے۔'' مینا نے طٰہٰ کا آفس بیگ اُٹھا کر مطلوبہ جگہ پر رکھا تھا اور نیچے بیٹھ کر طٰہٰ کے جوتے اور جرابیں اُتارنے لگی۔
'یار میں بھی نا، ہر بات کو خواہ مخواہ محسوس کرنے لگ جاتا ہوں۔ اب اس نے میگزین رکھنے میں کچھ دیر کر دی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔' طٰہٰ نے اپنے آپ کو سمجھایا تھا۔
مینا جرابیں اُتارنے کے بعد طٰہٰ کے پاؤں سہلا رہی تھی۔
'میں بھی نا...... کیا کیا سوچ لیتا ہوں۔' طٰہٰ کو اپنی سوچ سے کچھ شرمندگی ہوئی تھی۔ اپنے پیروں پر مینا کا لمس طٰہٰ کو اچھا لگ رہا تھا۔

''کام زیادہ تھا آج؟'' مینا روز یہ سوال پوچھتی تھی۔ اور طٰہٰ بھی روز ایک ہی جواب دیتا تھا۔
''ہاں!'' کچھ دیر طٰہٰ کے پیر مینا اسی طرح سہلاتی رہی۔ خوشگوار احساس، خوشگوار وقت۔
پیر سہلانے کے بعد مینا واش روم سے ہاتھ دھو آئی اور پھر بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ طٰہٰ نے اپنا سر مینا کی گود میں رکھ دیا اور آنکھیں موند لیں۔ مینا طٰہٰ کے بال سہلانے لگی۔
''آپ کے آنے سے پہلے میں دیویا بھارتی پر لکھا ہوا فیچر پڑھ رہی تھی۔'' مینا نے طٰہٰ کے بال سہلاتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ دیویا بھارتی کو جانتے ہیں؟'' مینا نے طٰہٰ سے پوچھا تھا۔
طٰہٰ نے آنکھیں کھول کر مینا کو لحہ بھر دیکھا تھا، طٰہٰ کی نگاہوں میں شکوہ تھا، جسے مینا سمجھ نہ سکی۔
''ہاں! تھوڑا بہت، کافی سال پہلے ایک بلڈنگ سے گر کر مر گئی تھی۔'' طٰہٰ نے بے دلی سے جواب دیا تھا اور دوبارہ آنکھیں موند لی تھیں۔
''ہاں نوعمری میں مر گئی تھی۔ صرف انیس سال کی عمر میں، مجھے ماریہ نے تھوڑا بہت بتایا تھا اس کے بارے میں، اور اس کی تصویر بھی دکھائی تھی۔ لیکن تفصیلی طور پر میں نے اب پڑھا ہے۔ اس نے اپنا اسلامی نام ثناء رکھا تھا۔ اس نے اپنی شادی اور مذہب دونوں پوشیدہ رکھے تھے۔ ویسے اللہ کرے وہ مسلمان ہو کر ہی مری ہو۔ مجھے تو اس کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا ہے۔'' یہ سب بتاتے ہوئے مینا کے طٰہٰ کے بالوں کو سہلاتے ہوئے ہاتھ رُک چکے تھے اور طٰہٰ بس آنکھیں کھولے مینا کو دیکھتا رہا۔ مینا نے طٰہٰ کے بالوں کو دوبارہ سہلانا شروع کر دیا۔
طٰہٰ تین منٹ مزید مینا کی گود میں سر رکھے لیٹا رہا اور ان تین منٹ تک مینا یہی باتیں کرتی رہی۔ اور جب بات طٰہٰ کی برداشت سے باہر ہونے کو تھی، تب مینا

نے کہا تھا۔

''اوہ سوری! میں بھی نا کن باتوں کو لے کر بیٹھ گئی ہوں۔ ایسے ہی یہ بھی دھیان نہیں کیا کہ آپ تھکے ہوئے ہیں، چلیں آپ ذرا منہ ہاتھ دھولیں پھر کھانا کھاتے ہیں۔'' اور پھر طٰہٰ واش روم چلا گیا۔

بہت ساری مثبت اور منفی باتیں طٰہٰ کے ذہن میں گھومتی رہیں، لیکن پھر بھی مینا کا آخر میں کیا گیا ایکسکیوز کچھ نہ کچھ تلافی کر گیا تھا۔

دال چاول، اچار گوشت اور کسٹرڈ ڈائننگ ٹیبل پر سَرو تھے۔

''یہ کیا تم نے دال چاول بنا لیے ہیں، زنانہ ڈش۔ اور یہ کیا اچار گوشت، زنانہ پسند۔ مینا میرے لیے کچھ نہیں بنایا، بڑے افسوس کی بات ہے۔'' ڈائننگ ٹیبل پر ساتھ پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کے بعد طٰہٰ نے کہا تھا۔

مینا نے آنکھیں پھیلا کر طٰہٰ کو دیکھا تھا۔ صبح طٰہٰ خود انہی کھانوں کی فرمائش کر گیا تھا، حالاں کہ مینا کو دال چاول بنانے پر تاتل ہوا تھا...... لیکن طٰہٰ کی فرمائش کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے بنالیے تھے۔

''ہاں...... میں نے یہ سب چیزیں اپنے لیے بنائی ہیں۔ آپ نے جو کچھ کھانا ہے کچن سامنے ہے بنالیجیے۔''

مینا نے اچار گوشت کا ڈونگا اپنے سامنے کیا تھا۔ اور اس میں سے سالن ایک پلیٹ میں نکالا تھا۔ روٹی کا نوالہ بنایا تھا...... ساتھ ساتھ وہ مسکرا بھی رہی تھی۔

''تم مجھے بھولتی جارہی ہو۔''

یہ صرف مذاق میں کہا گیا جملہ نہیں تھا کچھ حقیقت بھی تھی اس میں۔

طٰہٰ کی خواہش تھی کہ مینا کھانا کھانے پر اصرار کرے یا پھر اس سے پوچھے وہ کیا کھانا چاہتا ہے تو وہ تیار کر دیتی ہے...... لیکن وہ مسکراتے ہوئے نوالے سے سالن لگارہی تھی جو کہ طٰہٰ کو اچھا نہیں لگا تھا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔'' مینا نے نوالہ خود کھانے کی بجائے طٰہٰ کی طرف بڑھایا، وہ دونوں ساتھ ساتھ پڑی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ طٰہٰ کی آنکھوں میں بے اختیار تھوڑی سی نمی آگئی۔ نوالہ منہ میں لینے کے بعد طٰہٰ نے آنکھوں کو مسلا تھا۔ مبادا مینا دیکھ نہ لے۔

مینا نے وہ نمی نہیں دیکھی تھی۔ مینا نے دوسرا نوالہ توڑنے کے لیے روٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا، جسے طٰہٰ نے پکڑلیا۔

''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میں تمہاری اندازی برداشت نہیں کرسکتا۔ مجھے کبھی نظرانداز مت کرنا۔'' طٰہٰ نے مینا کے دائیں ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا تھا اور مینا کو یہ بہت اچھا لگا تھا۔

''میں بھی آپ سے محبت کرتی ہوں۔'' مینا نے اٹکتے ہوئے کہا تھا اور طٰہٰ کو ایسے لگا تھا کہ جیسے اسے دنیا کی بہت قیمتی نعمت مل گئی ہو۔

اس نے مینا کے ہاتھ میں موجود کانچ کی چوڑیوں کو چھیڑا تھا۔ کانچ کی چوڑیوں کے کھنکھنانے کی آواز نے ماحول پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ بے اختیار طٰہٰ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مینا نے اس کے آنسو دیکھے تھے۔

''ارے یہ کیا! آپ رو رہے ہیں۔ رونے والی کوئی بات بھی ہے۔'' مینا کچھ پشیمان ہوگئی۔ اس نے بایاں ہاتھ بڑھا کر طٰہٰ کے آنسو صاف کیے تھے۔

''مرد روتے ہوئے بالکل اچھے نہیں لگتے......''

''کچھ نہیں ہوا بس۔'' طٰہٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور مینا نے نظریں جھکالی تھیں۔

یہ محبت بھرا دل تھا جو طٰہٰ کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا، مینا اس بات کو سمجھتی تھی۔ لیکن اسے سمجھ نہ آیا وہ کیا کرے۔

''مجھے کبھی نظرانداز مت کرنا۔'' یہ کہتے ہوئے طٰہٰ نے مینا کا ہاتھ چوم لیا تھا اور مینا نے طٰہٰ کی طرف دیکھا تھا۔

''کس قدر محبت کرتا ہے طٰہٰ مجھ سے۔'' مینا نے

سوچا تھا۔

''آج مجھے کھانا تم اپنے ہاتھ سے کھلاؤ گی۔'' طٰہٰ نے کہا تھا اور مینا نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆......

رطابہ اور غالب اب ساتھ ساتھ دکھائی دیتے تھے۔ کبھی لائبریری میں، تو کبھی کینٹین میں اور کبھی کبھار غالب رطابہ کے ڈیپارٹمنٹ میں بھی چلا آتا تھا۔

رطابہ اپنی دوستوں اور گروپ کو بتا چکی تھی کہ وہ غالب کی منکوحہ ہے اور اس گروپ کی بدولت اس کی اڑھائی تین سو کلاس فیلوز کو بھی پتا چل گیا تھا کہ جو سینئر لڑکا ان کے ڈیپارٹمنٹ میں آتا رہتا ہے، وہ اپنی منکوحہ سے ملنے آتا ہے۔ لیکن پھر بھی لڑکے اور لڑکیاں اسے شرارتی نظروں سے دیکھتے تھے، جس پر وہ تھوڑا بہت خجل بھی ہوتی تھی، لیکن وہ اسے نظرانداز کر دیتی تھی۔

''اس کا غالب کے ساتھ نکاح ہو چکا ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ رہتی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ اور وہ اپنے حق سے کیوں کر دستبردار ہو۔'' یہ رطابہ کی سوچ تھی۔

اگر رطابہ کی غالب سے صرف منگنی ہوئی ہوتی تو وہ ہرگز غالب کے ساتھ نہ ملتی۔

حقیقت میں تو اسے اب غالب کے ساتھ رہنا اچھا لگنے لگا تھا۔ اور لاشعوری طور پر وہ غالب کا انتظار بھی کرتی۔

غالب کی ہر دم کھلکھلانے والی عادت اور دوسرا اس کی شاعری میں دلچسپی...... یہ دونوں چیزیں رطابہ کو بہت اچھی لگتی تھیں۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے وہ لائبریری میں اکٹھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لائبریرین انہیں دوسری بار خاموش بیٹھ کر مطالعہ کرنے کا کہہ گیا تھا لیکن پھر دوسرے منٹ انہوں نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ تیسری بار لائبریرین نے انہیں متنبہ کیا تھا کہ اب اگر وہ خاموش نہ ہوئے تو انہیں لائبریری کو چھوڑنا ہوگا۔ پھر وہ لگ بھگ آدھا گھنٹا اپنا اپنا پڑھتے رہے اور پھر لائبریری سے چلے آئے۔

یوں ہی وقت گزر رہا تھا۔ رطابہ اور غالب اپنی اپنی جگہ خوش تھے اور قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔

☆☆☆......

''دم تارا دم تارا مست مست۔
دم دم تارا مست مست۔ دم دم، ہو ہمدم
بن تیرے کیا ہے جینا
دم تارا دم تارا مست مست''

طٰہٰ نے مینا کی آواز بیڈروم کے باہر سے سنی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ مینا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال کھولے بیٹھی تھی۔ وہ بالوں میں برش کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ گنگنا بھی رہی تھی۔ مینا کے کھلے بال کمر سے بھی نیچے تک آتے تھے۔ طٰہٰ کو مینا کھلے بالوں کے ساتھ اچھی لگتی تھی۔

''اوہ...... آپ آگئے۔ میں تیار بھی نہیں ہو سکی۔'' مینا نے طٰہٰ کو دیکھ کر کہا تھا۔

''کوئی بات نہیں تم ایسے بھی بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' طٰہٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ملگجے کپڑوں میں کھلے بالوں کے ساتھ، مینا کو شرمندگی ہوئی۔

''بالوں کو کھلا رہنے دو۔'' طٰہٰ نے مینا کو بالوں کو باندھتے دیکھ کر کہا تھا اور مینا مسکرائی تھی۔ اس نے بالوں کو کھلا رہنے دیا۔

حسب معمول مینا نے طٰہٰ کا آفس بیگ سائیڈ پر رکھا۔ اس کے جوتے اتارے، جرابیں اتاریں، اس کے پاؤں سہلائے، ہاتھ دھوئے، پھر اس کے بالوں کو سہلایا۔ خوشگوار احساس، خوشگوار وقت، لیکن طٰہٰ کو کچھ تشنگی محسوس ہوئی۔ اسے لگا مینا یہ سب میکانکی انداز میں کر رہی ہے۔ جیسے کوئی ذمے داری پوری کرتا ہے۔

طٰہٰ نے اپنے آپ کو ایسا سوچنے پر سرزنش کی تھی۔ لیکن حقیقت یہی تھی کہ مینا واقعی یہ سب کچھ اس طرح کر رہی تھی جیسے ڈیوٹی ہو۔ کچھ دیر بعد وہ ڈائننگ ٹیبل

پر بیٹھے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر حسب معمول دو تین لوازمات پڑے ہوئے تھے۔

کھانا کھانے کے دوران بہت ساری باتیں ہوئیں۔ کچھ رومینٹک باتیں اور کچھ فلمی باتیں......

رومینٹک باتیں طٰہٰ نے کی تھیں، جس پر مینا شرماتی اور مسکراتی رہی تھی۔ فلمی باتیں مینا نے کی تھیں جنہیں طٰہٰ سنتا رہا تھا۔

''جب بات کرو تب فلم انڈسٹری، ہر وقت فلم انڈسٹری، یہ مینا کو ہو کیا گیا ہے؟'' طٰہٰ نے جھنجھلا کر سوچا تھا۔

اور کھانا کھانے کے بعد اس کا اظہار مینا سے کر دیا۔

''جب ٹی وی نہیں دیکھتی تھی، تب تو آپ خود ہی کہتے تھے کہ دیکھ لیا کرو اور اب جب دیکھ لیتی ہوں تو کوئی حرج تو نہیں پڑتا۔'' مینا نے طٰہٰ کو جواب دیتے ہوئے خود ہی اپنے مشغلے کو بے ضرر قرار دے دیا۔

طٰہٰ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش ہو گیا۔ وہ مینا کو سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ فلم انڈسٹری میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات وہ طٰہٰ کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ یہ درست نہیں لیکن کیسے سمجھائے۔ اور ایک مینا تھی...... پتا نہیں اس کی عقل کہاں گئی تھی کہ اسے نہ کچھ دن پہلے طٰہٰ کی آنکھوں میں آئے آنسو یہ بات سمجھا سکے تھے اور نہ ہی آج طٰہٰ کے انداز۔

کھانا کھانے کے بعد ان دونوں نے مغرب کی نماز ادا کی۔ مغرب کی نماز کے بعد طٰہٰ کافی دیر یہی دعا کرتا رہا تھا...... کہ ان دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جائے۔

نماز پڑھنے کے بعد طٰہٰ پُرسکون تھا۔ وہ مینا سے حسب معمول بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے کئی بار یہ دعا مانگی تھی کہ مینا اب فلمی باتیں نہ کرے۔ آدھ گھنٹے ان دونوں نے بہت ساری باتیں کیں۔

''اچھا تو اگر میں کوئی فرمائش کروں تو وہ آپ پوری کریں گے۔'' مینا کو یقین تھا کہ طٰہٰ اس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات پوری کرنا لازمی سمجھتا ہے، لیکن پھر بھی اس نے یہ جملہ کہا تھا۔ شاید اپنا مان بڑھانے کے لیے۔

''بالکل کوئی شک ہے!''

''دو فرمائشیں کروں گی۔''

''دو ہزار فرمائش کرو۔''

''ایک تو سلمٰی کو دوبارہ کام پر رکھنا ہے۔'' مینا کی پہلی فرمائش پر طٰہٰ مسکرایا تھا۔

''وہ اصل میں کام بہت زیادہ ہوتا ہے نا، اس لیے میں بہت تھک جاتی ہوں۔ میرے اور رضیہ خالہ کے بس کی بات نہیں۔'' مینا نے وضاحت کی تھی۔ طٰہٰ ہنوز مسکراتا رہا تھا۔

''دوسرا'' دوسرا کہنے کے بعد مینا نے ایک مختصر وقفہ لیا تھا۔

''دوسرا یہ کہ جیسے آپ کو پتا ہے کہ کاجول میری فیورٹ ایکٹرس ہے۔ کاجول اور اجے کی مووی سینما پر لگی ہے۔ وہ دیکھنے ہم سینما چلیں۔'' مینا نے اٹکتے ہوئے کہا تھا۔

طٰہٰ نے حیرت سے مینا کو دیکھا تھا۔ اسے مینا کی یہ فرمائش بری لگی تھی۔ طٰہٰ کبھی سینما نہیں گیا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ سینما کا ماحول کچھ زیادہ اچھا نہیں ہوتا...... گلیمرس سین اور گلیمرس ڈائیلاگ پر لڑکے سیٹیاں بجانا شروع کر دیتے ہیں، فقرے کستے ہیں اور وہ ایسی جگہ پر اپنی مینا کو کسی صورت نہیں لے جا سکتا تھا، اس لیے اس نے چند لمحوں بعد مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں۔''

......☆☆☆......

خدیجہ پھوپو آئی ہوئی تھیں۔ نیلوفر اور ریحانہ بھی ساتھ تھیں اور ساتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا بھی تھا۔ خدیجہ پھوپو لگ بھگ دو مہینے بعد آئی تھیں...... نفیسہ اور زاہدہ ان لوگوں کے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں، جب کہ لڑکیوں میں ثمن، سمیہ، رائمہ اور نینا موجود تھیں۔ وہ ایک قطار

میں بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ سمن، سمیہ اور رائمہ کو نفیسہ ڈانٹ کر لے آئی تھی۔ کہیں خدیجہ پھوپو اس بات کو محسوس ہی نہ کرلیں کہ لڑکیوں کو پھوپو سے اس قدر لگاؤ بھی نہیں کہ چند گھڑی پھوپو کے ساتھ بیٹھ جائیں......

تھوڑی دیر بعد رخسانہ بھی آگئی۔ بہن اور بھانجیوں سے ملنے کے بعد وہ بھی بیٹھ گئی۔

چند ثانیے خاموشی رہی، گھر کے تمام افراد وقفے وقفے سے اس مٹھائی کے ٹوکرے کو دیکھ رہے تھے۔

''اس قدر بڑا مٹھائی کا ٹوکرا......ضرور کوئی خاص بات ہے۔'' گھر کے تمام افراد نے اپنی اپنی جگہ یہ سوچا تھا۔

بالآخر رخسانہ پھوپو نے بات کرنا شروع کی۔ خدیجہ پھوپو سے حال احوال دریافت کیا۔ جس کا جواب انہوں نے معمول سے زیادہ تمکنت سے دیا تھا۔

''یہ مٹھائی کس سلسلے میں۔'' رخسانہ پھوپو نے یہی پوچھا تھا۔

''یہی مٹھائی دینے تو آئی ہوں...... اب اپنوں سے خوشی نہی بانٹوں گی تو کس سے بانٹوں گی......'' خدیجہ پھوپو نے ایک خاص انداز سے گردن کو ہلایا تھا اور پھر سے بات شروع کی۔

''میری دونوں بیٹیوں کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔ میرے جیٹھ کی فیملی میں، وہ جو کینیڈا میں رہتے ہیں۔'' خدیجہ پھوپو نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ان کی مسکراہٹ میں غرور نمایاں تھا۔ جب کہ ریحانہ اور نیلوفر تیز نگاہوں سے لڑکیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی بھی نگاہوں میں غرور تھا۔

''بہت بہت مبارک ہو۔'' رخسانہ، نفیسہ اور زاہدہ نے کہا تھا۔ نینا، سمن، رائمہ اور سمیہ نے چہرے پر مسکراہٹ سجالی تھی۔

''آپا رشتے تو آپ نے کرلیے ہیں۔ رشتے کرنے سے پہلے کم از کم مشورہ کرلیتیں بہن بھائیوں سے تو اچھا ہوتا۔'' رخسانہ بہن تھی، اسے ہمیشہ کی طرح آج بھی دکھ ہوا تھا......اس لیے اس نے کہہ دیا۔

''لو بھئی خیر سے میں سالم عقل رکھتی ہوں۔ اتنا اچھا رشتہ تھا، مشورے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے جھٹ رشتہ طے کردیا۔'' خدیجہ پھوپو کا جواب رخسانہ پھوپو کے لیے تکلیف دہ تھا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھیں، لیکن انہیں معلوم تھا جواب تو ایسا ہی ملنا ہے، اس لیے انہوں نے مزید کچھ نہ کہا۔

''لو بھئی تصویریں دیکھ لو۔ کتنا عرصہ تو ہوگیا ہے انہیں کینیڈا گئے ہوئے۔ کہاں تم لوگوں نے انہیں میرے گھر کسی تقریب پر دیکھا ہوگا۔ بلیک سوٹ والے سے نیلوفر کا رشتہ طے ہوا ہے۔''

پہلے نفیسہ، زاہدہ اور رخسانہ نے وہ تصویریں دیکھیں اور پھر لڑکیوں نے دیکھیں۔ دونوں خوش شکل تھے۔

''مٹھائی تو کھاؤ تم لوگ، لو کھاؤ۔''

''ضرور کیوں نہیں۔'' نفیسہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ سب لوگوں نے مٹھائی کھائی۔ لڑکیوں نے تو جی بھر کر کھائی، خصوصاً نینا نے۔ نینا نے تین پیس کھائے تھے۔

''لڑکے کیا کرتے ہیں۔'' زاہدہ نے پوچھا تھا۔

''اپنا ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ بہت بڑا، وہی چلاتے ہیں۔ ویسے پیسوں میں کھیلتے ہیں وہ لوگ۔''

خدیجہ پھوپو لگ بھگ آدھ گھنٹا مزید بیٹھی تھیں اور ان لوگوں کی امارت کے قصے سناتی رہیں اور سب لوگ سنتے رہے۔ لڑکیاں باری باری کھسکتی رہیں اور جاکر کلیم صاحب کی سائیڈ والے کچن میں اکٹھی ہوگئیں۔

تھوڑی دیر بعد نیلوفر بھی ان کے پاس آگئی تھی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ بس مغرور مسکراہٹ چہرے پر لیے مسکراتی رہی۔ اور ان لڑکیوں کی طرف سے پوچھے گئے چند سوالوں کا جواب دیا اور چلی گئی۔ جب یہ اطمینان ہو چلا کہ خدیجہ پھوپو مع اپنی بیٹیوں کے رخصت ہوگئی ہیں تو سمیہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''کینیڈا میں رہتے ہیں نا، اس لیے خوبیوں کا نہیں

پتا ہوگا، اسی لیے رشتہ طے ہوگیا، چلو اچھا ہوا۔'' سب لڑکیوں نے سمیہ کی تائید کی تھی۔

اندر بیٹھی نفیسہ نے بھی یہ بات رخسانہ کے جانے کے بعد زاہدہ سے کچھ لفظوں کے ردّوبدل کے ساتھ کہی تھی اور زاہدہ نے بھی نفیسہ کی تائید کی تھی۔

''چلو اتنی ساری مٹھائی آئی ہے۔ کوئی جا کر تھوڑی سی لے آئے۔'' نینا نے کہا تھا اور رائمہ مٹھائی لینے چلی گئی تھی۔

''خس کم جہاں پاک...... چلو اب نیلوفر کا فتنہ تو ختم ہونے چلا۔ شکر ہے زندگی اب پُرسکون ہوجائے گی۔'' سمن نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ واقعی آج وہ لڑکیاں نیلوفر اور ریحانہ کے رشتہ طے ہونے کی خبر سن کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

......☆☆☆......

غالب اور رطابہ آج لنچ کے لیے ریسٹورنٹ پر آئے ہوئے تھے۔ رطابہ سیف سے اجازت لے کر آئی تھی۔ سیف نے بھی بخوشی اجازت دی تھی۔ وہ جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے، وہ شہر کا جانا مانا ریسٹورنٹ تھا۔

کھانا کھانے کے درمیان بھی وہ باتیں کرتے رہے اور ایک دوسرے کی پسند ناپسند پوچھتے رہے۔ رطابہ نے آف وہائٹ کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا، جس کی پٹیالہ شلوار تھی۔ کندھے پر دوپٹے کے ساتھ سیفٹی پنز لگی ہوئی تھیں، کہیں ڈھلک نہ جائے۔ اس کے علاوہ اسکارف بھی سوٹ کے ہم رنگ تھا اور اسے اس طرح پہنا ہوا تھا کہ بال بالکل نظر نہ آئیں۔ غالب نے جینز کے ساتھ ایک اسٹائلش سی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دونوں بہت اچھے لگ رہے تھے۔

''تمہیں پتا ہے رطابہ مجھے تمہاری کس چیز نے اٹریکٹ کیا تھا؟''

''کس چیز نے؟''

''مجھے تمہاری کسی چیز نے اٹریکٹ نہیں کیا، بلکہ مجھے تو تم نے خود اپنے حصار میں لیا ہے۔ آئی لو یو رطابہ'' یہ کہہ کر غالب نے اپنا ہاتھ رطابہ کے ٹیبل پر پڑے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لیکن رطابہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیا ہوا؟'' غالب کو حیرت ہوئی۔

''کچھ نہیں۔'' رطابہ نے کچھ وقفے کے ساتھ جواب دیا۔ ''بس مجھے یہ سب پسند نہیں۔''

''کیوں؟ میں تمہارا شوہر ہوں رطابہ۔ حرج کیا ہے اس میں۔'' غالب ابھی تک حیران تھا۔

''وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، لیکن آپ یہ دیکھیں نا کتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں اور ہوسکتا ہے کوئی ہماری طرف متوجہ ہو۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو عام سی بات ہے۔''

''فرق پڑتا ہے غالب۔ کوئی بھی کچھ بھی سوچ سکتا ہے۔''

''سو واٹ۔ کسی کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ عام سی بات ہے رطابہ۔ میں تو اپنی فیمیل فرینڈز کے ساتھ بھی شیک ہینڈز کرتا ہوں۔ یہ کوئی ایشو تو نہیں۔'' غالب نے اپنے بارے میں رطابہ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''ویسے بھی ہمارے درمیان رشتہ موجود ہے۔ یہ ہمارا حق ہے اور میں اپنا حق تو نہیں چھوڑ سکتا۔'' غالب کے الفاظ کے ساتھ لہجہ بھی دوٹوک تھا۔

''وہ سب آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہر بندے کی اپنی نیچر ہوتی ہے۔ اس طرح پبلک پلیس میں یوں ہاتھ پکڑ کر بیٹھنا مجھے کچھ پسند نہیں۔''

''لیکن رطابہ......'' غالب کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ رطابہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''پلیز۔'' رطابہ کے لہجے میں ریکوئسٹ کافی حد تک شامل تھی۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر غالب نے کہا۔

''اوکے جیسے تم خوش رہو۔'' غالب کا جواب سن کر رطابہ مسکرادی تھی۔

"تھینکس غالب۔"
"اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔"
اس کے بعد دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر غالب بولا۔ "اچھا میں تمہیں ایک جوک سناتا ہوں۔ ٹیچر اسٹوڈنٹ سے پوچھتا ہے توانائی کسے کہتے ہیں تو اسٹوڈنٹ جواب دیتا ہے جس توے پر نائی بیٹھا ہو۔" غالب کے جوک پر رطابہ نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا تھا۔
"پلیز تم مجھے یہ پھسپھسے اور 1895ء کے گھسے پٹے لطیفے مت سنایا کرو۔ یہ میری تم سے ریکوئسٹ ہے۔"
رطابہ کی بات سن کر غالب ہنسنے لگ گیا تھا اور رطابہ نے بھی ہنسنے میں اس کا ساتھ دیا تھا۔
......☆☆☆......
سب لوگ سینما اسکرین کی طرف متوجہ تھے۔ کوئی بہت ایموشنل سین تھا۔ مینا بھی سینما اسکرین کی طرف متوجہ تھی، لیکن طٰہٰ مینا کی طرف متوجہ تھا۔
فلم شروع ہوئے لگ بھگ پینتالیس منٹ ہوگئے تھے اور ان پینتالیس منٹ میں مینا نے مسلسل سینما اسکرین پر نظریں جمائی ہوئی تھیں۔ اس نے طٰہٰ سے اس دوران کوئی بات نہیں کی تھی۔ طٰہٰ نے ایک دو بار مینا کو کچھ کہا تھا، لیکن مینا کے نپے تلے جواب نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔ طٰہٰ کو مینا کی اس قدر فلم پر توجہ بہت بری لگ رہی تھی۔ مینا نقاب میں تھی، اس نے بلیک کلر کا برقع پہنا ہوا تھا۔ پورے سینما ہال میں وہ واحد عورت تھی جس نے نقاب کیا ہوا تھا۔
یہ پہلا موقع تھا کہ طٰہٰ اور مینا ایک ساتھ بیٹھے مووی دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی سینما میں۔ طٰہٰ کے انکار کے باوجود مینا طٰہٰ سے مسلسل اصرار کرتی رہی تھی کہ اسے یُو، می اور ہم دیکھنے سینما گھر جانا ہے۔
"آخر کیوں۔ مینا؟ ایک دو دن تک مارکیٹ میں آجائے گی تو ڈی وی ڈی منگوا کر دیکھ لینا۔" نا چاہتے ہوئے بھی طٰہٰ کا لہجہ قدرے تلخ تھا۔
"لیکن میرا دل تو سینما پر دیکھنے کا ہے اور میں سینما پر ہی دیکھوں گی۔" مینا نے طٰہٰ کے لہجے کی تلخی محسوس نہیں کی تھی یا پھر نوٹس نہیں لیا تھا۔ طٰہٰ کو کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا۔
"سینما کا ماحول اچھا نہیں ہوتا، لڑکے فقرے کستے ہیں؟"
تو کیا ہوا۔ میں نقاب کر کے جاؤں گی۔ لڑکے تو بازاروں میں بھی فقرے کستے ہیں، وہاں بھی تو میں جاتی ہوں۔" طٰہٰ نے شکوہ کناں نگاہوں سے مینا کو دیکھا تھا۔ لیکن مینا اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔
"مینا فلم میں گلیمرس ڈائیلاگز بھی ہوں گے اور ایکسپوزنگ سینز بھی اور وہاں ایک کثیر تعداد میں مرد ہوں گے۔" اب کی بار طٰہٰ کا لہجہ کمزور تھا۔
"اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں میچور ہوں۔" مینا نے دوٹوک انداز میں کہا تھا اور طٰہٰ اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔
"تمہیں کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" طٰہٰ شاک میں تھا۔ اس جملے سے مینا کچھ گڑبڑا سی گئی تھی۔
"اب ایسا بھی نہیں۔ یہ سب غیر اہم باتیں ہیں۔ آپ مجھے اب سینما لے کر جا رہے ہیں نا۔"
"جیسے تم بہتر سمجھو۔" طٰہٰ نے مری ہوئی آواز میں کہا تھا۔
چاہتا تو وہ مینا کو زورِ بازو پر روک دیتا، لیکن ایسا کرنے پر اس کا دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ مینا سے سخت لہجے میں بات کرنا بھی اسے دنیا کے مشکل ترین کاموں سے ایک لگتا تھا۔ اس تمام گفتگو کے دوران طٰہٰ کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ شدید اذیت میں اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں۔
Intermission آیا۔ فلم ختم ہوگئی۔ درمیان میں ہر گلیمرس سین اور ڈائیلاگ پر ہال میں شور مچتا رہا اور پوری فلم کے دوران طٰہٰ اذیت میں رہا تھا۔
"آپ صحیح کہتے تھے سینما کا ماحول اچھا نہیں ہوتا، ہم آئندہ یہاں نہیں آئیں گے۔" سینما سے باہر نکلتے

ہوئے مینا نے کہا تھا۔ طٰہٰ کو بہت اچھا لگا تھا۔

''کیا کمال فلم تھی۔'' ایک طرف طٰہٰ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور دوسری مینا نے یہ فقرہ کہا تھا۔

''کاجول نے کیا کمال ایکٹنگ کی ہے۔''

''کیا شاندار ڈائریکشن تھی مووی کی۔''

''کہانی بھی بہت زبردست تھی۔'' سنیما کے پورچ سے روڈ تک آنے میں مینا نے یہ تین فقرے کہے تھے۔

''اگر مینا اب اس چیز میں دلچسپی لے رہی ہے تو مجھے شیئر کرنا چاہیے۔'' طٰہٰ نے یہ سنیما میں بھی سوچا تھا اور اب بھی سوچا تھا اور اس نے پکا ارادہ کرلیا کہ وہ اب مینا سے فلم انڈسٹری پر بہت دلجمعی سے باتیں کرے گا۔ فی الحال گھر آنے تک مینا ہی باتیں کرتی آئی۔ یہ باتیں صرف یو، می اور ہم پر مشتمل تھیں۔ طٰہٰ سنتا رہا۔ مینا کو مووی بہت زیادہ پسند آئی تھی، لیکن طٰہٰ فلم کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوا تھا اس لیے اسے کچھ بھی نہیں پتا تھا۔

اگلے کچھ دن طٰہٰ پوری کوشش کرتا رہا کہ وہ مینا کے ساتھ بولی وڈ کی باتیں کرتا رہے، لیکن بہت بری طرح ناکام رہا تھا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر مینا فلموں کی باتیں کرتی تھی تو رات کو سوتے ہوئے کسی ہیرو یا ہیروئن پر تبصرہ۔ اب تو وہ اکثر طٰہٰ کو لے کر مووی دیکھنے بیٹھ جاتی تھی۔ پندرہ بیس سال پرانی فلمیں بھی وہ دلجمعی سے دیکھتی تھی اور اب جب وہ آفس سے آتا تھا تو وہ فلمی رسالہ لیے بیٹھی ہوتی تھی۔ اب آفس سے گھر آتے ہوئے طٰہٰ کو مزید تھکن ہونے لگتی تھی۔ اپنی اور طٰہٰ کی باتیں تو مینا اب بھولے سے ہی کرتی تھی۔ میکے جانے کی فرمائش بھی اس نے ترک کردی تھی۔

صورتِ حال کافی خراب ہوتی جارہی تھی۔ نہ اب طٰہٰ کو مینا کے ساتھ بیٹھتے ہوئے وقت خوشگوار محسوس ہوتا تھا اور نہ ہی کوئی خوشگوار احساس، بلکہ ایک اذیت نے اس کا احاطہ کرلیا تھا اور اس اذیت کی اصل وجہ تھی مینا کی بولی وڈ میں حد سے زیادہ دلچسپی اور بولی وڈ اور صرف بولی کی باتیں۔

شروع شروع میں طٰہٰ کو حیرت ہوتی تھی کہ مینا کس قدر جلد فلموں میں دلچسپی لینے لگی ہے لیکن اب کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی بلکہ دکھ ہوتا تھا، بہت سارا دکھ۔

......☆☆☆......

یہ دل، یہ اجڑی ہوئی چشمِ نم، یہ تنہائی
ہمارے پاس تو جو بھی ہے مال درد کا ہے
اسیر ہے میری شاخِ نصیب پت جھڑ میں
میرے پرندۂ دل پر بھی جال درد کا ہے
ہم اس کو دیکھتے جاتے ہیں، روتے جاتے ہیں
یہ صحنِ شب میں پڑا ہے جو تھال درد کا ہے
اب اس کے بعد کوئی رابطہ نہیں رکھنا
یہ بات طے ہوئی لیکن سوال درد کا ہے
وہیں کسی گھاٹی میں تیرا ہجر بھی ہے
میرے لہو سے جہاں اتصال درد کا ہے

رطابہ نے کارڈ پر لکھی ہوئی غزل کو دوسری بار پڑھا تھا۔

''ویسے تو غزل کافی اچھی ہے، لیکن کارڈ کی مناسبت سے نہیں ہے، دوسرا خدانخواستہ ایسے حالات بھی نہیں......'' رطابہ نے لمحہ بھر سوچا تھا اور پھر مسکرادی تھی۔

''لیکن غزل کافی اچھی ہے۔'' رطابہ کے ہونٹوں پر چند لمحے مزید مسکراہٹ رہی تھی۔ کارڈ بھی کافی خوبصورت تھا۔ نیلے رنگ کا "Miss You" کا یہ کارڈ آج اسے غالب نے دیا تھا۔ جو کہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔

غالب کا شعری انتخاب رطابہ کو اچھا لگتا تھا، ویسے غالب اکثر و بیشتر کوئی نا کوئی شعر گنگناتا رہتا تھا۔

رطابہ نے ایک بار پھر کارڈ کو دیکھا تھا اور مسکراتے ہوئے کارڈ کو بیڈ کی سائڈ والی دراز میں رکھ دیا۔

خوش تو وہ پہلے بھی بہت رہتی تھی، لیکن اب جب سے غالب کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہوا تھا، وہ بہت

زیادہ خوش رہنے لگی تھی۔

......☆☆☆......

پردیسیا...... یہ سچ ہے پیا۔
سب کہتے ہیں میں نے دل دے دیا۔
میں کہتی ہوں تو نے۔ میرا دل لے لیا۔

کچن سے آواز برآمدے تک آرہی تھی۔ برآمدے میں اس وقت سلطانہ اور سیف بیٹھے تھے، جبکہ کچن میں مینا چائے بنارہی تھی۔

سیف نے سلطانہ کی طرف دیکھا تھا۔ سلطانہ پہلے ہی سیف کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''اتنی بڑی تبدیلی...... استغفراللہ'' سیف اور سلطانہ نے اپنی اپنی جگہ یہ سوچا تھا۔

سردیوں کے دن تھے۔ ابھی صبح کے دس بجے تھے۔ گھنٹا بھر پہلے طٰہٰ آفس جاتے ہوئے مینا کو یہاں چھوڑ گیا تھا۔ آج لگ بھگ دو ہفتے بعد مینا میکے آئی تھی۔ میکے آکر مینا نے کچن میں ناشتا بناتی سلطانہ اور شاہین کو باہر بھیجا تھا اور خود ناشتا تیار کرنے لگی تھی۔

شاہین کو سردی زیادہ لگتی تھی۔ اس لیے وہ کمرے میں تھی، ہیٹر کے سامنے۔ مینا نے نینا کو بھی فون کرکے آنے کا کہا تھا۔ نینا نے گھنٹے بھر تک آنے کا کہا تھا۔ اب نینا کا گھنٹا کب ہونا تھا، اس کا مینا کو اندازہ نہیں تھا۔

ناشتا وہ تیار کر کے دے چکی تھی اور اب چائے کپوں میں ڈال کرلے آئی۔ پہلے شاہین کو اندر کمرے میں چائے دی اور سیف اور سلطانہ کو دی اور پھر ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئی۔

اِدھر سیف دکان پر جانے کے لیے نکلے تھے، اُدھر نینا گھر میں داخل ہوئی تھی۔ پرتپاک انداز میں سلطانہ اور مینا کو ملنے کے بعد وہ اندر شاہین کو مل آئی اور پھر باہر آکر سلطانہ اور مینا سے اندر چل کر بیٹھنے پر اصرار کیا۔ سب اندر کمرے میں جا کر بیٹھے شاہین کے پاس۔ رطابہ کا کالج صبح آٹھ بجے لگتا تھا۔ اس لیے وہ اس وقت یہاں نہیں تھی۔

بہت ساری باتیں ہوئیں، اِدھر اُدھر کی۔ طٰہٰ اور عاشر کی۔ امیاں ساتھ بیٹھی تھیں۔ اس لیے مینا فلموں کی باتیں کرنے میں جھجک محسوس کررہی تھی۔ ویسے وہ نینا کو ان فلموں کے بارے میں بتانے کے لیے بے چین ہورہی تھی لیکن یہ سب اس نے بعد میں بتانے کا فیصلہ کیا۔

''امی اگر ایک بات پوچھوں تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گی......'' نینا نے کچھ سوچتے ہوئے شاہین کو کہا تھا۔

''ہاں پوچھو۔'' شاہین نے کہا۔

نینا نے ایک نظر سلطانہ اور شاہین کو دیکھا تھا۔ اضطراری طور پر ہونٹوں پر زبان پھیری تھی اور پھر کہا تھا ''میں ایوب صاحب کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر ہونٹوں پر زبان پھیری تھی۔

مینا اور سلطانہ کو حیرت ہوئی تھی، جبکہ شاہین کو بہت زیادہ حیرت ہوئی تھی...... اس شخص کا ذکر کئی سالوں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔ جب شاہین یہاں آئی تھی تب بس ایک بار سیف نے شاہین سے پوچھا تھا اس شخص کے بارے میں۔ سلطانہ اس وقت ان کے پاس بیٹھی تھی۔ شاہین نے سیف کی بات کا جواب نہیں دیا تھا، بلکہ ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگ گئی تھی۔ سیف کو چند لمحوں میں اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے۔ بس اور اب کئی سالوں بعد نینا پوچھ رہی تھی۔ اگر نینا پوچھ رہی تھی تو نینا کا جاننا حق تھا۔

''کیا پوچھنا چاہتی ہو؟'' چند وقفوں کے بعد شاہین نے کہا تھا۔ پوچھنا تو نینا بہت کچھ چاہتی تھی، لیکن اس کی نانی اماں بھی جب حیات تھیں، انہوں نے نینا کو کئی بار بتایا تھا کہ وہ شاہین کو بہت مارتا تھا۔ بہت ظلم ڈھاتا تھا۔ یہ سب پوچھنا نینا کو اچھا نہیں لگا تھا، اس لیے اس نے وہی بات پوچھی جو سب سے اہم تھی۔

''انہوں نے کبھی میرے لیے رابطہ نہیں کیا۔'' نینا نے اٹکتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد شاہین

نے یک لفظی جواب دے دیا۔ جواب نینا کو پہلے سے پتا تھا، لیکن پھر بھی سن کر اسے دکھ ہوا تھا۔

'زندگی کے کسی موڑ پر ہماری ملاقات ہوئی تو میں ان کو کسی صورت معاف نہیں کروں گی۔' نینا نے تنفر سے سوچا تھا۔

'پچیس سال تک نہیں ملے تو اب کیا ملیں گے۔' نینا کو اگلے ہی لمحے اپنی سوچ بچکانہ لگی۔ نینا شاید مزید کچھ حساب کتاب کرتی، لیکن مینا نے اسے کہہ دیا۔

''اچھا۔ اب اٹھو! رطابہ کے کمرے میں چلتے ہیں۔ بہت ساری باتیں کرنی ہیں میں نے تم سے۔''

مینا نے نینا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا تھا اور امیوں سے اجازت لے کر وہ رطابہ کے کمرے میں چلی گئیں، جو کبھی ان تینوں کا مشترکہ کمرا ہوتا تھا۔ پھر پیچھے بیٹھی شاہین نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

''تم تو فلمیں باز ہوگئی ہو۔'' مینا کی باتیں سن کر نینا یہی کہہ سکی تھی۔

''اب ایسا بھی نہیں۔ بس ریفریشمنٹ کے لیے دیکھ لیتی ہوں۔'' مینا نے کہا تھا۔

اڑھائی بجے رطابہ آگئی۔ تینوں بہنوں نے خوب گپ شپ لگائی۔

''فلموں کے علاوہ کوئی بات کرو تم۔'' رطابہ نے ایک بار کہا تھا اور مینا گڑبڑا گئی تھی۔ پھر مینا نے سوچ سوچ کر باتیں کی تھیں۔

شام کو مینا کو طٰہٰ لینے اور نینا کو عاشر لینے آگیا۔ ویسے اس بار مینا فرمائش کر کے میکے نہیں آئی تھی، بلکہ طٰہٰ نے کہا تھا تو وہ راضی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

رات کا ایک بجا تھا۔ سنسان سڑک تھی۔ ان دو منچلے موٹر سائیکل سواروں کے سوا دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ان دو موٹر سائیکل سواروں میں ایک غالب تھا اور دوسرا حماد۔

آج حماد کی سالگرہ تھی۔ بارہ بجے اس نے غالب کی موجودگی میں کیک کاٹا تھا۔ ویسے تو وہ ہلا گلا کرنے والا لڑکا تھا، لیکن اس بار برتھ ڈے پارٹی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، سو بس رات کے بارہ بجے اپنے عزیز از جان دوست کی موجودگی میں اس نے کیک کاٹا تھا اور اب وہ سڑک پر موٹر سائیکل چلا رہے تھے۔

دراصل وہ باہر وہیلنگ کے لیے آئے تھے۔

غالب نے وہیلنگ شروع کردی۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے یکے بعد دیگرے اور پھر ایک ساتھ وہیلنگ کریں گے۔ وہ اس وقت مین روڈ پر تھے۔ جس طرف وہ جا رہے تھے، وہاں ایک ذیلی سڑک مین روڈ سے ملتی تھی۔

مین سڑک اور ذیلی سڑک کے سنگم پر پھسلن تھی۔

غالب کو اندازہ نہ ہوا اور وہ موٹر سائیکل کا بیلنس برقرار نہ رکھ سکا، ویسے بھی وہ وہیلنگ کر رہا تھا۔ موٹر سائیکل سلپ ہوئی اور غالب دور جا گرا۔

ذیلی سڑک سے ایک سفید گاڑی بڑی تیز رفتاری سے آرہی تھی۔ ڈرائیور نے غالب کو بچانے کی بڑی کوشش کی، لیکن پھر بھی تیز رفتار گاڑی غالب کے بائیں بازو پر سے گزرتی چلی گئی۔

ایمبولینس میں موجود مریض کی آخری سانسیں تھیں، لواحقین رو رہے تھے۔ ایمبولینس ڈرائیور اندھیرے میں اندازہ نہ لگا سکا اور وہ بھی ایمبولینس غالب کے بائیں ہاتھ پر دوڑاتا چلا گیا۔

☆☆☆

طٰہٰ پورچ میں گاڑی پارک کرنے کے بعد تھکے ہارے قدموں سے رہائشی حصّے کی طرف آرہا تھا۔ آج وہ فرزانہ آپا سے مل کر آرہا تھا۔ فرزانہ آپا بہت خوش ہوئی تھیں اسے دیکھ کر۔ انہیں طٰہٰ کافی اداس بھی لگ رہا تھا۔ فرزانہ آپا کے پوچھنے پر اس نے انہیں بتا دیا کہ کس طرح مینا ٹی وی اور فلموں میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگ گئی ہے۔ اس کا تو اوڑھنا بچھونا ٹی وی بن گیا ہے

اور اسے بھی نظر انداز کرنے لگ گئی ہے۔
"کچھ نہیں، ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا۔ مینا اچھی لڑکی ہے۔ تم بات کو دل پر مت لو۔ اس کی توجہ دلاؤ اس طرف، اسے احساس ہو جائے گا۔" طٰہٰ نے بے چارگی سے انہیں دیکھا تھا۔ اب وہ انہیں کس طرح سمجھاتا کہ مینا کس طرح ٹی وی میں غرق ہو گئی ہے۔ اب اس کا کیا نتیجہ نکلنا تھا۔ طٰہٰ کو تو خوف سا آنے لگا تھا۔ فرزانہ آپا نے تفکر کی پرچھائیں طٰہٰ کے چہرے پر دیکھی تو اسے دلاسا دیا کہ وہ مینا سے بات کریں گی۔"
"آپا میں نے ڈائریکٹ اِن ڈائریکٹ کئی بار مینا کی توجہ اس جانب دلائی ہے، لیکن وہ سمجھتی نہیں۔ وہ تو ہر بار خود ہی اسے بے ضرر قرار دے دیتی ہے۔ میرا بھی خیال نہیں کرتی۔"
طٰہٰ کا دل تو چاہا رو پڑے لیکن ضبط کیے بیٹھا رہا۔
"تم بھیجنا اسے میرے پاس، میں اسے سمجھاؤں گی۔ تم اس کی ٹینشن مت لو۔"
اب رہائشی حصے کی طرف آتے ہوئے طٰہٰ فرزانہ آپا سے ہونے والا اپنا مکالمہ ہی سوچ رہا تھا۔ لاؤنج میں ہی اسے مینا مل گئی، لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ ماریہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ ماریہ کو دیکھ کر طٰہٰ کو ناگوار احساس ہوا تھا۔
"جب مینا کو پتا ہے کہ یہ میرے آنے کا وقت ہے تو......"
اندر جا کر دعا سلام کا تبادلہ ہوا۔ سلام کرنے کے دوران ہی طٰہٰ کی نظر مینا پر پڑی تو حیران رہ گیا۔ مینا کی آنکھ میں آنسو تھے۔ طٰہٰ کو بے چینی سی ہوئی۔ مینا نے آنکھ میں آئے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔ قبل اس کے کہ طٰہٰ مینا سے رونے کی وجہ پوچھتا۔ ماریہ بول پڑی۔
"کیسے ہیں آپ طٰہٰ بھائی۔"
"جی اچھا ہوں۔"
"وہ اصل میں میں کل آسٹریا جا رہی ہوں اپنی پھوپو کے پاس تو بس اس لیے مینا سے ملنے چلی آئی۔ اور وقت گزرنے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ چلیں، اچھا اب میں چلتی ہوں اور اپنی بیگم کو سمجھا دیجیے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا چھوڑ دے۔" ماریہ نے بات کا آخری حصہ مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ مینا نے مصافحہ کرتے ہوئے ماریہ کو بیٹھنے کا کہا تھا اور کھانے کی بھی پیشکش کی تھی۔
"یہاں آنے سے پہلے کھانا کھا کر آئی تھی۔ اب دو گھنٹے بعد کھانے کی کوئی تُک نہیں۔" مینا ماریہ کو دروازے تک رخصت کرنے گئی تھی۔
'تو کیا مینا ماریہ کے آسٹریا جانے کی وجہ سے رو رہی تھی۔' طٰہٰ نے سوچا تھا اور جب مینا ماریہ کو گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئی تو طٰہٰ لاؤنج میں موجود صوفے پر نیم دراز تھا۔ جوتے اور جرابیں بھی اس نے اتار لی تھیں۔
"چلیں بیڈ روم میں چلتے ہیں۔ ٹھہریں میں آپ کے لیے سلیپر لے آتی ہوں۔" مینا نے بوٹ کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا، جسے طٰہٰ نے پکڑ لیا تھا۔
"ایک منٹ بیٹھو۔" مینا طٰہٰ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ طٰہٰ نے بھی اندازِ نشست تبدیل کیا۔ اب ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف تھا۔
طٰہٰ نے مینا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ مضبوط گرفت میں۔
"تم رو کیوں رہی تھیں؟" طٰہٰ نے مینا کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا تھا۔
"وہ بس......ویسے ہی۔"
"مینا! بھلا کوئی ویسے بھی روتا ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔ تم کیوں رو رہی تھیں؟ ماریہ آسٹریا جا رہی ہے، اس لیے؟"
"نہیں۔ وہ اصل میں......" اتنا کہہ کر مینا نے ایک وقفہ لیا تھا۔ "کوئی خاص بات نہیں۔"
"خاص نہیں تو عام سہی۔ بتا بھی دو کہ کیا وجہ ہے؟"
"اصل میں وہ......" مینا نے ایک بار پھر وقفہ لیا تھا۔
"اب بتا بھی دو۔ کیا پیچھے گھر میں کوئی مسئلہ ہے۔" طٰہٰ نے مینا کے میکے کے بارے میں پوچھا تھا۔

''نہیں نہیں۔ وہاں سب خیریت ہے۔ اصل میں ماریہ نے مجھے بتایا تھا کہ یو، می اور ہم فلاپ ہوگئی ہے۔ تو بس آنکھوں میں آنسو آگئے۔'' مینا نے جھکتے ہوئے بالآخر بتادیا۔ یہ سنتے ہی مینا کے ہاتھ پر طٰہٰ کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑگئی تھی اور طٰہٰ کو ایسے لگا تھا جیسے کسی نے اس کے سر پر بڑے زور کا ہتھوڑا مارا ہو، پھر یکدم ہی اسے بہت زیادہ غصہ آگیا اور اس نے مینا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ کیا کرے۔ سر بھی یکدم بہت بھاری ہوگیا تھا، بالآخر اس نے آنکھیں موند لیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔

''کیا ہوا؟'' مینا کے لیے طٰہٰ کا یہ ردِعمل خلافِ توقع تھا۔ طٰہٰ نے مینا کی بات کا جواب نہ دیا۔ مینا کو اندازہ ہوگیا کہ طٰہٰ کو اس کی بات کچھ اچھی نہیں لگی۔

''آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی۔'' مینا نے کہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ طٰہٰ کے بالوں میں ہاتھ پھیرے، لیکن طٰہٰ کے تاثرات کچھ ایسے کرخت اور سپاٹ تھے کہ مینا کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ طٰہٰ نے دوسری بار بھی مینا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''سوری'' چند لمحوں کے بعد مینا نے کہا تھا۔

''سوری'' طٰہٰ نے اس لفظ کو دل ہی میں دہرایا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول لیں۔ مینا اس سے معذرت کررہی تھی۔ اس نے مینا کی طرف دیکھا تھا۔ مینا طٰہٰ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ طٰہٰ کو اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر مینا نے خجالت سے سر جھکالیا تھا۔

غصہ جس قدر جلدی سے آیا تھا۔ اس قدر جلدی چلا گیا تھا، کیوں کہ مینا نے طٰہٰ سے معذرت کی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی طٰہٰ کے لیے۔ طٰہٰ نے ہاتھ سے مینا کا جھکا ہوا چہرہ اوپر کیا تھا۔ مینا کے چہرے پر بے چارگی طاری تھی۔ اس کی افسردگی دیکھ کر طٰہٰ مسکرادیا۔

''نو پرابلم۔'' طٰہٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور پھر چند ثانیوں بعد مینا بھی مسکرا رہی تھی۔

''مینا سے میں آرام سے بات کروں گا کہ وہ فلموں میں اپنی توجہ کم کرے۔ وہ یقیناً میری بات مانے گی۔'' لاؤنج سے بیڈروم اور پھر بیڈروم سے ڈائننگ ٹیبل تک آتے ہوئے طٰہٰ نے کئی بار سوچا تھا۔

......☆☆☆......

زندگی میں بہت سے حادثے ہوتے ہیں۔ جن میں ہم بہت سی چیزیں گنوا بیٹھتے ہیں اور ان چیزوں کو گنوا کر بھی ہم جیتے ہیں، جیتے ہی چلے جاتے ہیں، کبھی بامقصد تو کبھی بے مقصد بس یوں ہی...... کبھی کبھار انسان بامقصد سے بے مقصد کا سفر کرتا ہے اور کبھی بے مقصد سے بامقصد تک۔

غالب بھی پہلے بامقصد زندگی گزار رہا تھا، نیورو سرجن بننا چاہتا تھا۔ اپنے ماں باپ کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ رطابہ کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزارنا چاہتا تھا، لیکن جب سے وہ ایک بازو سے محروم ہوا تھا اسے ہر چیز زہر لگنے لگی تھی۔

اس رات ایک بجے ہونے والے روڈ ایکسیڈنٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ غالب کو کہنی تک اپنے بائیں بازو سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اب وہ جسمانی طور پر ایک نامکمل انسان تھا۔ وہ ابھی تک ہاسپٹل میں تھا۔ آنکھیں آپ ہی آپ ہر آدھ گھنٹے، گھنٹے بعد نمکین پانی سے بھرنے لگتیں۔ اگر عارفہ اکیلی ہوتیں تو وہ یقیناً روزمل کر کئی گھنٹے روتے۔ یہ تو غالب کے والد زین العابدین صاحب تھے جو اگر وہ ذرا بھی رونے لگتے تو بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔

ایک بار، بس ایک بار رطابہ روئی تھی غالب کے سامنے۔ پھر بس۔ اب تو وہ ہمہ وقت چاق و چوبند رہتی تھی۔ خوشگوار لہجہ، محبت بھرے انداز اور دوستانہ رویہ۔ لیکن غالب کو کچھ بھی نہ اچھا لگتا تھا۔ حالاں کہ چوبیس گھنٹوں میں کوئی نہ کوئی ملنے والا ضرور اس کے پاس موجود رہتا تھا۔ غالب کی ساس سلطانہ بھی صبح کو آتیں تو پھر شام کو ہی

لوٹتی تھیں۔ شاہین اور سیف بھی روزانہ ہی آتے تھے۔
غالب کی سالیاں مینا اور نینا اور ان کے شوہر طٰہٰ اور عاشر سب ہی آتے تھے۔ پہلے پہل تو مینا اور نینا بھی خوب روئی تھیں، لیکن پھر رطابہ نے انہیں متنبہ کیا تھا کہ رونے سے غالب کو محرومی کا احساس زیادہ ہوگا، ویسے بھی یہ خدا کی مرضی تھی۔ اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی رونا دھونا نہیں۔''
بس اب مینا اور نینا بظاہر اچھے موڈ کے ساتھ آتیں۔ غالب کے ساتھ یک طرفہ گپیں لگاتیں اور بوجھل دل کے ساتھ چلی جاتیں اور پھر غالب کے رشتہ دار کزنز وغیرہ۔ سب ہی تو آتے تھے اسے حوصلہ دینے، اس کی ہمت بندھانے اور اس کے غم میں شریک ہونے کے لیے۔ حماد اور اس کے دوسرے دوست بھی آتے تھے۔ لیکن غالب کسی کے ساتھ سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔
کافی دنوں سے بس یا تو نیند آور دوائیوں کی وجہ سے سویا رہتا یا جب وہ جاگتا تو آنکھیں بند کیے لیٹا رہتا۔ مہینہ ہونے والا تھا اس بات کو، لیکن اب بھی کبھی کبھار کافی زور کا درد ہوتا تھا اور اکثر اوقات درد سے بھی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ دکھ سے تو اسے کوئی رونے نہ دیتا تھا، چلو یہ درد کی وجہ سے نکلنے والے آنسو ہی سہی......
اب زندگی یکدم غالب کو بوجھ لگنے لگ گئی تھی۔
ایک بہت بڑا بوجھ۔

......☆☆☆......

حالات کچھ اور ہوتے تو نینا رپورٹس دیکھ کر بہت خوش ہوتی، لیکن غالب کے ساتھ ہونے والا حادثہ......
پریگننسی ٹیسٹ پوزیٹو دیکھ کر بھی وہ نہ تو بہت زیادہ پُر جوش ہوئی اور نہ ہی کھل کر کھلکھلائی، البتہ مسکرائی ضرور تھی۔ ایک خوشگوار احساس تو اب بھی ہوا تھا اسے۔
نینا اپنی ساس کے ساتھ اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس آئی تھی۔
زاہدہ بھی خوش ہوئی تھیں، لیکن بس ڈھیلی ڈھیلی سی۔ غالب آخر ان کی گہری دوست عارفہ کا بیٹا تھا۔ اور وہ بھی غالب سے اُنس رکھتی تھیں۔ جب شام کو عاشر آیا اور نینا نے اسے بتایا تو وہ بہت خوش ہوا، بلکہ اس نے تو خوشی سے کمرے میں سلیقے سے موجود ہر چیز کو بکھیرنا شروع کر دیا۔ کشن اٹھا کر دور پھینک دیے، ڈریسنگ ٹیبل پر موجود سامان بھی اوپر نیچے کیا، بیڈ شیٹ بھی کھینچ کر نیچے پھینک دی اور ایک تکیے کا کور بھی اتار دیا۔
''کیا ہو گیا ہے آپ کو۔'' نینا عاشر کو برابر منع کیے جا رہی تھی، لیکن وہ ہنستے ہوئے کام بڑھاتا ہی جا رہا تھا۔
''دیکھ نہیں رہیں۔ خوشی منا رہا ہوں۔'' عاشر نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور بیڈ پر چھلانگ لگا کر بیٹھ گیا تھا۔
''یہ خوشی منانے کا کون سا طریقہ ہے۔ اتنا سارا کام بڑھا دیا۔ اب ہر چیز کو اپنے ٹھکانے پر رکھنا پڑے گا۔'' مینا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کچھ پھیکی تھی۔
''بھئی۔ اپنا تو یہی انداز ہے، اور میں تو ایسے ہی کروں گا۔'' عاشر نے کہا تھا۔ وہ مستقل مسکرا رہا تھا۔
''اور تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا خوشی نہیں ہوئی، جو ایسے منہ لٹکائے بیٹھی ہو۔'' عاشر نے نینا کے چہرے کا پھیکا پن محسوس کیا تھا۔
''نہیں ایسا نہیں ہے۔ مجھے بھی بہت اچھا لگا ہے......بس ویسے ہی۔'' نینا نے الجھ کر کہا تھا۔
''نینا اِدھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔'' اور نینا آکر عاشر کے پاس بیٹھ گئی۔
''تم غالب کے ساتھ ہونے والے حادثے کی وجہ سے پریشان ہو نا۔'' نینا نے عاشر کو اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
''نینا سمجھداری سے کام لو تم۔ ڈیڑھ مہینے سے اوپر ہو گیا ہے حادثے کو ہوئے اور تم ابھی تک......ویسے میں تو تمہیں سمجھدار سمجھتا تھا۔ جو کچھ ہو گیا ہے اسے قبول کرو کھلے دل کے ساتھ اور جب تم وہاں غالب کے پاس جاتی ہو اس وقت بھی تمہارے انداز ایسے پریشان کن ہوتے

ہیں۔ بھئی اگر تم لوگ ایسا کرو گے تو غالب کو کون سنبھالے گا؟ اسے کون ہمت دے گا؟ کمال ہے کچھ خیال کرو اور اس بات کو ذہن سے اتارو۔ جب تم لوگ اسے نارمل لو گے تو آٹو میٹک غالب خود بھی اپنے آپ کو نارمل لینا شروع کر دے گا۔'' عاشر نے حتی المقدور نینا کو سمجھایا تھا۔

''میری بات سمجھ میں آئی نا۔'' عاشر نے کہا تھا اور نینا نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''چلو اب موڈ ٹھیک کرو۔ گھر میں کس کس کو پتا ہے؟''

''میں نے تو کسی کو نہیں بتایا۔ امی نے شاید کسی کو بتایا ہو، لیکن مجھے کوئی مبارک باد دینے نہیں آیا اور نہ ہی مٹھائی کا مطالبہ کرنے۔''

''امی نے بھی یقیناً کسی کو نہیں بتایا ہوگا۔ یہ سوچ کر کہ ہم خود بتائیں گے۔ چلو تھوڑی دیر بعد خود جا کر بتا آتے ہیں، پہلے تم مجھے پانی پلاؤ۔ پیاس لگی ہے قسم سے بڑے زور کی۔''

''اچھا میں لاتی ہوں۔ اور آپ بھی تیاری کر لیں۔ میں اس خاص موقع پر تگڑا سا گفٹ لوں گی آپ سے۔'' نینا نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔

''ہائے بیگم! ڈراؤنی باتیں تو مت کرو۔ ویسے بھی میں دل کا بہت کمزور ہوں۔'' عاشر نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اور باہر جاتی ہوئی نینا جو مسکرا رہی تھی، کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

......☆☆☆......

غالب کے ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونے کے بعد مینا اور طٰہٰ اس سے ملنے اس کے گھر آئے تھے۔ یہ دونوں مغرب کے وقت آئے تھے۔ مینا نے رطابہ کو فون کر کے پوچھا تھا کہ اگر وہ غالب کے پاس ہے تو رُک جائے، واپسی پر وہ لوگ رطابہ کو گھر چھوڑتے جائیں گے، لیکن رطابہ نے کہا تھا کہ وہ اس وقت اپنے روم میں بیٹھی ہے۔ غالب کی طرف سے آئے ہوئے اسے لگ بھگ آدھا گھنٹا ہو چکا ہے۔

مینا اور طٰہٰ سرخ گلابوں کا ایک بُوکے لیتے آئے تھے اور جب وہ غالب کے روم میں داخل ہوئے تھے تو غالب ملگجے کپڑوں میں بیڈ پر بیٹھا تھا۔ بالکل ساکن۔ عارفہ بھی پاس ہی بیٹھی تھیں۔ وہ غالب سے کچھ پوچھ رہی تھیں، لیکن غالب شاید سن نہیں رہا تھا۔

مینا اور طٰہٰ کو دیکھ کر بھی غالب نے نہ اپنا اندازِ نشست تبدیل کیا اور نہ ہی چہرے کے سپاٹ تاثرات۔ ان کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا اس نے، البتہ طٰہٰ کا مصافحہ کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ ضرور تھاما تھا، لیکن وہ بھی بہت ٹھنڈے انداز میں۔

مینا اور طٰہٰ صوفے پر بیٹھ گئے۔ مینا اور عارفہ میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ اس کے بعد مینا نے غالب سے پوچھا تھا۔

''کیسے ہیں غالب بھائی؟'' غالب نے مینا کی بات کا جواب نہ دیا، بس ساتھ ساتھ بیٹھے طٰہٰ اور مینا کو تکنے گیا۔

''طبیعت کیسی ہے اب آپ کی؟'' مینا نے چند لمحے انتظار کیا تھا غالب کے جواب کا، لیکن جب اس نے جواب نہ دیا تو پھر پوچھا۔

غالب نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا تھا، بس انہیں ایک ٹک دیکھتا رہا تھا۔

غالب کے اس رویے پر نہ مینا گڑبڑائی اور نہ ہی طٰہٰ نے اس بات کا نوٹس لیا، کیوں کہ جب سے غالب کے ساتھ حادثہ ہوا تھا۔ اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔ وہ کسی بھی بات کا جواب نہ دیتا تھا، بس چپ چاپ سامنے والے بندے کو دیکھتا رہتا یا پھر کسی غیر مرئی نقطے کو تکتا رہتا۔

بالآخر عارفہ نے بتایا کہ اب سب خیریت ہے اور اب درد بھی نہیں ہوتا، البتہ زخم کو بھرنے میں کچھ ہفتے مزید لگیں گے۔ عارفہ کے بتانے کے بعد کچھ لمحے خاموشی کے گزرے تھے۔ اس کے بعد طٰہٰ نے اسے کل ہونے والے ٹوئنٹی ٹوئنٹی میچ کی تفصیل بتائی تھی۔ طٰہٰ بولتا

رہا اور غالب اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ چپ چاپ۔ اب اسے کسی کا بولنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک ناگوار سا احساس ہوتا تھا، جیسے اب بھی ہو رہا تھا، لیکن وہ اسے برداشت کر رہا تھا۔

جب سامنے والا کوئی جواب نہ دے یا کسی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہ لے تو دوسرا بندہ آخر کتنا بولے گا۔ سو طٰہٰ نے بھی پانچ منٹ میں ساری تفصیل بتادی تھی اور کھلاڑیوں کی پرفارمنس پر بھی تبصرہ کرلیا تھا اور اب پھر خاموشی کا ایک وقفہ آیا تھا۔ دراصل طٰہٰ اور مینا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا بات کریں۔

''یہ...... یہ پھول آپ کے لیے ہیں۔'' چند لمحوں بعد مینا نے بُوکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ غالب نے سامنے ٹیبل پر پڑے بُوکے کو دیکھا تھا۔ اسے وہ پھول اپنے اوپر ہنستے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ہنس ہنس کر ہمدردی کرتے ہوئے، جیسے اس وقت طٰہٰ اور مینا ہمدردی کرتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

غالب کا دل چاہا کوئی ایسی وزنی چیز ہاتھ لگ جائے جسے وہ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اتنے زور سے باری باری طٰہٰ اور مینا کے سر پر مارے کہ وہ پھر اس کے پاس تمسخر بھری ہمدردی کرنے نہ آئیں۔

''دونوں ہاتھ۔'' اپنا ہی خیال اس کے لیے تکلیف دہ بن گیا تھا۔

اب مینا ہنستے ہنستے ہوئے اسے کوئی دل چسپ بات بتا رہی تھی اور غالب کو مینا پر شدید غصہ آیا تھا۔

''کیا بکواس کر رہی ہیں آپ۔ میں نے آپ سے کہا ہے کہ مجھ سے ہمدردی کریں۔ نہیں ضرورت مجھے آپ کی کسی ہمدردی کی۔ ایک احسان کیجیے۔ آئندہ کبھی مجھ سے ہمدردی کرنے مت آیئے گا، بہت ہوگیا۔ جسے دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے، میرا تماشا دیکھنے۔ مزہ آتا ہے آپ کو میری بے بسی دیکھ کر۔'' غالب شاید ابھی مزید بولتا، لیکن پوری شدت کے ساتھ غصے میں بولنے کی وجہ سے ہانپنے لگ گیا تھا۔

جانے غالب کے غصّے کی اصل وجہ کیا تھی؟ قدرت، لوگوں کی ہمدردی، اپنی بے بسی یا پھر خود ترسی۔ جو بھی وجہ تھی لیکن اس نے مینا سے بہت برے انداز میں بات کی تھی۔ غالب کے الفاظ سن کر طٰہٰ اور مینا ششدر رہ گئے تھے اور عارفہ کا منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اتنے دن ہوگئے تھے وہ کسی سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔ رطابہ سے بھی کچھ نہ بولتا تھا اور آج جب وہ بولا تھا تو اس قدر......

''غالب!!'' عارفہ کا لہجہ تنبیہی تھا۔ ''ایسے بات کرتے ہیں مہمانوں سے۔'' دُکھ ہوا تھا۔ غالب نے کبھی کسی کے ساتھ اتنی بدتمیزی نہیں کی تھی۔

''تو پھر یہ کیوں میرا تماشا دیکھنے آجاتے ہیں۔'' غالب کا انداز پہلے جیسا تھا۔ عارفہ کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ دو مہینے ہوگئے تھے حادثے کو اور غالب آج کچھ بول رہا تھا اور وہ بھی یہ...... طٰہٰ اُٹھ کھڑا ہوا۔ مینا نے بھی طٰہٰ کی تقلید کی تھی۔

''بھائی ہو تم ہمارے، چھوٹے بھائی۔ نہ کوئی ہمدردی کرنے آتے ہیں ہم اور نہ ہی کوئی تماشا دیکھنے۔ بس اپنے بھائی کی خیریت پوچھنے آتے ہیں۔ عزیز جو ہو تم ہمارے۔ اس وقت تم غصّے میں ہو۔ ہم پھر آئیں گے تمہاری خیریت پوچھنے۔ اور تم یہ خوامخواہ کی باتیں اپنے دل سے نکال دو۔'' طٰہٰ نے بڑے رسان سے کہا تھا۔

''اوکے، آنٹی اب ہم چلتے ہیں۔'' طٰہٰ نے عارفہ کے قریب جا کر سر جھکایا تھا تاکہ وہ سر پر ہاتھ پھیریں۔ مینا بھی قریب جا کر ملی تھی، لیکن عارفہ کچھ شرمندہ سی نظر آرہی تھیں۔

''آنٹی۔ کچھ نہیں ہوا۔ آپ مسکرائیں اور غالب کو بھی پھر سے مسکرانا سکھائیں۔'' مینا نے عارفہ سے کہا تھا۔

''اوکے خدا حافظ۔'' روم سے باہر جاتے ہوئے مینا نے مسکرا کر غالب کو خدا حافظ کہا تھا، لیکن غالب نے

جواب نہیں دیا تھا۔اس کے تیور ہنوز بگڑے ہوئے تھے۔

☆☆☆......

کمرے میں بیڈ لیمپ نے مدہم سا اجالا کیا ہوا تھا۔ مینا اور طٰہٰ دونوں ہی نائٹ ڈریس میں ملبوس تھے اور کچھ فاصلے سے لیٹے ہوئے تھے۔ ان دونوں نے ایک ہی کمبل شیئر کیا ہوا تھا۔

''غالب کافی اَپ سیٹ ہے۔ کافی عرصہ لگ جائے گا اسے اپنے آپ کو سنبھالنے میں۔ ٹریجڈی ہی اتنی بڑی ہے۔'' طٰہٰ نے کہا تھا۔ وہ جب سے غالب کے گھر سے آیا تھا مسلسل غالب کے بارے میں ہی سوچ جارہا تھا۔

''ہاں! آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ ویسے غالب کو برداشت اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔ جو ہونا تھا، سو ہو چکا۔ اب اسے اپنے آپ کو مین ٹین رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' مینا نے کہا تھا۔ وہ بھی مسلسل غالب کے بارے میں سوچ جارہی تھی۔

''کیوں؟ اس کا کیا فائدہ ہوگا۔'' طٰہٰ نے تکیے کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا تھا اور اپنا رخ مینا کی طرف کرلیا تھا، جبکہ مینا سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔

''دیکھیں نا جس طرح آج غالب نے بی ہیو کیا ہے۔ اس سے یہی مطلب نکلتا ہے کہ اسے ہمارا رویہ ہمدردانہ لگتا ہے۔ ویسے بات اس کی بھی غلط نہیں۔ ہم لوگ چاہے جتنے بھی اس کے غم میں شریک ہوں لیکن ہم اس کا نقصان تو شیئر نہیں کرسکتے نا۔ اگر وہ تحمل سے کام لے گا تو اسے اِس نقصان کو برداشت کرنے میں آسانی ہوگی۔ جہاں تک میرا خیال ہے بندے کو اپنے سلسلے میں اتنی برداشت تو ہونا ہی چاہیے۔ عزیز چاہے جتنا بھی قریبی ہو۔ وہ صرف ہمارا دُکھ بانٹ سکتا ہے ہمارا نقصان نہیں۔''

''عزیز چاہے جتنا بھی قریبی ہو۔ وہ صرف ہمارا دُکھ بانٹ سکتا ہے۔ ہمارا نقصان نہیں۔'' طٰہٰ کے کانوں میں مینا کا آخری جملہ گونجنے لگ گیا۔ یہ اسے اپنے گلے میں کچھ اٹکتا محسوس ہوا تھا۔

''چاہے جتنا بھی قریبی ہو؟'' طٰہٰ نے دقت سے پوچھا تھا۔ اسے بولنے میں بھی دقت ہوئی تھی۔

''ہاں! آخر ہر بندہ اپنا وجود رکھتا ہے۔ ایک کا نقصان دوسرا کیسے بانٹ سکتا ہے۔ اب رطابہ اپنا ہاتھ غالب کو تو نہیں دے سکتی۔'' مینا مزید بھی کچھ بول رہی تھی۔ رطابہ اور غالب کو ملحق کر کے، لیکن طٰہٰ کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ یہ دوسرا فقرہ تھا جو طٰہٰ کو کانٹے کی طرح پھنس گیا تھا۔

''ہر بندہ! اپنا وجود رکھتا ہے۔''

مینا ابھی بول ہی رہی تھی، جب طٰہٰ نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''کیا ہم دونوں بھی ایک دوسرے کا نقصان نہیں بانٹ سکتے۔'' طٰہٰ نے پوچھا تھا۔ نائٹ لیمپ کی روشنی کافی کم تھی، ورنہ مینا دیکھ سکتی کہ طٰہٰ کی آنکھیں کس قدر سرخ ہو چکی ہیں۔

''آف کورس طٰہٰ۔ ہم بھی تو انسان ہیں۔ اب تم خود سوچو کہ بالفرض ہم میں سے کسی ایک کا کوئی بھی نقصان دوسرا کیسے شیئر کرسکتا ہے۔ ہم صرف ایک دوسرے کا دکھ بانٹ سکتے ہیں۔'' طٰہٰ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اسے آری سے کاٹنا شروع کردیا ہے۔ اس نے کروٹ بدلی اور مینا کی طرف پشت کرلی۔ آنکھیں خود بخود نمکین پانی سے بھر گئیں۔ شاید وہ آنسو مینا کو نہیں دکھانا چاہتا تھا، لیکن طٰہٰ کا کروٹ بدلنا مینا کو عجیب لگا تھا۔

'کیا ہوا ہے، کہیں طٰہٰ کو میری بات تو بُری نہیں لگی'۔ مینا کو خیال آیا تھا۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد مینا نے طٰہٰ کو ہلایا تھا اور طٰہٰ کا رُخ اپنی طرف کرنا چاہا تھا۔

طٰہٰ نے بھی اپنا رُخ مینا کی طرف کرلیا تھا۔ مینا کے خیالات نے اسے بہت دُکھ پہنچایا تھا، اس کا، اس کی محبت کا نقصان کیا تھا۔ جس کی تلافی اب صرف مینا ہی کرسکتی تھی اور شاید طٰہٰ بھی اپنا دُکھ و نقصان مینا کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا۔ اس لیے کچھ ہی لمحوں بعد اپنا رُخ مینا کی طرف کردیا تھا۔ آنکھیں اور گال ویسے بھی گیلے تھے۔

مینا نے بھی ایک آنسو کو آنکھ سے نکلتے اور گال بھگوتے دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر مینا یکدم بہت شرمندہ ہوگئی تھی اور طٰہٰ نے اپنے آنسو صاف کیے تھے اور پھر مینا کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ مینا کا سر طٰہٰ کے سینے پر تھا۔ کتنے ہی لمحے یوں ہی سرک گئے تھے۔

''سوری'' مینا نے کہا تھا۔ اس کا سر ہنوز طٰہٰ کے سینے میں پناہ لیے ہوئے تھا۔

''آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی۔'' سوری کہنے کے چند لمحوں بعد مینا نے کہا تھا۔ طٰہٰ نے مینا کے گرد اپنے بازوؤں کی گرفت کچھ اس طرح ڈھیلی کی تھی کہ مینا اسے دیکھ سکے۔

''مینا مجھے کسی دوسرے کا تو پتا نہیں، لیکن میری خوشی، غم، فائدہ نقصان، سب کچھ تمہارے ساتھ منسلک ہے۔ صرف تمہارے ساتھ میں تمہارا ہر نقصان بانٹ سکتا ہوں، ہر نقصان۔ اور اگر کبھی تم میرا نقصان نہ بانٹ سکیں تو سچ کہے دیتا ہوں کہ حرکتِ قلب خود بخود بند ہوجائے گی۔ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ بہت زیادہ۔ آئی لو یو۔'' طٰہٰ نے مینا کا ماتھا چوما تھا۔

مینا نے طٰہٰ کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہاں مینا کے لیے سب کچھ تھا۔ مینا نے نظریں جھکا لیں اور اپنے ساتھ اعادہ کیا کہ وہ طٰہٰ کی ہر ممکن خدمت کرے گی اور اسے کوئی دُکھ نہ دے گی اور ساتھ ساتھ طٰہٰ کے معاملے میں اپنے آپ کو بہتر کرے گی۔

مینا نے ایک بار پھر طٰہٰ کے سینے میں پناہ لی تھی اور ساتھ ساتھ ''آئی لو یو ٹو'' بھی کہا تھا۔

''آئی لو یو ٹو۔''

''نینا تمہارے والد صاحب آئے ہوئے ہیں۔'' عاشر نے سنجیدگی سے نینا کو بتایا تھا۔ نینا کو بتانے کا اس کے پاس کوئی اور بہتر طریقہ نہیں تھا۔

''ابو آئے ہیں، اکیلے۔'' نینا کو حیرت ہوئی تھی۔ سیف پہلے کبھی نینا کے گھر نہیں آئے تھے، اسی لیے سیف کے آنے کا سوچ کر نینا کو حیرت ہوئی تھی۔

''کہاں بٹھایا آپ نے۔ ہاشم اور حاشر کے کمرے میں؟''

''ہوں'' عاشر نے اثبات میں بھی سر ہلایا تھا۔

''ضرور کوئی خاص بات ہوگی، جو ابو آئے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔ آپ ابو کو اِدھر اپنے کمرے میں ہی لیتے آتے۔'' نینا نے سلیقے سے دوپٹا اوڑھتے ہوئے کہا تھا۔

عاشر نے مزید کوئی استفسار نہ کیا۔ اس کے چہرے پر کافی سنجیدگی تھی، لیکن نینا نے نوٹ نہیں کی۔ سیف کی آمد کا سوچ کر اسے ویسے ہی بڑی حیرت ہورہی تھی، کیوں کہ سیف شادی کو اتنے مہینے ہوجانے کے باوجود کبھی بیٹی کے گھر نہیں آئے تھے، حالانکہ محلّہ بھی ایک ہی تھا۔

''آپ بھی چلیں نا۔'' دوپٹا ٹھیک کرنے کے بعد نینا نے عاشر سے کہا تھا۔

''تم چلو، میں آتا ہوں۔'' عاشر نے کہا تھا۔ نینا کا اکیلے جانا ہی اسے بہتر لگا تھا۔ نینا کمرے سے باہر چلی گئی۔ اپنے کمرے سے ہاشم اور حاشر کے کمرے کا فاصلہ طے کرنے تک وہ خیر و عافیت کی دعا مانگتی رہی کہ گھر پر سب خیر ہی ہو۔

''السلام علیکم ابو!'' نینا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ کمرے میں ایوب لغاری صاحب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ''ابو'' سنتے ہوئے ان کا سر اضطراری طور پر اٹھا تھا اور انہوں نے آواز کی سمت دیکھا تھا۔ جہاں نینا کھڑی تھی۔

کمرے میں سیف کی بجائے کسی اور شخص کو پاکر نینا ٹھٹھک گئی۔ صرف چند لمحوں میں نینا کو پتا چل گیا تھا کہ سامنے موجود شخص کون تھا، کیوں کہ ایوب لغاری اور نینا کی شکلوں میں کافی مشابہت تھی۔ نینا کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔

''وعلیکم السلام! بیٹی۔'' ایوب صاحب نے کچھ وقفے کے بعد کہا تھا۔

''بیٹی'' پہلی بار نینا کو یہ لفظ اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن بُرا بھی نہیں لگا تھا۔ بس کچھ عجیب سا لگا تھا۔ نینا کو سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے۔

''بیٹھیں۔'' بالآخر نینا نے کہا تھا۔ ایوب لغاری اس وقت کھڑے ہو گئے تھے جب نینا اندر آئی تھی۔ نینا بھی ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ نینا نے ایوب صاحب کی شخصیت کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔

باریش داڑھی، جھریوں زدہ چہرہ، مناسب وجود لیکن کمر جھکی ہوئی۔ جب نینا کی نانی حیات تھیں تو انہوں نے اسے کئی بار ایوب لغاری کی شاہین کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے بارے میں بتایا تھا۔ نانی نے اسے یہ بتایا تھا کہ اس کا حقیقی والد بہت ظالم اور اذیت پسند انسان تھا۔ شاہین کو مارتا پیٹتا تھا اور جب وہ پیدا ہوئی تو اس شخص نے بیٹی کو قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ شاہین کو طلاق دے دی۔ ان باتوں کی تفصیل نانی نے اسے اتنی بار سنائی تھی کہ اسے اپنے باپ ایوب لغاری سے نفرت ہو گئی تھی۔ لیکن سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ کر نفرت کہیں نہیں ابھری تھی۔ کچھ عجیب لگا تھا۔ بہت ہی عجیب۔ ہاں البتہ اسے تھوڑی بہت ہمدردی ہوئی تھی، شاید ایوب لغاری کے چہرے پر بے چارگی رقم تھی۔ ایوب لغاری سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''جی کیسے آنا ہوا؟'' نینا نے پوچھا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ ان کا آنا نینا کو اچھا نہیں لگا تھا اور وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیوں آنا ہوا۔ ایوب لغاری نے سر اٹھا کر نینا کو دیکھا تھا۔ ان کی نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ نینا سٹپٹا گئی۔

''بیٹا تم سے ملنے آیا ہوں۔'' ایوب لغاری نے کچھ وقفے بعد ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

''اب۔'' اتنے سالوں بعد، کے الفاظ اس 'اب' کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ جو نینا نے ادا نہیں کیے تھے۔ لیکن وہ الفاظ بھی ایوب لغاری تک پہنچ گئے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس سر کو مزید جھکا لیا تھا۔

کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

''شادی کب ہوئی تمہاری؟'' ایوب لغاری نے جی کڑا کر پوچھا تھا۔ وہ نینا سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ ڈھیر ساری باتیں، سو اس لیے انہوں نے بات شروع کی تھی۔

''کیا یہ غیر ضروری سوال نہیں۔ آپ جان کر کیا کریں گے؟'' نینا کا لہجہ کچھ ایسا کاٹ دار تھا کہ وہ مزید کچھ نہ بولے۔ ایک بار پھر خاموشی کا وقفہ آیا تھا۔

نینا کو اپنے ابتدائی بچپن کا وقت یاد آنے لگا جب شاہین کی سیف سے شادی ہوئی تھی اور اس دوسری شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ سیڑھیوں سے گر کر سات سال ہوش وخرد سے بے گانہ ہو گئی تھیں۔

'اگر انہوں نے امی کو اذیتیں نہ دی ہوتیں تو شاید ایسا نہ ہوتا۔' نینا سوچ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کے دل میں ناگواریت کا احساس بھی پیدا ہو رہا تھا، جو گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ نانی کی باتوں کی بازگشت بھی کانوں میں سنائی دے رہی تھی، جو کہ ناگواریت کا احساس بڑھا رہی تھی۔

دل میں کہیں ہمدردی نے بھی سر اٹھایا تھا۔ ایوب لغاری کا جھکا ہوا سر اور قدرے جھکی کمر دیکھ کر۔ لیکن ناگواریت اتنی زیادہ تھی کہ ہمدردی کا جذبہ دبتا جا رہا تھا۔ ''جب تم کمرے میں آئی تھی تو تم نے مجھے 'ابو' پکارا تھا۔'' ایوب لغاری اُمید لیے بیٹھے تھے۔

''وہ عاشر نے آ کر کہا کہ تمہارے والد آئے ہیں تو میں سمجھی میرے ابو آئے ہیں، اس لیے۔ آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔'' نینا کے آخری الفاظ کافی تیز تھے۔ ان الفاظ نے ایوب لغاری کو اذیت دی تھی۔ نینا بھی یہی چاہتی تھی۔ خاموشی کا ایک بار پھر وقفہ آیا۔ یہ وقفہ پچھلے وقفوں سے کم تھا۔

''میں بھی تمہارا والد ہوں بیٹا!'' دل میں اُمید ابھی بھی تھی جبھی تو ایوب لغاری نے یہ کہا تھا۔

''اب یاد آیا ہے۔'' نینا نے دوبدو جواب دیا تھا۔

''لیکن۔''

''لیکن کیا......؟'' ایوب لغاری کچھ بولنا چاہتے تھے، لیکن نینا نے ان کی بات کاٹ دی۔ انہوں نے ایک نظر نینا کو دیکھا تھا۔ نینا کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی، اس لیے ایوب لغاری مزید کچھ نہیں بولے اور پھر چند لمحوں بعد وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' ایوب لغاری نے کہا تھا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''جی بہتر۔'' نینا بھی کھڑی ہوگئی۔ ایوب لغاری صاحب کی ساری اُمیدیں دم توڑ گئیں۔

کمرے سے باہر جاتے ہوئے ان کا دل چاہا تھا کہ نینا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعا دیں، لیکن اگر نینا نے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر سر ہی پیچھے کر لیا تو...... ان کا مان ٹوٹ جاتا، سو انہوں نے نینا کے سر پر ہاتھ پھیرنے کا خیال جھٹک دیا۔ ایوب لغاری نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے تھے کہ اسی وقت عاشر کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''جا رہے ہیں آپ؟'' عاشر نے پوچھا تھا۔

''ہاں بیٹا۔''

''چائے تو پیتے جائیے۔''

''نہیں۔ بس شکریہ۔ سدا خوش رہو۔'' یہ کہہ کر ایوب لغاری نے عاشر کو گلے لگا لیا۔ آخر عاشر نینا کا شوہر تھا۔

عاشر نے گلے ملتے ہوئے دیکھا تھا کہ ایوب لغاری کی آنکھیں کچھ کچھ بھیگی سی تھیں اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ عاشر انہیں باہر دروازے تک چھوڑنے گیا تھا۔

گلی کے شروع میں اس نے سیاہ رنگ کی بڑی سی گاڑی دیکھی تھی، جس کے ساتھ باوردی ڈرائیور بھی تھا۔ ایوب لغاری صاحب اسی گاڑی میں آئے تھے۔ واپس جب وہ اپنے روم میں آیا تو اسے نینا بیڈ کی ایک دراز کے ساتھ اُلجھتی ہوئی نظر آئی۔ عاشر آ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''نینا۔ اس قدر جلدی کیوں چلے گئے؟''

''کون۔'' نینا نے جھنجھلا کر دراز بند کر دی۔ اس نے دراز کیا چیز اٹھانے کے لیے کھولی تھی اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

''تمہارے والد۔''

والد کہنے پر نینا نے عاشر پر ایک تیز نگاہ ڈالی تھی اور دوسری دراز کھول لی تھی۔

''نینا! اِدھر میرے پاس آؤ۔''

''کیا ہے؟'' نینا نے پٹخ کر دوسری دراز بند کی تھی اور جھنجھلا کر عاشر کے پاس آئی تھی اور عاشر کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''تم نے ان سے چائے کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟'' عاشر نے آرام سے پوچھا تھا۔ وہ نینا کی باڈی لینگویج کو جج کر رہا تھا۔

''میری مرضی۔'' نینا نے تڑخ کر کہا تھا۔ ''اور آپ کیا تفتیش کرنے بیٹھے ہیں۔ کام کرنے ہیں میں نے بہت سے۔'' یہ کہہ کر نینا اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''نین۔ بیٹھ جاؤ۔'' عاشر نے مدھم آواز میں کہا تھا وہ بھی کبھار نینا کو نین بھی بلا لیتا تھا۔ عاشر نے نینا کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا تھا۔

''تم نے ان کے ساتھ بدتمیزی تو نہیں کی؟'' عاشر نے پوچھا تھا۔ نینا کا ایک ہاتھ عاشر نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ اپنائیت کے احساس کے لیے۔

''پتا نہیں۔'' نینا کا لہجہ ہنوز تیکھا تھا۔

''مطلب تم نے بدتمیزی کی ہے۔ کچھ خیال کرنا تھا، وہ تمہارے والد ہیں۔''

''اب یاد آیا ہے کہ وہ میرے والد ہیں۔'' نینا نے اپنا ہاتھ عاشر کی گرفت سے احتجاجاً چھڑایا تھا۔

''پندرہ سال یاد نہیں آیا کہ ان کی ایک بیٹی ہے۔''

''تمہاری آنکھیں کیوں بھیگ گئی ہیں نینا۔'' عاشر نے نینا کا ہاتھ دوبارہ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

''نہیں تو۔'' نینا نے آنکھیں صاف کی تھیں۔

''جھوٹ۔''

''نینا تم نے پہلے کبھی مجھ سے اپنے والد کا تذکرہ کیا

تھا کہ وہ تمہاری امی پر ظلم کرتے تھے۔ وہ سب باتیں ٹھیک نینا، لیکن اب وہ وقت گیا۔ جہاں تک میں نے تجزیہ کیا ہے، وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہیں۔ وہ صرف تمہاری محبت میں یہاں آئے ہیں۔ بڑھاپا انسان کا سارا غرور ختم کر دیتا ہے۔ تمہیں اس وقت انہیں سپورٹ کرنا چاہیے۔ کدورتیں ختم کرنا ہی اچھا ہے، باقی تم خود بھی سمجھ دار ہو، جو تمہیں بہتر لگے۔ اور رہ گئے پندرہ سال بعد انہیں یاد نہ آیا تو ان پندرہ سال میں تمہارے پاس بھی تو سیف انکل تھے جو شاید بلکہ یقیناً ان سے بہتر تھے۔'' عاشر نے آرام سے نینا کو سمجھایا تھا۔

''معاف کر دو انہیں۔'' عاشر نے مختصر الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ ساتھ میں نینا کا ہاتھ بھی دبایا تھا۔ نینا نے عاشر کو دیکھا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہی تھی اور پھر بولی تھی۔

''دل نہیں مانتا۔'' عاشر ہنس دیا تھا۔

''دل ایسی چیز نہیں جو نہ مانے۔ دل تو بس دل ہے، تم دل کو سمجھاؤ گی تو خود بخود مان جائے گا، باقی تمہاری مرضی۔'' عاشر نے نینا کا ہاتھ ایک بار پھر دبایا تھا اور نینا کی آنکھ میں پھر سے آنسو آ گئے تھے۔

......☆☆☆......

''تم نے بینا اور طٰہٰ بھائی کے ساتھ بدتمیزی کی تھی؟'' رطابہ نے غالب سے پوچھا تھا۔ رطابہ اس وقت بیڈ کے ساتھ پڑی چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔

غالب اس وقت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے اور ٹانگیں پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا۔ بالکل ساکن انداز میں اور اس نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔

غالب نے رطابہ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

''تم نے بینا اور طٰہٰ بھائی کے ساتھ بدتمیزی کیوں کی تھی؟'' رطابہ نے اپنے سوال کے الفاظ میں ردوبدل کیا تھا۔ غالب پھر بھی کچھ نہ بولا۔

''غالب! میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔'' رطابہ کو اُمید تھی کہ غالب اس بار بھی نہیں بولے گا، لیکن اس بار رطابہ کی سوچ کے برعکس ہوا تھا۔

''میرا سر مت کھاؤ۔'' غالب نے کہا تھا۔ اس نے کوئی جنبش نہیں کی تھی۔ ویسے ہی بیٹھا رہا تھا، ساکن انداز میں۔

''میں حرام چیز نہیں کھاتی۔'' رطابہ نے شوخ انداز میں کہا تھا۔ ایک بار رطابہ نے بھی غالب سے کہا تھا کہ میرا سر مت کھاؤ تو غالب نے بھی یہی جواب دیا تھا۔ رطابہ کو یہ انوکھا جواب سن کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ اور غالب دیر تک اس بات پر کافی دیر ہنستے رہے تھے۔

لیکن آج جب رطابہ نے یہ جملہ ادا کیا تو یہ جملہ دب گیا تھا۔ خاموشی کی دبیز تہہ کے نیچے۔

''اچھا تم مجھے جواب نہیں دیتے تو نہ سہی۔ ویسے تمہیں بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ چلو چھوڑو اس بات کو، میں تمہیں ایک بہت ہی اچھا جوک سناتی ہوں۔ کل میں نے میگزین میں پڑھا تھا۔'' غالب کو جوک بہت پسند تھے، اس لیے رطابہ نے یہ کہا تھا اور اسے جوک سنانا شروع کیا تھا۔

''ایک چینی ایک بار پاکستان آیا۔ پہلے تم آنکھیں تو کھولو۔ یہ کیا اسٹیچو بن کر بیٹھے ہو، مجھے کوفت ہو رہی ہے۔'' رطابہ نے اُٹھ کر غالب کو کندھے سے ہلایا تھا۔ جواباً غالب نے آنکھیں کھول لی تھیں اور رطابہ کو خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔

''اچھا اچھا۔ جیسے تمہارا دل چاہے بیٹھو، اور پلیز مجھے آنکھوں ہی آنکھوں سے مت نگلو۔'' رطابہ دوبارہ چیئر پر بیٹھ گئی تھی اور غالب کی دلجوئی کو زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائے ہوئے اُسے جوک سنا رہی تھی۔

ان دنوں غالب کو جو چیز سب سے بری لگ رہی تھی وہ ہنسی ہی تھی اور یہ پہلا موقع تھا جب کوئی غالب کے سامنے بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ غالب سے برداشت نہیں ہوا تھا۔

زندگی کے نشیب و فراز میں اُلجھے اس ناولٹ کی آخری قسط ماہِ مارچ میں ملاحظہ کیجیے۔

ناول

بینا عالیہ

تیرے عشق نچایا

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے
لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی سولہویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکی تھی۔ وہ کانوینٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اُمِ فروا اُمِ زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔اُمِ فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کر رہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُمِ فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آ گئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُمِ فروا کو ان کے حوالے کر دے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ اُمِ فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کر پایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کر دیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔ امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو اُمِ فروا پر کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ انہیں اعتماد میں لے کر اپنی اور اُمِ فروا کی رام کتھا سنا دیتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے اپنے ساتھ مراد ولا میں لے جاتا ہے

اور انیکسی میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فیری بلال کی تلاش میں ہے۔
اچانک ملک قاسم علی کی وفات ہو جاتی ہے۔ سارا جہان آباد سوگ میں ڈوبا ہے۔ ملک عمار علی سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے ملک کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔
ماہین کی ذراسی غفلت اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں بنا دیتی ہے۔ ماہین کے دل میں کسی طرح بھی بچے کی محبت پیدا نہیں ہو پاتی۔ وہ ماں کے سنگھاسن پر بیٹھ کر بھی کاشان کی محبت کی ہُوک اپنے دل میں محسوس کرتی ہے۔ امل دوسری بار ماں بننے والی ہے۔ محمد علی مہر النساء بیگم سے امل کا خیال رکھنے کا کہتا ہے۔ اِدھر مہر النساء بیگم دادی بننے کے بعد چاہتیں ہیں کہ ماہین ریاست کی بڑی ملکائن کی ذمے داریاں اُن کی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ماہین اِس صورتِ حال سے سخت متنفر ہے۔ وہ جلد از جلد جہان آباد سے واپس لاہور جانا چاہتی ہے۔ لیکن ملک عمار علی اُس کی باتیں سن کر......

(اب آگے پڑھیے)

''یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔'' اُسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کا تنفس تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور انگلیاں خنداں پیشانی پر سرسرانے لگی۔ اس نے نچلا ہونٹ سختی سے دبایا۔ کوشش کے باوجود وہ اُن دو براؤنش آنکھوں سے پیچھا نہ چھڑا پا رہی تھی۔ خود کو اُن آنکھوں کی گہرائیوں میں اُترتا محسوس کر رہی تھی۔ یہ ملک مصطفیٰ علی یہاں کیسے آ گئے۔ میرے مالک معاف فرما دے مجھے۔ وہ میرے لیے ایک نامحرم ہے۔ میری سوچیں باغی ہو کر کس دھارے پر چل رہی ہیں۔ میں ایسے کمزور لمحوں کو کبھی خود پر حاوی نہیں ہونے دوں گی۔ جو میرے دل کے ایوانوں میں ننگے پاؤں سرکشی میں بھاگیں۔ وہ اس تصوراتی رتھ پر پوری جان سے ہول اٹھی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھے ملک مصطفیٰ علی کا ٹکٹکی باندھے اسے یوں تکتے رہنا۔ اُن کے لمس بھری چادر اس کے گرد اپنا حصار تنگ کر رہی تھی۔ وہ سٹ پٹائی، میرے مالک مجھے معاف فرما دے۔ اتنا بڑا گناہ کیسے مجھ سے سرزد ہو گیا۔ کسی غیر کا خیال میرے اندر کیوں اترا۔ وہ کیوں اس طریق مصلوب ہوئی جا رہی تھی۔
'اُمِ فروا تم بلال حمید کی منکوحہ ہو۔ تمہیں کسی اور کے بارے میں سوچنا زیب نہیں دیتا۔' وہ گھٹنوں پر سر رکھے بے دم ہو رہی تھی۔ دودھیا پیشانی پسینے کے قطروں سے بھر گئی تھی۔ وہ اپنے بستر سے اٹھی اور برآمدے میں نکل آئی۔ ہر سمت سیاہی بھری رات، ہو کا عالم تھا۔ سوئی ہوئی رات آکاش پر ننھے ننھے ستاروں کو لیے محوِ سفر تھی۔ آخری راتوں کا کمان جیسا چاند اپنے سفر کے اختتام پر نپے تلے انداز میں انہماک سے گم ہو چکا تھا۔ ہلکی سی نمی نے اس کے دہکتے سراپے کو قدرے اطمینان سونپ دیا تھا۔
''اے میرے پیدا کرنے والے رب! اس کم ظرف بندی پر رحم فرما۔ ملک مصطفیٰ علی کا خیال کیوں مجھے بے چینی بخش رہا ہے۔ میرے مالک میں نہیں جانتی یہ سب کیا ہے۔ میں نے کبھی ایسا خیال دل میں نہیں پالا۔ پھر یہ کیسی کسک ہے جو میرے اندر طلاطم برپا کر رہی ہے۔ میری مرضی کے خلاف، ربِ کل تُو گواہ ہے، میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا نہ سوچا۔ پھر میری بند آنکھوں کے سامنے وہ دو آنکھیں کیوں تن جاتی ہیں۔ اللہ پاک تُو بخوبی جانتا ہے، اس میں میری خطا نہیں ہے۔' وہ رات کی رانی کے پاس کھڑی سوچ رہی تھی۔ جس کی بے پناہ بھینی خوشبو ساکن رات کے سینے میں گم ہوئی جا رہی تھی۔ رات کی رانی کی تمام کلیاں کھل چکی تھیں اور وہ رات کی تاریکی میں اپنی خوشبو بانٹ رہی تھیں اور اُمِ فروا شرمندگی سے نگاہیں جھکائے اپنے رب سے باتیں کر رہی تھی۔ قریبی مسجد سے اذانِ تہجد کی صدا ابھری۔ ''اے راتوں کے پچھلے پہر اُٹھ کر خدا کو یاد کرنے والوں! اُس کے سامنے سجدہ کرنے والوں اس کے ہاں تمہارے لیے بڑا اجر و ثواب ہے۔''
اُمِ فروا نے وضو کیا اور برآمدے میں بچھے تخت پر تہجد کے نوافل ادا کرنے لگی۔ نوافل پڑھنے کے دوران اس

کی آنکھیں سمندر بنی ہوئی تھیں۔ ندامت کے آنسو آنکھوں سے نکل کر چہرے کا سفر طے کرتے اس کے دوپٹے میں روپوش ہو رہے تھے۔ دل میں یہی ہُوک اسے ڈس رہی تھی۔

''مالک! تُو جانتا ہے میں نے ایسا جان بوجھ کر کبھی نہیں سوچا، تُو دلوں کے حال خوب جانتا ہے۔ اگر میری نیت میں ذرا بھی کھوٹ ہے تو میرے پیدا کرنے والے مجھے کڑی سے کڑی سزا دے۔ اگر تُو سمجھتا ہے کہ میں ایسی سزا کی مستحق ہوں، تو ضرور مجھے عبرتناک سزا دے۔ میرے ذہن کے ہر ہر حصے سے اس غیر محرم کا خیال مٹا دے۔ وہ میرا محسن ہے، جس نے میری مدد کی ہے۔ مجھے اتنی بڑی مصیبت سے بچایا۔'' وہ سجدے میں گری۔ رب سے معافی کی درخواست گار تھی۔ مولوی ابراہیم تہجد اپنے کمرے میں پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ فجر کی اذان کا وقت ہونے والا تھا۔ مولوی ابراہیم اپنے بستر سے اٹھے تاکہ مسجد میں جا کر فجر کی اذان دے سکیں۔ وہ جوں ہی باہر برآمدے میں آئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اُمِ فروا کو دیکھا۔ وہ دبے قدموں اُس کے قریب آ گئے۔

آہٹ محسوس کرتے ہوئے اُمِ فروا نے بند آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر مولوی ابراہیم بخش کی طرف دیکھا۔ دعا ختم کرتے ہوئے وہ اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔

''السلام علیکم ابا جی۔''

''وعلیکم السلام جیتی رہو۔ پتر پڑھ لی تہجد۔''

''جی۔'' برآمدے میں قدرے اندھیرا تھا اس لیے وہ اُمِ فروا کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ریلہ نہ دیکھ سکے تھے۔ اس نے ہاتھ کی مدد سے دوپٹا رخسار پر رکھ لیا۔

''اُمِ فروا میں مسجد جا رہا ہوں تم دروازے کی کنڈی لگا لو۔''

''جی اچھا۔'' وہ پیروں میں سلیپر ڈالتی اُن کے پیچھے دروازے تک چلی آئی۔ کنڈی لگا کر وہ دوبارہ تخت پر آ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔ وہ دو آنکھیں جن میں بے تحاشا وارفتگیاں قائم تھیں اب اسے پریشان نہیں کر رہی تھیں۔ جاء نماز کے قریب پڑی تسبیح اٹھائے وہ درودِ ابراہیمی پڑھنے لگی۔ وہ اب لگن اور آنکھیں بند کیے خدا کی ذات میں گم ہو کر پڑھ رہی تھی۔ طبیعت پر چھائی بے قراری چھٹ چکی تھی۔ اچانک مسجد سے اذان کی آواز آئی، اس کے ہلتے ہونٹ جامد ہو گئے۔ دل کی دھڑکنیں تھم گئیں، کس قدر مٹھاس اور تاثیر رب کے ذکر میں ہے۔ ابا جی کی آواز میں اذان اس نے بہت دنوں بعد سنی تھی۔ وہ گھٹنوں پر پیشانی ٹکائے اذان سنتی رہی اور دل میں اذان کا جواب دیتی رہی۔ اذان ختم ہو گئی تھی۔ وہ پھر سے تسبیح پڑھنے لگی۔ بے بے جی بھی اُٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے اسماعیل کو بھی اٹھا دیا تھا کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھو جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔

''السلام علیکم بے بے جی۔'' وہ باہر آئیں تو اُمِ فروا نے انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام پُتر خوش رہو۔'' بے بے جی نے محبت سے اُمِ فروا کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور وضو کرنے کی غرض سے باتھ روم کی طرف بڑھ گئیں، جو صحن میں سیڑھیوں کے نیچے بنا ہوا تھا۔ اسماعیل مسجد جا چکا تھا۔ اُمِ فروا فجر کی نماز پڑھنے لگی۔ وہ نماز پڑھ کر اندر آئی تو اُس نے اُمِ زارا کو نماز کے لیے اٹھایا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں چلی گئی تھی۔ تمام رات وہ سو نہ سکی تھی، اب گہری نیند سو رہی تھی۔

☆......☆......☆

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ اس کی آنکھ کھلی تو کچن سے پراٹھوں کی بہت زبردست قسم کی

خوشبو آ رہی تھی۔ اُمِ فروا جب سے یہاں سے گئی تھی اس نے ایک دن بھی ورقی پراٹھا نہ کھایا تھا۔ مندی مندی آنکھوں کے درمیان اس کا دھیان کچن سے آتی خوشبو کی طرف لگا ہوا تھا۔ ایسی اشتہا انگیز خوشبو سے اچانک اس کی بھوک چمک اٹھی۔ وہ بستر سے اٹھی، سامنے لگے آئینے میں اپنے بال درست کیے، سر پر دوپٹا جمایا اور کمرے سے نکل آئی۔ کافی دنوں بعد اس نے اپنے آنگن میں اترتی چمکیلی دھوپ دیکھی تھی۔ وہ برآمدے میں چلی آئی۔ بے بے جی تخت پر بیٹھی نمازِ چاشت پڑھ رہی تھیں۔ امر بیل اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ رات کی رانی اور موتیے کے پودے بھی فریش لگ رہے تھے اور ہوا کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ سے ایک دوجے کے گلے مل رہے تھے۔ وہ باتھ روم سے ہو کر کچن میں آ گئی جہاں اُمِ زارا گرم گرم پراٹھے بنا رہی تھی۔ پوری کی طرح پتلے اور چھوٹے چھوٹے۔ اسماعیل کالج چلا گیا تھا۔ مولوی ابراہیم مسجد سے آنے ہی والے تھے۔

''اُمِ زارا ابا جی کے کمرے میں ناشتا کریں گے۔ تم ناشتہ لے آؤ میں دستر خوان بچھاتی ہوں۔'' اُمِ فروا کچن سے نکل کر کمرے میں آ گئی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی کمرہ صاف ستھرا پڑا تھا۔ اُمِ فروا نے نیچے بچھی دری پر دستر خوان بچھایا اور کچن سے ناشتے کا سامان ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ مولوی ابراہیم بخش بھی مسجد سے آ چکے تھے۔

''آ جائیں ابا جی ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''اچھا بچے آ رہا ہوں۔'' مولوی صاحب اس وقت برآمدے میں بے بے جی کے پاس کھڑے کوئی بات کر رہے تھے۔

''آ جاؤ اُمِ فروا کی ماں۔''

''مولوی صاحب آپ چلیں میں آتی ہوں۔'' بے بے جی نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح ایک طرف رکھی اور اندر آ گئیں۔

''اُمِ فروا کے آنے سے ہمارے گھر میں رونق آ گئی ہے۔'' سبھی اُمِ فروا کے آنے سے خوش تھے پراٹھوں کے ساتھ دہی اور رات کے بچے ہوئے کباب تھے۔ مولوی صاحب نے با آواز بلند بسم اللہ پورا پڑھا تب سبھی نے دل میں دہرایا اور ناشتہ شروع کر دیا۔ خاموشی کے ساتھ ناشتہ کیا گیا۔ اُمِ زارا برتن سمیٹ کر کچن میں لے گئی۔

''اُمِ زارا جتنے دن میں اِدھر ہوں کچن میں سنبھالوں گی۔ تم کچھ دن ریسٹ کرو۔'' اُمِ فروا سنک میں برتن اکٹھے کرتے ہوئے بولی۔

''باجی آپ ہماری مہمان ہیں۔ اب آپ سے میں کام تھوڑی کراؤں گی۔''

''ارے پگلی تم نے مجھے اتنی جلدی پرایا کر دیا۔ میں اس گھر کی بیٹی بھی تو ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب آپ اپنے گھر والی ہو گئی ہیں۔''

''ہاں اپنے گھر والی۔'' اُمِ فروا نے گہرا سانس لیا۔ اُمِ زارا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ جانے کیوں اُمِ زارا بے چین ہو گئی تھی۔ اس کی بہن اپنے گھر میں خوش ہے بھی کہ نہیں۔ بلال بھائی ہیں تو بہت اچھے۔ ان کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ ایسے ہی میں وسوسوں میں پڑ رہی ہوں' اُمِ زارا نے فوراً اپنا ذہن جھٹکا۔ اُمِ فروا کچن سے فارغ ہو کر برآمدے میں بے بے جی کے پاس آ کر بیٹھ گئی، جو اس وقت ہاتھ میں کروشیا پکڑے اُمِ زارا کے جہیز کا میز پوش بنا رہی تھیں۔ بے بے جی اسے عزیز و اقارب کا احوال بتاتی رہیں۔

''بے بے جی محلے والے سب خیریت سے ہیں۔''

''تمہاری سہیلی رضوانہ تھی نا؟''

”جی۔“

”اُس کی شادی ہوگئی ہے۔ پچھلے اتوار کو سامنے والی سلمٰی کے سسر کا انتقال ہوگیا ہے۔“

”اوہو! بہت افسوس ہوا۔“ اُس نے دل میں انا للہ وانا الیہ پڑھا۔

”سبز چوبارے والی پروین یہاں سے شفٹ ہوگئی ہے۔ باقی سب اپنے اپنے گھروں میں خوش باش ہیں۔“

”اُمِ زارا بتار ہی تھی اسماعیل کی خطاطی کے فن پارے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہورہے ہیں۔“

”ہاں پُتر اللہ کا بڑا کرم ہے۔ فارغ اوقات میں صوفوں والے کمرے میں باوضو بیٹھ کر کام میں لگا رہتا ہے۔ جب مکمل کرلیتا ہے تو مجھے دکھاتا ہے۔ اس کام میں جتنے بھی خط ہیں سب پر عبور حاصل کرلیا ہے اس نے۔ بہت شوق اور اس فن کی محبت ہے اُس کے دل میں۔ کہہ رہا ہے آئندہ ایم بی اے میں ایڈمیشن بھی لوں گا، ساتھ ساتھ نوکری بھی کروں گا اور یہ کام بھی جاری رکھوں گا۔ مسجد میں بھی کچھ ٹائم گزارتا ہے کیونکہ یہ تمہارے ابا کی خواہش ہے۔“

”بہت اچھی بات ہے بے بے جی! بس خدا ہمیشہ ہم پر رحم کرے۔“ اُداسی کی جانب بڑھتے ہوئے اچانک اُمِ فروا نے خود کو بچایا۔ اس کے چہرے پر کوئی اور رنگ ابھرتا وہ جلدی سے بولی۔

”بے بے جی میں بہت خوش ہوں ہم نے گھر بھی بدل لیا ہے۔ پہلے فلیٹ بہت چھوٹا تھا اور گنجان علاقے میں تھا۔ ہر وقت ٹریفک کا بے ہنگم شور، اب ہمارے پاس بہت خوبصورت اور تھوڑا بڑا گھر ہے۔ صاف ستھرا پُر فضا علاقہ ہے۔ آس پاس کھیت کھلیان ہیں۔ لان پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔“ اُس کی آنکھوں میں اچانک ایک شبیہ اتری۔ سرسبز گھاس اور رنگ برنگے پھولوں کے درمیان کلف شدہ سفید لباس میں ملبوس، بڑے سے سر پر گھنے سیاہ بالوں کے درمیان شہد آگیں آنکھوں والے ملک مصطفٰی علی، جن کی چمک دار زندگی سے بھرپور آنکھیں اس کے تصبیح چہرے پر گڑی جارہی تھیں۔ وہ اچانک پریشان ہوگئی۔ ٹھنڈی ہتھیلیاں اُس نے دہکتے عارضوں پر ٹیک دیں۔ ایک ہلکی سی کپکپاہٹ کے بعد اس کے ماتھے پر نمی پھیل گئی۔

’میرے خدا مجھے سیدھی راہ دکھا۔ باری تعالیٰ میری سوچ بھٹکنے سے بچالے، دو بڑی بڑی براؤنش آنکھیں اب بھی اُسے بے چین کررہی تھیں۔‘

”اُمِ فروا تم نئے گھر کی بات کررہی تھیں۔“ بے بے جی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

”جی ہاں بے بے جی، شیشے کی دیوار گیر کھڑکیاں ہیں۔ پورے گھر میں ٹائلز ہیں۔ دور سے کھیت اور باغات دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی نوکری بھی بہت اچھی ہے۔ وہ ایک فوڈ فیکٹری ہے، جہاں ملک پیک، فروٹ جوس، دہی اور مسالا جات وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ انہیں سپروائزر کی پوسٹ پر تعینات کیا گیا ہے۔ دراصل جو مالک ہیں وہ اُن کے جاننے والے ہیں، اسی لیے انہیں سہولت سے نوکری مل گئی ہے۔ بے بے جی آپ بھی دعا کیا کریں کہ اللہ پاک ہم پر رحم کرے اور اپنے حفظ وامان میں رکھے۔“

”آمین۔“ بے بے جی نے دل سے کہا۔

”پُتر رب سوہنے نے خدائے مجازی کا بہت بڑا درجہ رکھا ہے۔ میرے بچے اپنے فرائض سے کبھی غفلت نہ برتنا۔ اُس کی ہر جائز بات کھلے دل سے ماننا۔ اُسے تم سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔ رب کا جس قدر شکر ادا کرو کم ہے۔ اُس نے تمہیں اس قدر اچھا شریکِ حیات عطا کیا۔“

”جی بے بے جی۔“ اس کے گلے میں جیسے پیا شیشہ کسی نے انڈیل دیا تھا۔

''شادی شدہ زندگی میں نظم وضبط کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ اُمِ فروا تم خود بہت سمجھدار ہو لیکن ایک ماں ہونے کی حیثیت سے میں اپنی تسلی کے لیے تمہیں ضرور سمجھاؤں گی۔ چھوٹی بات کو کبھی بڑا نہ بننے دینا۔ اب تمہاری زندگی نہایت احتیاط، تحمل، حوصلے کی متقاضی حیثیت سے تمہارے روبرو ہے۔ پتر تمہیں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنی ہوگی۔ بلال بہت اچھا ہے۔ ہمیں خود کو بھی صحیح رکھنا چاہیے۔ ہر طبقے کا مرد اپنے مقابل بیوی کو کم تر، حقیر، بے بس مخلوق گردانتا ہے۔ میرا بچہ تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ کبھی وہ یہ نہ کہہ سکے کہ مولوی ابراہیم بخش کی بیٹی ہو کر مجھے مایوس کیا۔'' وہ نگاہیں جھکائے خاموشی سے بے بے جی کی باتیں سنتی رہی۔ اب بھلا بے بے جی کو کیا معلوم تھا بلال حمید نے مولوی ابراہیم بخش کی بیٹی کی روح کو زخمی کر دینے والی اذیت ناکی سونپی ہے اور وہ کہہ رہی تھیں کہ اُمِ فروا اپنی چاہ کی خوشبو اُسے اوڑھا دے۔ اُمِ فروا تو بہت سہانے خواب لے کر اُس شخص کی زندگی میں اُتری تھی۔ ٹھنڈی طمانیت بخش بادِ صبا کی مانند۔ اُس کی زیست کے در و بام مہکانے آئی تھی۔ اور اُس نے میرا تماشا بنا دیا۔

اُمِ زارا ابھی تک کچن میں تھی۔ وہ بے بے جی کے پاس سے اٹھی، وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ لیں۔ وہ صحن میں آگئی۔ پائپ کو سیدھا کرتے ہوئے اس نے نلکا کھولا اور پودوں کو پانی دینے لگی۔ اُمِ فروا نے مسکرا کر امر بیل کی جانب دیکھا۔ وہ سرگوشی میں اس سے کہہ رہی تھی امر تُو اداس نہ رہا کر، ورنہ جب میں یہاں سے چلی جاؤں گی تو مجھے تمہاری بے تحاشا فکر ستائے گی۔ تمہارا تو نام ہی امر ہے پھر تم کیوں مضمحل دکھائی دیتی ہو۔ پہلے تو تم بہت ہشاش بشاش رہتی تھیں۔ سوہنی تم مجھے پہلے کی طرح مسکرا کر دیکھو، میں آئی ہوں نا تمہارے پاس۔'' وہ مسلسل اس سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس نے صحن دھویا، سکھ چین کے درخت کے نیچے گھڑونچی پر پڑے گھڑے پائپ سے بھرے، پائپ لپیٹ کر رکھا، اور صحن میں وائپر لگایا۔

''رہنے دیں باجی میں کرلوں گی۔'' اُمِ زارا نے کچن سے آواز لگائی۔ اُمِ فروا مسکرائی ''اچھا بھئی نہیں کرتی۔'' وہ اپنے پاؤں دھوتی برآمدے میں آگئی۔ جانے کب سے اس کا موبائل بج رہا تھا۔ وہ جلدی سے اندر آئی۔ بلال حمید کا فون تھا۔ پہلے سوچا بجتا رہے، اچانک اس کے کانوں میں بے بے جی کی آواز گونجی۔ ''بچے مجازی خدا کا احترام ہمیشہ مقدم رکھنا۔'' اس نے موبائل کان سے لگایا۔

''کیسی ہو اُمِ فروا'' بلال حمید کے لہجے کی پور پور میں اداسی کروٹیں لے رہی تھی۔

''اچھی ہوں۔'' جانے جواباً اس نے کیوں نا پوچھا آپ کیسے ہیں۔''

''خوش ہونا۔'' وہ جواباً خود ہی بولا۔ ''ظاہر ہے والدین کے پاس آ کر تو خوش ہی ہوں گی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں ہمیشہ خوش رہو۔ ٹھیک ہے۔'' اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ آپ مجھے خوش رہنے کا بندوبست تو کر ہی چکے تھے غیب سے خدا نے میری مدد کر دی ورنہ آپ سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔''

اس کی طرف سے گہری خاموشی پا کر دوبارہ بولا۔'' اُمِ فروا کیا سوچ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔''

تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔''

''آپ اب میرے بغیر رہنے کی عادت ڈال لیں۔'' اس نے سفاکی سے جواب دیا۔ اچانک بلال حمید کے اندر کچھ چٹخا۔

''ہاں اچھی لڑکی! مجھے اب تمہارے بنا رہنے کی عادت ڈالنا ہی ہوگی۔'' دل کے اندر مستقل پچھتاووں کے

موسم آن بسے تھے۔ ''تم نے ابھی زندگی میں بے شمار بہاریں دیکھنی ہیں۔ میں تمہارے لیے دعا گو رہوں گا۔'' وہ افسردگی سے بولا لیکن اس کی شکست خوردگی میں ڈوبی نحیف و ترار آواز اُمِ فروا نے صاف محسوس کی تھی۔ بلال حمید اُمِ فروا کے اندر کی وحشت کو کم کرنا چاہتا تھا۔ جب ہی وہ رعونت سے گویا تھا۔ ''چند روز تک میں تمہیں لینے آؤں گا۔''

''میں ابھی یہاں رہنا چاہتی ہوں۔'' اس میں اچانک اس قدر اعتماد کہاں سے آ گیا تھا۔

''اُمِ فروا تمہیں مجھ سے ہرگز خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ میں نے خود کو تمہارا اہل کبھی بھی نہیں سمجھا۔ جب تمہارے گھر والے تمہارے طویل قیام کی وجہ پوچھیں گے تو انہیں کیا جواب دو گی؟ بصورت دیگر اگر انہیں کچھ شک ہو گیا تو وہ دکھی ہو جائیں گے۔'' وہ ایک بارگی مبہوت سی بلال حمید کی آواز سنتی رہی۔

''کبھی نہ کبھی انہیں پتا تو چلے گا۔'' اُمِ فروا نے خود کو سنبھالا۔ وہ بے حد آہستگی سے بول رہی تھی۔

''مناسب وقت پر میں انہیں خود بتاؤں گا، تب بحفاظت تمہیں ان کے سپرد کر دوں گا۔'' بلال حمید نے سرد آہ بھری۔ ''دو ماہ سے تم محفوظ ہو نا تو آئندہ بھی انشاء اللہ محفوظ رہو گی۔ ایک مرتبہ آزما کر تو دیکھ لو۔''

''پہلے بھی تو بھروسہ کیا تھا۔ نہایت ایمانداری اور سچائی سے آپ کی زندگی میں قدم رکھے تھے۔''

''اُمِ فروا بار بار وہ ذکر کر کے مجھے شرمندہ مت کرو۔ آج میری ڈیوٹی کا پہلا دن ہے، جو میں تم سے شیئر کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' عجیب سا جواب تھا اس کا۔

''میرے لیے دعا نہیں کرو گی؟'' ''ضرور کروں گی۔''

اسے اُمِ زارا کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

''کس کا فون تھا باجی؟'' اُمِ زارا اندر آ گئی۔

''ان کا'' اس نے شرمانے کی ادا دکھائی۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' اُمِ فروا پھر شرمائی۔ ''یقیناً آپ کے لیے اداس ہوں گے۔ آپ کو اپنی بے تابیاں سنا رہے ہوں گے۔'' اُمِ زارا شرارت سے مسکرائی۔

''اُمِ زارا تم بہت ہی......'' باقی بات اس نے ہونٹوں میں دبائی۔

''سچ ہے نا میں کوئی غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں۔'' وہ بڑی بہن کو تنگ کرنے پر بضد تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ دوپہر کو ہمیں کیا کھلا رہی ہو۔'' اُمِ فروا نے اس کا دھیان ہٹایا۔

''جو آپ کہیں۔''

کڑھی کافی دنوں سے نہیں کھائی ساتھ میں چاول۔''

''بجا فرما رہی ہیں آپ۔ ایسا ہی ہوگا۔'' اُمِ فروا مسکرائی۔ بلال حمید سے تھوڑی سے دیر پہلے ہوئی باتیں وہ بھول جانا چاہتی تھی۔ اس وقت اُمِ زارا معصومیت سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر کچھ غیر معمولی تحریر ضرور رقم تھی۔

☆......☆......☆

اُمِ فروا یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ اب بھی اُن شہد آگیں آنکھوں نے اس کا تعاقب نہ چھوڑا تھا۔ وہ گھبرا اٹھی اور خدا سے دعا کرتی ''اللہ پاک تُو مجھے سیدھی راہ دکھا۔ میرے دل سے اس کا خیال نکال دے۔ کسی غیر مرد

کے بارے میں سوچنا گناہ کبیرہ ہے۔ مجھے اس خیال سے نجات عطا کر دے پروردگار۔''
زندگی کے اس سنگ میل پر وہ کس قدر بے بسی میں گھری ہوئی تھی، اس کے اندر کسی کے ہونے کی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ دل کے ہر در پر وہ شبیہہ براجمان ہونے کی سعی میں اس کی مرضی کے خلاف جا رہی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی کا ہیولہ بے ثبات نمی سے اس کا چہرہ بھگو رہا تھا۔ جیسے ان چاہی ساعتوں میں اسیر اس کا طواف کر رہا ہو۔ مارے بے بسی کے وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیتی۔
''پتر کیا بات ہے؟'' بے بے جی نے فکرمندی سے اُمِ فروا کو دیکھا جو ان کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اچانک آنکھوں کے سامنے دو آنکھیں اتر آئیں، گھنی مونچھوں کے نیچے بھرے بھرے یاقوتی گلابی ہونٹ مسکاتے۔
''اُمِ فروا کیا بات ہے؟'' بے بے جی نے پھر پوچھا۔
''جی بے بے جی۔'' اس سے کوئی جواب نہ بن پڑ رہا تھا۔ ''تھوڑا سر بوجھل ہے۔''
''اُمِ زارا! بہن کو چائے کے ساتھ ایک ڈسپرین دے دو۔''
''بے بے جی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی آرام آ جائے گا۔ تھوڑی دیر لیٹوں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔''
وہ برآمدے سے اٹھی اور کمرے میں پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔ کروٹ بدلتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا جیسے اس کی پلکیں بہت وزنی ہو گئی ہوں۔ اداسی کی گداز چادر پھر اس کے گرد اپنا جال بننے لگی۔
اسے بلال حمید کا خیال آیا جو دن میں ایک مرتبہ ضرور فون کرتا تھا۔ وہ اس سے جو بھی بات کرتا اُمِ فروا ہوں ہاں میں جواب دے دیتی۔ یہ خیال اس کے سینے میں خنجر کی طرح پیوست ہوتا جب اس کے گھر والوں کو بلال حمید کے گھناؤنے دھوکے کے بارے میں علم ہوگا تو ان پر کیا گزرے گی۔

☆......☆......☆

ساون کے آخری عشرے کی اس اداسی بھری شام بھگا آ کاش اگرچہ اودے، نیلگوں بادلوں کے پیرہن میں دبکا ہوا تھا۔ اس گہری ہوتی تاریکی میں وہ برآمدے میں بیٹھی بہت ہی مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ اُمِ زارا کچن میں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ جب کہ بے بے جی لیٹی ہوئی تھیں۔ اچانک گھٹائیں اٹھیں اور بادل برسنے لگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس وقت اسماعیل گول کمرے میں بیٹھا خط کوفی میں کچھ ترتیب دے رہا تھا۔ مولوی ابراہیم مسجد میں تھے۔ اچانک دو براؤنش آنکھیں اس کی آنکھوں میں آ بسیں۔ اس کی سوچیں اس کی مرضی کے تابع نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ وہ عالم بے خودی میں باغی ہوتی جا رہی تھیں۔ آخر اس کی دعائیں کیوں قبولیت نہیں پا رہی تھیں۔ وہ آنکھیں بدستور اس کے حواس پر قابض تھیں۔ وہ اپنے سامنے بارش کی سفید چادر گھورتی رہی۔ رم جھم بھرا باہر کا موسم بہت حسین ہو رہا تھا لیکن اُمِ فروا کے اندر ایک دھونکنی دہک رہی تھی۔ یہ کیسی بے قراری ہے جو کونے میں منہ چھپا کے مجھ پر وار کیے جا رہی ہے۔
اب بھی بارش میں کھڑے ملک مصطفیٰ علی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اُمِ فروا نے سختی سے آنکھوں پر سیدھا ہاتھ رکھ لیا۔ اب وہ اس کی نگاہوں کے سامنے ایستادہ اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ مالک مجھے اس شخص کے خیال سے رہائی دے دے۔ آخر کیوں یہ میرے حواس مغلوب کر رہا ہے۔
بارش نے کس قدر اُمِ فروا کو اداس اور کمزور کر دیا تھا۔ قریب پڑا موبائل اچانک بجا۔ بلال حمید کا فون تھا۔ ''ہیلو۔''
''کیسی ہو اُمِ فروا۔''

''اچھی ہوں۔'' اس وقت بلال حمید کا فون اسے ناگوار محسوس ہوا تھا۔
''کیا کر رہی تھیں؟''
''بیٹھی ہوئی ہوں۔'' اس نے مختصراً سا جواب دیا۔
''اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ اس موسم میں دل چاہا تم سے بات کرنے کو۔''
''ہم دونوں کے درمیان کہنے کو کچھ ہے ہی نہیں تو پھر یہ سب عجیب ہی لگتا ہے۔'' بے تاثر لہجہ تھا اس کا۔
''کیا بات کرنے کے لیے کسی ایشو کا ہونا ضروری ہے؟''
''ہاں۔ دل میں کہنے سننے کی خواہش کروٹیں ہی نہیں لیتی۔'' وہ بے دم ہوتے ہوتے دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔
''اُمِ فروا ایشو تو ہمارے درمیان بہت بڑا کری ایٹ ہو چکا ہے۔ تم ہی اتنے اچھے بڑے دل کی مالک ہو۔ جو اسے کریدنا نہیں چاہتیں۔''
''میں جانتی ہوں اذیت ناکی کے سوا کچھ نہیں پا سکوں گی، پھر اس سے کنی کترانا ہی بہتر ہے۔'' گہرے تاسف میں اس کا دل جکڑ گیا تھا۔ اچانک اس کی سانسیں تیز ہو گئیں جنہیں وہ بمشکل اعتدال پر لائی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ کا تیز شور اس کے کانوں میں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ شدید اذیت ناکی کے بھنور میں وہ جکڑی جا رہی تھی۔ بادل دھرتی کے سینے پر تھم تھم کر مچل مچل کر برس رہے تھے۔ اُمِ فروا کے لب کپکپائے۔ آنکھیں پرانے زخم یاد آنے پر سلگ اٹھیں۔
''اُمِ فروا میں کل تمہیں لینے آ رہا ہوں۔''
''ابھی میں چند دن اور یہاں رہنا چاہتی ہوں۔''
''ہفتہ تو رہ لیا ہے تم نے۔''
''تو کیا ہوا۔'' بے ثباتی سے جواب دیا گیا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہے تمہارا اور میرا رشتہ ہی کیا ہے۔ اس رشتے کا مان کرتے ہوئے جو فریب کی بنیاد پر استوار ہوا۔ یہ سب تو اُمِ فروا سوچ رہی تھی ناں۔ رشتہ تو ان دونوں میں ابھی بھی تھا۔ اُمِ فروا بلال حمید کے نکاح میں تھی۔ اس تعلق سے تو کوئی بھی انکاری نہیں ہو سکتا تھا۔
''خاموش کیوں ہو اُمِ فروا! اگر تم زیادہ دن رہیں تو تمہارے گھر والے فکرمند نہ ہوں۔ آخر والدین کو فکر تو ہوتی ہے ناں بیٹی کے زیادہ دن میکے میں رہنے سے۔ انہیں تشویش ہوگی۔'' اُمِ فروا کی زندگی عجیب دھوپ چھاؤں بنی ہوئی تھی۔ بے بسی کے بند کمروں میں وہ قید ہو کر رہ گئی تھی۔ کیا اچھے موسم کبھی میرے در پر دستک دیں گے۔
''سنیں ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے کہا تھا۔ آپ مجھ پر اپنا حق نہیں سمجھتے۔''
''ہاں مجھے یاد ہے اچھی طرح اور میں اپنی بات سے پھرنے والا نہیں ہوں۔ تمہاری خوشی مجھے ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ یہ سب تمہارے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔'' بلال حمید کی آواز میں شکست خوردگی پنہاں تھی۔ کرب ناک لمحوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔
''میں مولوی صاحب کو فون کر کے بتا دوں گا کہ میں کل اُمِ فروا کو لینے آ رہا ہوں۔ اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا اور خوش رہنا۔'' بولتے ہوئے وہ روہانسا ہو گیا تھا۔
بارش کی شدت میں کمی آ چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی صحن میں آ گئی۔
''باجی باہر نہ جائیں بھیگ جائیں گی۔'' اُمِ زارا نے کچن سے آواز دی۔

''اُمِ زارا بھیگنے کو دل چاہ رہا ہے۔ اندر حبس بہت ہے۔'' حبس تو اس کے دل میں بھی تھا، باہر کا موسم تو خوشگوار تھا۔ ہر چیز دھل کر نکھر آئی تھی۔ وہ پودوں کے قریب آ گئی۔ پودے خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ابر باراں نے ان میں مست خوشی کی لہر پھونک دی تھی۔ اُس نے پیار سے گیلے پتوں پر انگلیاں سرسرائیں۔ اس کی انگلیوں کی گلابی پوروں پر انہوں نے نمی چھوڑ دی۔ امربیل بھی آج بہت خوش تھی۔ اُمِ فروا کے آٹھ روزہ قیام سے وہ جو دکھ سے بھرتے ہوئے اپنا بوجھ نہ اٹھائے جھک گئی تھی۔ یہ موسم سکھ چین کے گھنے درخت پر بھی اترا تھا۔ اب بارش ختم ہو چکی تھی۔ پرندے سکھ چین کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر چہک رہے تھے۔ اجلے موسم نے انہیں بھی خوش کر دیا تھا۔ مغرب کی اذان کی آواز سن کر وہ برآمدے میں چلی آئی۔ کچن میں جھانک کر دیکھا تو اُمِ زارا چائنیز پلاؤ بنا رہی تھی، ساتھ ہی دوسرے چولہے پر گڑ والا حلوہ تیار ہو رہا تھا۔

''اُمِ زارا بڑی خوشبو آ رہی ہے'' اسے سوجی بھونتے دیکھ کر اُمِ فروا گویا ہوئی۔

''آپی آپ کو گڑ کا حلوہ پسند ہے ناں۔ موسم بھی اچھا ہے، سوچا بنا لوں۔'' بے بے جی کمرے سے باہر آ رہی تھیں۔ تب وہ نماز پڑھنے اندر چلی گئی تاکہ بے بے جی تخت پر نماز پڑھ لیں۔ اسماعیل بھی گول کمرے سے نکل کر نماز پڑھنے جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

بلال حمید نے رات کو مولوی صاحب کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں کل اُمِ فروا کو لینے آ جاؤں اگر آپ کی اجازت ہو تو؟''

''ضرور بیٹا وہ تمہاری بیوی ہے، جب چاہے اسے لے جاؤ۔ اُمِ فروا کے یہاں آنے سے ہمارا گھر پُر رونق ہو گیا تھا۔ اسے لاتے رہا کرو۔''

''ضرور جب آپ حکم کریں گے میں اسے لے آیا کروں گا۔''

شام سے پہلے بلال حمید اسے لینے آ گیا تھا۔ ساتھ مٹھائی کا ڈبہ اور فروٹ تھا۔

''پتر تم بار بار ایسے تکلفات نہ کیا کرو۔''

''بے بے جی تکلف کیسا! میری نوکری لگ چکی ہے۔ (چالیس ہزار تنخواہ ہے۔ گھر بھی مالکوں کا ہے اسی سلسلے میں مٹھائی لایا ہوں۔'' بلال حمید بہت خوش لگ رہا تھا۔ اس نے مٹھائی اُمِ زارا کے ہاتھ میں پکڑائی۔

''بہنا سب کا منہ میٹھا کراؤ۔ تم میرے لیے خصوصی دعا کیا کرو کیوں کہ تم میری بہن ہو اور بہنوں کی دعائیں رب سنتا ہے۔''

''بالکل بلال بھائی! میں آپ کے لیے خاص طور پر دعا کرتی ہوں۔'' اُمِ فروا بجھی بجھی دکھائی دے رہی تھی۔

''بیٹا میری ایک نصیحت ہے۔ ہمیشہ رزق حلال کھانا، بے شک کم ہو۔ اسی میں اللہ برکت ڈال دے گا۔''

مولوی ابراہیم نے بلال حمید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''انشاء اللہ مولوی صاحب، بس آپ اس ناچیز کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔''

''خدا تمہیں سلامت رکھے۔''

''مولوی صاحب آپ کی بیٹی بڑے ستارے والی ہے۔'' بلال نے اُمِ فروا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اسی کی قسمت سے مجھے اتنی اچھی نوکری ملی ہے۔''

''ہر انسان اپنے حصے کا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے۔'' بے بے جی خوش ہو کر بولیں۔
''برخوردار اپنا فلیٹ تم نے کرائے پر چڑھا دیا ہے کیا؟'' وہ اُمِ فروا کے باپ تھے اور یہ بات انہیں بے چین کر رہی تھی کہ وہ اپنے ذاتی گھر سے کیوں دوسری جگہ شفٹ ہوئے ہیں۔ بلال حمید اس اچانک سوال کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔
''دراصل مولوی صاحب وہ چھوٹا فلیٹ تھا اور مارکیٹ کے قریب تھا۔ ہر وقت بے ہنگم شور شرابا بہت ڈسٹرب کرتا تھا۔ اچھے دام مل رہے تھے۔ میں نے فروخت کر دیا۔ اب انشاء اللہ اور پیسہ جمع کر کے اچھا اور بڑا گھر لوں گا۔'' اُمِ فروا خاموشی سے اس کے جھوٹ کے پلندے سنتی رہی۔
''بہنا اچھی سی چائے پلا دو پھر ہم چلیں۔''
''رکیں گے نہیں؟''
''کل کی بارش سے راستے بہت خراب ہیں اور پھر دیر بھی ہو رہی ہے۔''
''ٹھیک ہے بیٹا جیسے تمہاری مرضی۔'' اُمِ زارا پُر تکلف سی چائے لے آئی تھی۔
یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اُمِ فروا بہت اداس تھی۔ اتنے دن تک اپنوں کے ساتھ جو رہی تھی۔ گھر پر تو وہ تمام دن خود سے باتیں کرتے اپنے ساتھ وقت گزارنے کی عادی ہو چکی تھی۔ جوں جوں رخصت جانے کا وقت نزدیک آ رہا تھا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ اسے ہرگز رونا نہیں تھا۔ اُمِ زارا بھی رنجیدہ تھی۔ مولوی ابراہیم اور بے بے جی مضطربانہ نگاہوں سے عبایا پہنے کھڑی اُمِ فروا کو دیکھتے رہے۔
آج بھی ملک مصطفیٰ نے اسے گاڑی دی تھی کہ اس میں اُمِ فروا کو لے آؤ۔ اُمِ فروا ملک صاحب کہہ رہے تھے وہ فیکٹری کی طرف سے گاڑی دلا دیں گے تاکہ تمہیں کہیں آنے جانے میں پرابلم نہ ہو۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میکے کی جدائی بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو لا رہی تھی، جسے وہ انگلیوں کی پوروں میں اتارتی رہی۔
صبح سے اس کا گلا خراب تھا، جسم بھی درد کر رہا تھا۔ سر بھی بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بار بار گلے کی کھچ کھچ صاف کر رہی تھی۔
''کیا ہوا اُمِ فروا۔'' بلال حمید نے پوچھا۔
''گلا خراب ہو رہا ہے۔''
''کوئی ترش چیز کھالی ہوگی۔ اچانک خنکی بھی تو بڑھ گئی ہے کل ہونے والی بارش سے۔''
''جی۔'' اسے یاد آ رہا تھا کہ کل ہلکی بوندا باندی میں وہ صحن میں نکل آئی تھی۔ اس کے کپڑے بھی گیلے ہو گئے تھے۔ اُمِ زارا نے اسے منع بھی کیا تھا کہ باجی بارش میں نہ جاؤ۔'' اب اسے ہلکا سا ٹمپریچر بھی محسوس ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

گھر پہنچے تو مغرب کی نماز پڑھ وہ بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ بلال حمید مسجد سے نماز پڑھ کر آیا تو اسے بستر پر پایا۔
''اُمِ فروا۔'' وہ پریشان ہو کر اس کے قریب چلا آیا ''کیا ہوا ہے؟''
''سر میں درد ہے۔ جسم بھی دکھ رہا ہے۔'' ''پیراسٹامول لے لو، ابھی آرام آ جائے گا۔'' بلال حمید نے ٹیبلیٹ اور پانی کا گلاس اس کے سامنے کیا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں جن سے پانی نکل رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح تیز اور گرم تھی۔ اس نے کمبل اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔ اس وقت بلال حمید اس کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا

کہ میں اس سے پوچھوں کے تمہارا سر دباؤں لیکن وہ کچھ کہے بنا واپس چلا آیا۔ وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اگر اُمِ فروا گرم گرم چائے پیے گی تو اس کی طبیعت کافی بہتر ہو جائے گی۔ یہی سوچ کر وہ کچن میں چلا آیا۔ فریج سے ملک پیک نکالا اور اس کے لیے چائے بنانے لگا۔ دو کپ ٹرے میں رکھتا وہ اس کے بیڈروم میں آ گیا۔

''اُمِ فروا'' بلال حمید نے نہایت آہستگی سے اسے پکارا۔ اس نے کمبل میں ڈھکے چہرے سے کمبل ہٹا کر بلال حمید کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

''یہ چائے پی لو تو جسم کو تھوڑی سی گرمائش مل جائے گی۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تو بلال حمید نے اس کے ہاتھ میں کپ پکڑا دیا۔ ''ٹیبلیٹ کے اثر سے پسینہ آئے گا۔ تو ابھی بخار بھی اتر جائے گا۔'' وہ اس کے لیے خاصا فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور چائے کے سپ لینے لگا۔ اُمِ فروا خاموشی سے چائے پر توجہ دیے ہوئے تھی۔ ان دونوں کی خاموشی کے درمیان ناچتے ساکن لمحے ان کے آپس میں گزیراں ہونے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ اچانک بلال حمید کا موبائل بجا۔ اسکرین پر ملک مصطفیٰ علی کا نام روشن تھا۔

''السلام علیکم ملک صاحب!''

وعلیکم السلام! کہو بلال لے آئے اُمِ فروا کو؟''

''جی لے آیا ہوں۔''

''کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوئی وہاں۔''

''نہیں سب ٹھیک رہا ہے۔''

''کیسی ہے اُمِ فروا؟''

''کچھ ٹھنڈ لگ گئی ہے۔''

''پھر تو ٹمپریچر بھی ہوگا۔'' ان کی گھمبیر آواز میں فکر کا عنصر نمایاں تھا۔

''جی ملک صاحب ٹمپریچر بھی ہے۔ میں نے دوا کھلا دی ہے، ابھی آرام آجائے گا۔

''بلال انہیں ڈاکٹر کو دکھا لو تو جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''ملک صاحب پریشانی کی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' بلال حمید نے کن اکھیوں سے اُمِ فروا کی طرف دیکھا جو خاموشی سے چائے پی رہی تھی۔

''اچھا میں آتا ہوں پھر کہتے ہو تو ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔'' ملک مصطفیٰ نے بلال حمید کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فون بند کر دیا۔

''اُمِ فروا ملک مصطفیٰ علی آرہے ہیں تمہارا پتا کرنے۔ کہہ رہے تھے کہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی بخار اتر جائے گا۔'' اُمِ فروا کو جھنجلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ بھلا ان کی یہاں آنے کی کیا تک بنتی ہے۔ اس نے دل میں سوچا یا وہ ان کا سامنا کرنے سے کترا رہی ہے۔ وہ دو براؤنش آنکھیں کسی پل اسے چین نہ لینے دیتی تھیں۔ اس کا دل چاہا کہ ملک مصطفیٰ علی کو یہاں آنے سے منع کر دے۔ وہ اس کے لیے غیر محرم ہے۔ کیوں بار بار اس کے سامنے آجاتا ہے۔ لیکن وہ کچھ نہ بول سکی۔ وہ غیر شعوری طور پر ان سے اجتناب برتنا چاہ رہی تھی لیکن وہ کسی نہ کسی حیلے سے اس کے سامنے آجاتے تھے۔ اچانک

اس کے گلے میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ یہ کیا؟ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ من ان کی آمد کا منتظر تھا۔ تب اس نے چپکے سے خدا سے دعا کر ڈالی۔ ''مالک مجھے ہر بڑی آزمائش سے محفوظ کردے۔ میں عام سی انسان، آزمائش کے قابل کہاں۔ میں غیر ارادی طور پر گناہ کی جانب راغب ہو رہی ہوں۔ میرے مولا مجھ پر رحم فرما۔ مجھے بچا لے۔ میرے لیے کوئی بہتر سبیل عنایت فرمادے۔''

ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ جھنجلاہٹ بھری محویت میں گم تھی۔ وہ شخص اس کی کھلی آنکھوں میں عذاب بن کر ٹہل رہا تھا۔ خود کو سمجھانے کی اس نے ان تھک کوشش کر ڈالی تھی۔ بارہا خود کو اللہ کے خوف سے ڈرایا تھا کہ اس کے نزدیک اُس کا یہ عمل ناپسندیدہ ہے۔ وہ اس کے لیے نامحرم ہے، سوچ نے دل کو سنبھالنے کی ہر ممکن سعی کر رہی تھی۔ جانے پھر بھی یہ پاگل دل کیوں نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اڑیل سوچیں تھیں کے اندر نہاں خانوں میں جاگزیں ہو چکی تھیں۔ ملک مصطفیٰ علی کی روشن شہد آگیں آنکھیں اس کے اندر بھنور بنا رہی تھیں۔

بیل ہوئی تو بلال حمید دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ تو اب اس کے بیڈ روم میں بھی آئیں گے۔ دوپٹہ اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اُمِ فروا نے سوچا۔ اس نے ٹشو پیپر سے جلی آنکھوں کا پانی صاف کیا اور ہاتھ میں پکڑا کپ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ملک مصطفیٰ ہال میں ہی رُک گئے تھے۔

''ملک صاحب رُک کیوں گئے، اندر آیئے ناں۔'' بلال حمید یہی تو چاہتا تھا کہ ملک مصطفیٰ علی اُمِ فروا کی طرف متوجہ ہوں۔ ممکن ہے وہی اسے اپنانے پر تیار ہو جائیں۔ ایک موہوم امید کی کرن ہر پل اس کے دل میں کروٹیں لیتی رہتی تھی۔ دوسرے لمحے وہ اپنی سوچ کی تردید کر رہا ہوتا۔ وہ اتنے بڑے لینڈ لارڈ ہیں۔ وہ کہاں اسے اپنانے کے لیے تیار ہوں گے؟ ممکن ہے ان کی وجہ سے کوئی اور اچھا لڑکا مل جائے جو اُمِ فروا کی زندگی خوشیوں سے بھر دے۔ اگر ملک مصطفیٰ علی کے دل میں اُمِ فروا کے لیے کوئی گداز کارنر نہیں ہے تو یہ اتنا سب کچھ کیوں کر رہے ہیں اُمِ فروا کے لیے۔ اپنے سوالوں کے وہ خود ہی جواب دے دے کر تھک جاتا لیکن وہ خود کو مطمئن نہ کر پاتا۔ وہ اُمِ فروا کو ابھی طلاق اس لیے نہیں دے رہا تھا کیوں کہ پھر وہ اس کے ساتھ رہ نہیں سکتا تھا۔ اور اس طرح وہ غیر محفوظ ہو جاتی۔ اسے تو ہر صورت میں اس اچھی لڑکی کو محفوظ جگہ پہنچانا تھا۔ بلال حمید ملک مصطفیٰ کے ساتھ اب اس کے بیڈ روم میں آگئے۔

''کیسی طبیعت ہے آپ کی۔'' ان کی نگاہیں بے تابانہ اُمِ فروا کے چہرے کی جانب اٹھیں تو وہ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کئی دنوں بعد اسے اپنے روبرو دیکھ رہے تھے۔

''اچھی ہوں۔'' اس کی آواز سے وہ چونک گئے۔

''اپنا خیال رکھا کریں۔''

''جی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''معمولی فیور ہے۔ دوا کھالی ہے، آرام آجائے گا۔'' اُمِ فروا نے تیزی سے جواب دیا جیسے اسے ڈر ہو ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لیے نہ کہہ دیں۔

''تشریف رکھیے ملک صاحب۔'' بلال حمید کے کہنے پر وہ جھجکتے پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔

''اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ میں اسی لیے آیا ہوں۔'' انہوں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ حالانکہ بات تو کچھ اور تھی۔ وہ تو صرف اس لڑکی کا دیدار کرنے آئے تھے جس کی خوبصورت

آواز نے چند سال پہلے ان کی سماعتوں کو چھوا تھا اور پھر جب بلال حمید کے گھر اسے دیکھا تو وہ پاک لڑکی ان کے نفس کو چھوگئی اور ایسے ان کی روح کی ریش ریش میں تحلیل ہوئی اور دل میں اترتی چلی گئی۔ وہ غافل رہے، انہیں معلوم ہی نہیں ہو پایا کہ وہ انہیں بتائے بغیر ان کے دل کی کائنات کی مالک بن بیٹھی ہے۔ بنا اجازت دل کے نخلستانوں میں ڈیرے ڈال لیے۔

اُمِ فروا کو یوں ملک مصطفیٰ کے سامنے بیٹھنا بہت برا لگا۔ اگر ابا جی، بے بے جی اسے اس طرح دیکھ لیتے تو بہت خفا ہوتے۔

''آپ کے میکے میں سب خیریت تھی۔'' ملک مصطفیٰ علی نے پوچھا۔

''الحمدللہ سب خیریت سے تھے۔''

''پھر تو آپ کا وہاں خوب دل لگا ہوگا؟''

''جی میں وہاں بہت خوش رہی ہوں۔''

''یہاں تو آپ پھر بور ہو رہی ہوں گی۔''

''میں نے یہاں رہنا ہی کتنا ہے؟ میں چاہتی ہوں کہ جلد کسی نتیجے پر میرے حالات پہنچیں تو میں فوراً میکے لوٹ جاؤں۔''

''تو کیا آپ اپنے والدین کو دکھی کر دیں گی۔ جو آپ کی طرف سے مطمئن ہیں کہ ان کی بیٹی اپنے گھر میں سکھی ہے۔'' ملک مصطفیٰ علی اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ اس وقت سفید دوپٹے میں اس کا شہابی گلابی چہرہ دہک رہا تھا۔

''کبھی نہ کبھی انہیں پتا تو چلے گا ہی۔''

''ہاں پتا تو انہیں ضرور چل جائے گا۔ ایک خیال ہے میرا اگر اس پر عمل کیا جائے تو انہیں کبھی معلوم نہیں پڑ سکتا۔'' ملک مصطفیٰ علی جان بوجھ کر ایسی باتیں کر رہے تھے۔ وہ خود بھی جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے تھے۔

''آپ بولیے ملک صاحب۔'' بلال حمید جلدی سے بولا۔

''پلیز اُمِ فروا آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ اگر آپ اب بھی بلال کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو آپ کے پیرنٹس کو پتا نہیں چل سکے گا۔'' اُمِ فروا نے پھیلی آنکھوں کے ساتھ تیزی سے ملک مصطفیٰ کی طرف دیکھا۔ اس کا دل چاہا چیخ چیخ کر دنیا کو بتائے وہ بلال حمید کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس نے اس کے ساتھ جو کیا ہے وہ کبھی نہیں بھول پائے گی۔ اتنی گھناؤنی سازش اس کے لیے گھڑی مگر اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔

''میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' اس کی آواز میں بھرپور اعتماد اُمڈ رہا تھا۔ تب بلال حمید کے اندر بالکل سناٹا چھا گیا۔

''سوچ لیں آپ! ورنہ آپ کے والدین دکھی ہو جائیں گے۔ ابھی آپ کی ایک اور بہن بھی ہے۔ اس کا مستقبل بھی آپ کے سامنے ہونا چاہیے۔'' ملک مصطفیٰ علی اس وقت بہت خوش تھے۔ وہ جان بوجھ کر اس کے اندر کی سوچ باہر لا رہے تھے۔

''اب میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میرا دل و دماغ اس بات کو تسلیم نہیں کر رہا۔'' بلال حمید خاموشی سے دونوں کی باتیں سنتا رہا۔

''آپ چائے پئیں گے ملک صاحب؟'' وہ بہت بے چین تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے نیزے کی انی پر رکھ دیا تھا۔ اُمِ فروا اس سے الگ ہونا چاہ رہی تھی۔ اس کے یہاں سے چلے جانے کی باتیں ہو رہی تھیں، تو وہ کیسے خوش رہ سکتا تھا۔ اس کے لیے تو یہی کافی تھا۔ اُمِ فروا اس کے سامنے تھی۔ دونوں ایک ہی گھر میں رہ رہے تھے۔ وہ روزانہ اسے دیکھتا تھا۔ اسے دیکھ کر بلال حمید کی صبح ہوتی، اسے دیکھ کر بلال حمید کی رات مکمل ہوتی تھی۔ وہ خود یہی چاہتا تھا کہ اُمِ فروا جلد از جلد کسی نیک انسان کی زوجیت میں چلی جائے۔ وہ جانتا تھا اب اُمِ فروا کبھی اس کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرے گی۔ وہ حق بجانب تھی۔ وہ زبردستی تو اسے اپنے پاس رکھ نہیں سکتا تھا۔

جس شخص کو ہم دل وجان سے چاہتے ہوں، اس کی ناپسندیدگی سہتے ہوئے اس کے ساتھ رہنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔

بلال حمید لحہ لحہ اُمِ فروا کی نفرت سہارنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا خود میں۔ یہ تو ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ اُمِ فروا کو اس کی زندگی سے جانا تھا۔ اگر وہ اسے فوری طور پر طلاق دے دیتا تو وہ ایک لحہ بھی اس کے پاس نہ رہتی۔ اسے اُمِ فروا کی جدائی کا گھونٹ ہر صورت پینا تھا۔ وہ جان ہی نہ سکا اور وہ اس کے دل میں بس گئی تب بلال حمید وہ نہ رہا اس کے اندر بھی وہی موجود تھی۔ ایک کونے میں منہ چھپا کے بلال حمید کی بربادی گہری خاموشی میں جا چکی تھی۔

''ملک صاحب میں آپ کے لیے چائے لاتا ہوں۔'' سنبھلتے ہوئے بلال حمید نے دوبارہ ان کی طرف دیکھا۔

''رہنے دو بلال۔''

''ملک صاحب! آپ کو میری بنائی ہوئی چائے ضرور پسند آئے گی۔'' اس کے اندر ان دیکھی سسکیاں جاری تھیں۔

''ابھی چائے میں نے اُمِ فروا کو بھی بنا کر پلائی ہے۔ کیسی تھی چائے اُمِ فروا؟'' تھوڑی دیر پہلے اُمِ فروا کے الفاظ جو تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز تھے۔ نظر انداز کیے وہ مسکرا کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

''اچھی تھی۔'' اس کے ہونٹ ہلے اور کچھ توقف کے بعد بند ہو گئے۔ بلال حمید خود ان دونوں کو تنہا چھوڑنا چاہتا تھا ممکن ہے دونوں کے درمیان بات کچھ آگے بڑھ سکے۔ ملک مصطفیٰ کی اس قدر مہربانیاں، اس پر بھرپور توجہ، اُمِ فروا کو دیکھ کر ان کی آنکھوں کی جوت کا روشن ہو جانے کا عمل تیز ہونا...... کچھ نہ کچھ تو پسندیدگی ضرور شامل تھی اس میں۔

''بلال حمید بہت خیال رکھنا اس کا۔ بہت سوچ سمجھ کر اسے کسی کے سپرد کرنا۔ تم نے روزِ اول سے اس کی حفاظت کی ہے پھر تم کیسے کسی کے دل کا حال جان پاؤ گے۔ دلوں کے حال تو رب ہی جانتا ہے۔'' وہ چائے بناتے ہوئے بس یہی سوچ رہا تھا۔

اس وقت اُمِ فروا کو بلال حمید پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ ایک غیر مرد کے پاس اپنی منکوحہ کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ جب بلال حمید پاس تھا تو اُمِ فروا کو ایک بھرپور تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ اُمِ فروا نظریں جھکائے کمبل کے اندر خود کو لپیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت ملک مصطفیٰ علی اسکن کلر کے شلوار سوٹ، سیاہ ویسٹ کوٹ پہنے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ مونچھوں کے نیچے مسکاتے گلابی ہونٹ، صاف چمکدار رنگت پر موٹی موٹی دو براؤنش آنکھیں اور ان آنکھوں میں اس لڑکی کے لیے ٹھاٹیں مارتی وارفتگیوں بھری توجہ طلب خاموشیاں۔

اُمِ فرواواقعی آپ بلال کے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔

''نہیں۔''اس نے نگاہیں جھکائے جواب دیا۔ کہیں ملک مصطفیٰ اس کی آنکھوں کی چوری نہ پکڑلیں وہ دل ہی دل میں خدا سے ہدایت پانے کی دعا کررہی تھی۔''یہ آدمی میرے لیے غیر محرم ہے۔خداوند میں کس آزمائش میں پڑنے والی ہوں۔''

اس وقت ملک مصطفیٰ علی دل میں بہت خوش تھے۔ان کا دل بھی تو بار بار اللہ پاک سے اُمِ فروا کا دائمی ساتھ مانگ رہا تھا۔ایسا ان کے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔وہ جانتے تھے بلال نے جو کچھ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہے وہ ہرگز اب اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہے گی۔

''اُمِ فروا۔اگر خدا بلال کے دل میں آپ کے لیے رحم نہ ڈالتا تو پھر......''وہ رک گئے۔''میں سوچ کر خود کانپ جاتا ہوں۔بے خبری میں اس سے غلطی ہوگئی اور خدا نے معجزاتی طور پر آپ کو بچالیا ہے۔''

''آپ صحیح فرمارہے ہیں لیکن میرا دل ودماغ اس بات کو قبول نہیں کرتا۔''

اُمِ فروا کے پاس یوں تنہا بیٹھنا ملک مصطفیٰ علی کے لیے انتہائی روح پرور احساس تھا۔اُمِ فروا کے ہونٹوں کا ارتعاش بڑھا۔

''اگر آپ کے پیرنٹس نے بلال سے آپ کی علیحدگی کو معیوب جانا تو؟''

''میں اچھی طرح جانتی ہوں انہیں علم ہوتے ہی وہ فوری طور پر علیحدگی کا مطالبہ کردیں گے۔ایسا شخص جس نے اس مقدس رشتے کی بنیاد ہی فریب پر رکھی، ایک پل کے لیے بھی اپنی بیٹی اس شخص کے پاس نہ رہنے دیں گے۔''تب ملک مصطفیٰ علی نے گہرا سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔وہ اسی بنا پر تو اُمِ فروا کو اس قدر کُرید رہے تھے۔اپنی ایسی توہین کے احساس سے اُمِ فروا کی رتجگوں کی ماری آنکھیں اچانک نم ہوگئی تھیں۔

''طلاق بری چیز ہے۔خدا کے نزدیک طلاق ناپسندیدہ عمل ہے۔چاہے وہ مجبوراً ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔میرے والدین یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں۔لیکن یہ بھی تو گناہ ہے ناں ایسے شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔ممنون ہوں ان کی انہوں نے اپنے شوہر ہونے کا حق نہیں جتایا۔''یہ کہتے ہوئے وہ کچھ جھجکی تھی لیکن ملک مصطفیٰ علی کے دل میں دور دور تک خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اُمِ فروا کی بات۔وہ خوش تھے کہ روز اول کی طرح آج بھی وہ معصوم ہے۔اس بات کی تصدیق اُمِ فروا نے اپنی زبان سے کردی تھی۔

''میں اس بات کے لیے ان کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے خدا کے حکم سے بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا۔''یہ سب باتیں ایک غیر مرد سے کہتے ہوئے وہ اندر سے بے طرح نڈھال ہورہی تھی۔ایسی سچائی بھری اذیت ناکی کا زہر پینا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

''تب لمحے کے ہزارویں حصے میں اُمِ فروا نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور گھبرا کر ملک مصطفیٰ علی کی جانب دیکھا۔میں ان سے ایسی باتیں کیوں کررہی ہوں۔اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے وہ مسکرائے۔اس کی شبنمی آنکھوں میں کانپتے جگنو انہیں اچھے لگ رہے تھے، تب وہ اس کی مدہوش سحر انگیزی میں کھو سے گئے۔ان پلوں میں ملک مصطفیٰ علی کا دل چاہ رہا تھا بلال سے کبھی چائے نہ بنے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس یوں ہی بیٹھے رہیں۔

ٹرالی میں چائے اور کھانے پینے کا سامان رکھے بلال حمید اندر آگیا۔اس نے ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی اور

ٹرالی ملک مصطفیٰ علی کے سامنے رکھ دی۔

''بلال تمہارے ہاتھ کی چائے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔'' انہوں نے پیالی ہونٹوں سے لگائی اور پہلا سپ بھرتے ہوئے وہ مسکرائے۔''واہ زبردست! تم واقعی چائے بنانے میں ماہر ہو۔''

''یہ سب ان کی کرم نوازی ہے۔'' اس نے خاموش بیٹھی اُمِ فروا کی جانب اشارہ کیا۔ کافی دیر سے کمرے میں بھاری سکوت مسلط تھا۔ سب خاموشی کی زبان میں اپنے آپ سے باتیں کررہے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی چائے کے ہلکے ہلکے سپ بھرتے رہے۔ ملک مصطفیٰ علی نمکو کا ایک ایک دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے جانے کہاں گم تھے۔ اُمِ فروا بار بار اپنی انگلیاں مسل رہی تھی جواب تک خاصی لال ہو چکی تھیں۔

''یہ کب سے یہاں پر بیٹھے ہیں جا کیوں نہیں رہے۔'' اندر کے اس بار بار ہوتے تصادم سے وہ پریشان تھی۔ میرے خیالوں کی بستی میں ملک مصطفیٰ علی کا گزر ہوتا ہے؟ اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو کیا ہوگا۔ اُمِ فروا نے گھبرا کر نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

''آپ آرام کریں میں چلتا ہوں۔ آپ کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔'' وہ اٹھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''پہلے سے بہتر ہوں۔'' ان کی آنکھوں میں اپنے لیے والہانہ تحریر نے اسے نروس کر دیا۔

''خدا حافظ۔'' انہوں نے الوداعی نظر اس کے پُر تقدس چہرے پر ڈالی اور بیڈروم سے باہر نکل گئے۔ اس کا چہرہ وہ اپنی آنکھوں کی کوروں میں چھپائے اپنے ساتھ لیے جارہے تھے۔

''کیا ہم دونوں ایک دوسرے تک رسائی پانا چاہتے ہیں؟'' اُمِ فروا نے ہول کر سوچا۔ اچانک اس نے خود کو سرزنش کی، ایسا ممکن نہیں ہے۔ وہ ریاستوں کے مالک ہیں اور میں ایک مولوی کی بیٹی، جس کی زندگی داؤ پر لگنے جارہی تھی۔ ایسی لڑکی کو کون قبول کرے گا۔ جس کا پہلے ہی ایک نکاح ہو گیا ہو،' وہ خاصی ڈسٹرب تھی۔ جب کہ ملک مصطفیٰ علی یہاں سے بہت خوش ہو کر اٹھے تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد اُمِ فروا سلیپر پہنتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اس وقت وہ اپنی طبیعت بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی کے آنے سے پہلے واقعی اس کی طبیعت خراب تھی، جانے انہوں نے اس پر کیا پڑھ کر پھونکا تھا۔ پسینہ آ جانے کی وجہ سے اس کا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے کپڑے پسینے سے بھیگ رہے تھے۔ اس نے وارڈ روب سے ایک جوڑا نکالا اور واش روم میں چلی گئی۔

وضو کر کے وہ باہر آئی تو بلال حمید اس کا منتظر تھا۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' وہ اس کے لیے فکر مند تھا۔

''کافی بہتر ہوں۔''

''بھوک لگی ہے؟''

''ابھی نہیں۔''

''میں مسجد جارہا ہوں عشاء کی نماز پڑھنے۔ واپس آ کر جو تم کھانا چاہو بنا دوں گا۔''

اس نے اثبات میں گردن کو ہلکا سا خم دیا۔

''میں باہر سے لاک لگا کر جارہا ہوں۔'' اُمِ فروا نے پھر سر ہلایا۔

وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اُمِ فروا نے جائے نماز بچھائی اور نماز کی نیت کرنے ہی والی تھی کہ چمکتے

چہرے پر دو بڑی بڑی آنکھیں اسے دیکھنے لگی تھیں۔ ان کے گلابی ہونٹوں پر مسکانیں بھری ہوئی تھیں۔ اُمِ فروا کے اندر باہر جیسے وہ آنکھیں ٹھہر چکی تھیں۔

اُمِ فروا نے جائے نماز پر کھڑے کھڑے تیسرا کلمہ پڑھا۔ سات بار ''یا حیی، یا قیوم'' پڑھ کر ہاتھوں پر پھونکا، ہتھیلیاں چہرے پر پھیریں اور اپنا پورا دھیان نماز کی طرف مبذول کر لیا۔

''میرے پیدا کرنے والے مجھے زندگی میں کبھی ایک لمحے کے لیے تجھ سے خوف نہیں آیا کیوں کہ میں جانتی تھی، میں اپنی جانب سے تیری اطاعت مندی کی پوری کوشش کر رہی ہوں لیکن اب مجھے تجھ سے خوف آ رہا ہے کیوں کہ میں بھٹک رہی ہوں۔ اللہ پاک تُو دلوں کے بھید اچھی طرح جانتا ہے۔ میں نے یہ سب کبھی نہیں چاہا تھا پھر میں نہیں جانتی یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں نے جان بوجھ کر ملک مصطفیٰ علی کو اپنے دل میں نہیں بسایا۔ مجھے معاف فرما دے۔ میرے ماں باپ تجھ پر قربان۔ بس تو میرے دل سے اس شخص کا خیال مٹا دے۔ میں زندگی بھر تجھ سے اس قدر اصرار کبھی اپنی ذاتی خواہش کے لیے نہیں کروں گی، بس تو مجھے ملک مصطفیٰ علی کے احساس سے نجات دلا دے۔''

بلال حمید دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا اس کی بلند ہوتی سسکیوں کے درمیان اس کی فریاد سن رہا تھا، وہ الٹے قدموں واپس ہال میں آ گیا۔ اب وہ کچن کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اُمِ فروا کے لیے دودھ گرم کیا، ٹوسٹر میں دو سلائس سینکے اور ٹرے میں رکھ کر کچن سے باہر آ گیا۔ اُمِ فروا پر رقت آمیزی طاری تھی۔ اسے اپنے آس پاس کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اب وہ جائے نماز طے کر کے رکھ رہی تھی۔

''اُمِ فروا کچھ کھا لو۔'' بلال حمید مسکرا کر بولا۔

''آپ کس وقت آئے؟''

''تھوڑی دیر ہوئی ہے۔ میں نے سوچا تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ تمہارے لیے کچھ بنا لیا جائے۔ اب تم یہ کھا لو۔ ملک صاحب کہہ رہے تھے صبح تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔'' ملک مصطفیٰ علی کے نام لینے سے اُمِ فروا کے چہرے پر کچھ بے قراری سی پھیلی۔ وہ اب بھی اس کی سرخ سرخ سوجی آنکھیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک ہوک بھری بے قراری کروٹیں لے رہی تھی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''تھوڑا سا کھا لو۔ اب تو ٹمپریچر نہیں ہے ناں۔'' وہ اس کی کلائی چھونا نہیں چاہتا تھا اسی لیے اس سے ٹمپریچر کا پوچھ رہا تھا۔

''اب نہیں ہے۔'' بلال حمید نے ٹرے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔

''کھا لو اور پھر سو جاؤ۔ نیند آنے سے طبیعت اور بہتر ہو جائے گی۔''

''آپ نے کچھ کھایا؟''

''دوپہر کو ملک صاحب کے ہاں سے کھانا آیا تھا، فریج میں رکھا ہے میں مائیکروویو میں گرم کر کے کھا لوں گا۔ تم یہ کھا لو پھر سونے کی کوشش کرو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

کھانے کے بعد وہ ٹرے لیے کچن میں آئی تو بلال حمید نے مائیکروویو میں چاولوں کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔

''لائیں میں گرم کر دوں۔''

''بس ہو گیا تم جا کر آرام کرو۔'' سنک میں ڈھیر لگے برتن اُمِ فروا دھونے لگی۔
'' ارے کہاناں چھوڑ دو میں کرلوں گا۔''
''برتن تو آپ نہیں ناں دھوئیں گے۔''
''بھئی کیوں نہیں دھو سکتا میں۔'' وہ افسردگی سے مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اُمِ فروا نے نگاہیں جھکالیں۔
''اُمِ فروا تم کیا جانو میں کب سے تمہیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھنے لگا تھا۔ تم میری خواہشوں کا حصہ ہو۔ مجھے اپنی ان خواہشات کا مدفن بنا کر خوشی خوشی تم سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ بھلا میں تم سے کوئی شکوہ کر سکتا ہوں۔ شکوے تو تمہیں مجھ سے کرنے چاہئیں۔ بہر کیف تمہیں کھو دینے کا ملال شاید کبھی میرے دل سے نہ جائے۔ یہی سوچ کر صبر کرلوں گا تم کسی اور کے نصیب کا ستارہ تھیں۔ میرے نکاح میں تو تم آگئیں لیکن میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ہمارے ملن کی کوئی لکیر تھی ہی نہیں۔ جب اللہ کا حکم ہی نہیں تھا تو میں کیسے تم تک رسائی پا سکتا تھا۔ کاش ہم دونوں کے بیچ نارسائیاں ہی قائم رہتیں تو اچھا تھا۔'' اس وقت بلال حمید اُمِ فروا کے پیچھے کھڑا سوچ رہا تھا جو اس وقت سینک میں برتن دھو رہی تھی۔ مائیکرو ویو کب کا آف ہو چکا تھا لیکن اُسے اس کے بند ہونے کی آواز ہی نہ آئی تھی۔ بلال حمید نے مائیکرو ویو سے پلیٹ نکالی اور اس میں چمچ رکھتا ہال میں چلا آیا۔ پلیٹ اس کے سامنے رکھی تھی لیکن اس کا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔
''اُمِ فروا تمہیں گنوا دینے کے بعد شاید میں زندہ رہوں یا نہ رہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تم خوش ضرور رہو گی۔ اللہ کرے ملک مصطفیٰ علی بھی تمہیں تمہاری طرح ہی سوچتے ہوں۔ تمہاری بے پایاں رفاقتوں کی اسے بھی طلب ہو۔ وہ بھی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔ اُمِ فروا تمہارے ساتھ گزرے تمام پل مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہ ارفع و اعلیٰ ساعتیں تمہیں کبھی بھولنے ہی نہ دیں گی۔ بس تم ہمیشہ خوش رہنا۔
جب سے بلال حمید نے اُمِ فروا کے منہ سے ملک مصطفیٰ علی کا ذکر سنا وہ نہیں جانتا تھا اس کا دل کیوں خون خون رو رہا ہے۔ جب کہ اس کی کبھی یہی خواہش تھی کہ ملک مصطفیٰ علی کی قسمت میں خدا اُمِ فروا کو لکھ دے۔ ملک مصطفیٰ علی واقعی بہت اچھے انسان تھے۔ سینے پر جیسے پہاڑ سرک آئے تھے۔ گلے میں آنسوؤں کے گولے پھنس رہے تھے۔ ''آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' اُمِ فروا کچن سے فارغ ہو کر بلال حمید کے نزدیک آگئی۔
''ہاں۔'' ٹیبل پر رکھی پلیٹ اس نے ہاتھوں میں پکڑ لی۔ ''تم جا کر سو جاؤ، کہیں طبیعت پھر خراب نہ ہو جائے۔'' بلال حمید نے اپنا سر ضرورت سے زیادہ پلیٹ پر جھکا لیا تھا۔ وہ کسی قسم کی بھی کوئی کمزوری اُمِ فروا پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ میں نے تمہاری وہ باتیں سن لی ہیں۔ جو تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ہو رہی تھیں۔ یہ تمہارا اور تمہارے خدا کا معاملہ تھا۔ میں اچانک درمیان میں آگیا۔ میں معافی کا خواستگار ہوں۔ اپنے رب سے اور اُمِ فروا سے'' وہ ہاتھ میں پلیٹ پکڑے کب سے سوچوں میں گم تھا اُمِ فروا لائٹ بند کر کے اپنے بستر پر جا چکی تھی۔
آنے والی یہ صبح بھی ہر صبح کی مانند بہت پیاری تھی۔ سرمئی سپیدی آہستہ آہستہ کائنات میں کندن جیسے رنگ کی سرشاری بھر رہی تھیں۔ شب بھر کی خوابیدگی و خمار درختوں کے کندھوں سے اٹھ چکا تھا۔ مشرق کی جانب سے نکلتا سورج آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اُمِ فروا دوبارہ لیٹ گئی تھی۔ سر ابھی بھی بوجھل تھا۔ کروٹ بدلتے ہوئے اس نے آہستگی سے آنکھیں بند کرلیں لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ فجر کی

نماز پڑھنے کے بعد وہ ہمیشہ قرآن پاک پڑھا کرتی تھی۔ بے چینی حد سے بڑھی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بسم اللہ پڑھتے ہوئے اس نے الماری سے قرآن پاک نکالا اور پڑھنے لگی۔ پڑھ کر فارغ ہوئی تو سست روی سے چلتی ہال سے گزرتی لان میں آ گئی۔ خوشی کیا ہوتی ہے وہ تو بھول ہی چکی تھی۔ اس حادثے نے اسے اندر سے بہت کمزور کر دیا تھا۔ کسی پل بھی اس کے وجود کے اندر خوشی کی رمق روشن نہیں ہوتی تھی۔

بلال حمید اپنے کمرے میں ابھی تک سو رہا تھا، شاید فجر کی نماز مسجد میں پڑھ کر آنے کے بعد وہ پھر سو گیا تھا۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر لان میں آ گئی۔ پودے تروتازہ اور نکھرے ہوئے لگ رہے تھے۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی تسبیح پڑھتے ہوئے وہ پھولوں سے لدی کیاریوں کے ساتھ چلنے لگی۔ پھولوں کے درمیان آ کر کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لینا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے سفید رنگ کے بڑے سے گلاب کو آہستگی سے جھلایا تو اس نے پتیوں کی رکی شبنم سبز پتیوں پر گرنے لگی، وہ اچانک سے کھلکھلا کر مسکرائی۔ لان میں چلنے آنے سے اس کی طبیعت کافی بہل گئی تھی۔ اس کا دھیان ادھر اُدھر بھٹکنے لگتا تو وہ تیزی سے درود شریف پڑھنا شروع کر دیتی سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ تیز دھوپ اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی وہ اندر آ گئی۔

دروازہ اس نے آہستگی سے کھولا، اس کی چرچراہٹ گہری خاموشی میں عجیب سا ارتعاش پیدا کر گئی۔ اسی وقت بلال حمید انٹرنس کے ساتھ والے اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ وہ کچن کی طرف جا رہا تھا۔ اُمِ فروا کو دیکھ کر چونک گیا۔ ''خیریت اُمِ فروا۔'' وہ دروازہ بند کرتی اُمِ فروا سے بولا۔

''دل گھبرا رہا تھا۔ لان میں نکلی تھی۔'' وہ تسبیح کلائی میں لپیٹتے ہوئے بولی۔

''اب کیسی ہے طبیعت؟''

''کافی بہتر ہوں۔''

کچھ کھاؤ گی۔ بنا دوں؟''

''میں بنا لیتی ہوں۔'' وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دو کپ چائے کے بنائے اور ٹرے میں رکھ کر ہال میں آ گئی۔

''چائے لے لیں۔''

''شکریہ۔''

بلال حمید نے سینٹر ٹیبل سے کپ اٹھا لیا۔ اُمِ فروا نے سرسری نگاہ بلال حمید پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ چہرے پر تھکن تھی۔ اس وقت ملگجے لباس کے ساتھ بے ترتیب بال جو ماتھے پر پھیلے ہوئے تھے۔ چمکتی گندمی رنگت اور متورم آنکھیں، چہرے پر نیند کے بعد کا خمار، اندر کی جانب بھنچے ہونٹ۔ آج وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اُمِ فروا کی طرف دیکھ کر فیاضی سے مسکرایا حالانکہ کئی دنوں سے بلال حمید نے مسکرانا ہی ترک کر رکھا تھا۔ اسے خوب ہنر تھا اپنے جذبات چھپانے کا۔ رات کو جب اُمِ فروا کو سجدے میں گرے خدا سے التجائیں کرتے سنا تھا۔ تب اس نے سختی سے نچلے ہونٹ پر دانت گاڑھ دیے تھے۔ تب اس کی آنکھوں میں بے مرادی کی نمی پھیلی تھی......

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط، انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

انتخاب خاص

انتظار حسین

ماضی، حال اور مستقبل

"جب گلی سے ہندوؤں کی کوئی برأت نکلتی تھی تو تو دیکھنے کے لیے دوڑتا تھا اور بڑی اماں چلایا کرتی تھیں کہ بیٹے مت جا' دجال کی سواری نکل رہی ہے۔ میں کہتی کہ بڑی اماں یہ تو ہندوؤں کی برأت ہے۔ کہتیں کہ بہو' دجال بس کسی دن ایسے ہی آئے گا۔ ساتھ ہی......

ماضی کا وہ آئینہ، جو حال میں بھی مستقبل کا عکس دکھاتا ہے

ٹیلیفون بند کیا' برآمدے سے صحن میں آیا اور ابا جان کے مونڈھے کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابا جان نے حقہ پیتے پیتے اسے دیکھا۔ "بیٹے! کچھ پتا چلا؟"

"نہیں ابا جان' ابھی تک کچھ پتا نہیں چل رہا۔ بڑی متضاد خبریں آرہی ہیں۔"

پھر وہ سامنے میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ پر جھک گیا اور سوئچ گھمانے لگا۔ پھر اس نے ریڈیو بند کر دیا بولا۔

"اب بارہ بجے ہی پتا چلے گا۔ ابا جان' آپ عربی تو سمجھ لیتے ہیں؟"

"بیٹے میں ان شہروں میں اتنا گھوما پھرا ہوں' عربی بھی نہیں سمجھوں گا۔"

ابا جان حقہ پیتے رہے' پھر حقے کی نے الگ رکھتے ہوئے کہنے لگے:

"یہ زمین کے سفر کی آخری منزل تھی۔"

"جی؟" محسن نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

ابا جان نے تامل کیا۔ پھر بولے۔ "جب ہمارے حضورؐ معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے......"

پلنگ پر بیٹھی ہوئی اماں جی چھالیاں کاٹتے کاٹتے رونے لگیں۔ انہوں نے سروتا تھالی میں رکھا اور آنچل سے آنسو پونچھنے لگیں۔ ابا جان کی آنکھ بھی بھر آئی تھی مگر ضبط کر گئے۔ اپنے پروقار لہجے میں پھر شروع ہوگئے۔

"آنحضورؐ دریاؤں' پہاڑوں' صحراؤں سے گزرتے چلے گئے۔ مسجد اقصیٰ میں جا کر قیام کیا۔ حضرت جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ یا حضرتؐ تشریف لے چلیے۔ آپ نے پوچھا کہاں؟ بولے کہ یا حضرتؐ زمین کا سفر تمام ہوا' یہ منزل آخر تھی۔ اب عالمِ بالا کا سفر درپیش ہے۔ تب حضورؐ بلند ہوئے اور بلند ہوتے چلے گئے۔ پہلا آسمان' دوسرا آسمان' تیسرا' چوتھا...... وہاں حضرت عیسیٰؑ نے مصافحہ کیا۔ پھر آپؐ اور بلند ہوئے اور آخر عرشِ معلیٰ کے قریب جا پہنچے اور قوسین کا فاصلہ رہ گیا۔"

ابا جان چپ ہوگئے۔ حقے کی نے پھر منہ میں لے لی۔ اماں جی روئے جا رہی تھیں۔ انہوں نے آنچل سے آنسو پونچھے' چپ ہوئیں پھر کہنے لگیں:

"جب طرابلس میں لڑائی ہوئی تھی' تو یہی دن تھے تیزی کا مہینہ تھا۔" پھر وہ محسن سے مخاطب ہوئیں۔

"بیٹے! یہ تیرے پیدا ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ مجھے تیسرا مہینہ تھا اور اللہ بخشے بڑی اماں نے میرے لیے نئے سونے کے کڑے بنوائے تھے۔ پھر طرابلس میں لڑائی چھڑ گئی' سارے مسلمان دہل گئے۔ ظفر علی مولوی آیا' پھر خلافت والا مولوی آیا' پھر انہوں نے کہا کہ ماؤ' بہنو' مسلمانوں پر کڑا وقت آ پڑا ہے۔ اپنے اپنے زیور اتار دو۔ میں نے روتے روتے اپنے کڑے اتار دیے اور مولوی کو دے دیے اور پھر میں مہینے بھر تک الٹی چرپائی پر سوئی۔"

اماں جی نے ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہوگئیں۔

اس نے ابا جان کی طرف دیکھا جو خاموشی سے حقہ پیے جا رہے تھے۔ اماں جی کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ اب انہیں سکون آ گیا ہے اور اب وہ نہیں بولیں گی مگر اماں جی پھر شروع ہوگئیں:

"اللہ رسولؐ کے نام میں بڑی برکت ہے۔ اگلے ہی برس تیزی کا مہینہ لگتے لگتے تیرے باپ کی نوکری لگ گئی' میں نے اس سے زیادہ موٹے کڑے بنوا لیے۔" اپنی کلائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "یہ وہی کڑے ہیں۔"

پھر انہوں نے سروتا اٹھایا اور چھالیاں کترنے لگیں۔ چھالیاں کترتے کترتے بولیں: "محسن بیٹے ظفر علی مولوی اب کہاں ہے؟"

"اماں جی ان کا تو انتقال ہوگیا۔"

"اور خلافت والا مولوی؟"

"ان کا بھی انتقال ہوگیا۔"

"اچھا' یہ بات ہے۔" اپنے کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔ "جبھی تو کہوں کہ اب کے کوئی آیا نہیں۔"

ابا جان نے ٹھنڈا سانس بھرا' کہنے لگے "کچھ قبریں تو ہم ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے۔ ایک قبر ادھر تھی' وہ بھی گئی...... محسن تم نے رئیس الاحرار کو دیکھا تھا؟"

"رئیس الاحرار کو۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "جی نہیں۔"

"ہاں' تم نے کہاں دیکھا ہوگا' وہ بزرگ بھی وہیں دفن ہیں۔" پھر سوچتے ہوئے بولے: "جانے

کون کون دفن ہے۔ عجب قریہ ہے۔ میں وہاں گیا تو تعجب سا لگا‘ جیسے میں انبیائے کرام کے درمیان چل رہا ہوں...... پھر میں مدینہ منورہ گیا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ‘ کیا مقام ہے۔“

اس نے ابا جان کو دیکھا‘ پھر اماں جی کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ ابا جان کہنے لگے۔ ”گنبد شریف پر کبوتر ہی کبوتر‘ سب سفید براق اور کوئی بیٹ نہیں۔ اللہ اللہ پرندے تک احترام کرتے ہیں۔“

اس بیان پر اسے قدرے تعجب ہوا۔ ”پھر ابا جان‘ وہ بیٹ کہاں کرتے ہیں؟“

”کرتے ہی نہیں۔“

”کرتے ہی نہیں‘ یہ کیسے۔“ وہ چکرایا۔ پھر اس کے دل میں شک پیدا ہونے لگے‘ پھر بولا۔ ”آخر اتنے کبوتر وہاں کیوں بیٹھتے ہیں؟“

”کیوں بیٹھتے ہیں؟ بیٹے تم نہیں جانتے کیوں بیٹھتے ہیں۔ دنیا فتنوں کا گھر ہے۔ شیطنت کا گھر‘ سب طرف شیطان ہے‘ وہ ایک مقام امن ہے۔“

اماں جی چھالیاں کاٹتے کاٹتے کہنے لگیں۔ ”گنبد شریف کو خالی دیکھیں تو کیسا ہے؟“

ابا جان نے تامل کیا‘ پھر بولے۔ ”پورا خواب بیان کرو۔“

اماں جی اس طرح جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں‘ کہنے لگیں۔ ”پورا خواب تو مجھے یاد نہیں ہے‘ کوئی کوئی بات یاد رہ گئی ہے‘ جیسے میں تمہارے ساتھ زیارت کے لیے گئی ہوں‘ جیسے خلقت اُمڈی ہوئی ہے اور سفید سفید کبوتر صحن شریف میں‘ دیوار شریف پر‘ گنبد شریف پر۔ پھر جانے کیا ہوا‘ کچھ یاد نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ میں اکیلی ہوں اور کہہ رہی ہوں کہ اے ہے کبوتر کہاں گئے۔ کوئی کبوتر ہی نہیں ہے۔ صحن شریف میں بھی نہیں‘ دیوار شریف پر بھی نہیں اور گنبد شریف خالی پڑا ہے۔ پھر جیسے میں تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں اتنے میں آنکھ کھل گئی۔“

اماں جی کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔ ابا جان نے حقہ اپنی طرف سرکایا۔ چلم کو اس کی گردن میں پڑے ہوئے چمٹے سے تھوڑا کریدا‘ پھر نے منہ میں لے لی اور حقہ پینے لگے اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے ابا جان اب چپ ہو گئے ہیں اور بالکل نہیں بولیں گے مگر پھر وہ حقہ پیتے پیتے بولے۔

”محسن بیٹے! یہ صحیح ہے کہ ان کے جرنیل کی ایک آنکھ نہیں ہے۔“

”جی‘ یہ صحیح ہے۔“ وہ بولا۔

”اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ اس آنکھ پر ہرا پردہ ڈالے رکھتا ہے۔“

”جی ہاں۔“

ابا جان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ”سب دجال کی نشانیاں ہیں۔“

اماں جی دہل گئیں۔ ”اے خدا نہ کرے ایسی بات کیوں زبان سے نکالو ہو۔“

”میں کیا‘ ساری خلقت کی زبان پر یہی ہے‘ ساری نشانیاں وہی ہیں۔“

”اجی‘ وہ تو اس وقت آئے گا جب قیامت قریب ہو گی۔“

”محسن کی ماں۔“ ابا جان حقے کی نے ایک طرف کرتے ہوئے درد بھرے لہجے میں کہنے لگے۔ ”قیامت میں اب کیا کسر رہ گئی ہے۔“

اس فقرے نے عجب اثر کیا کہ اماں جی پھر رو پڑیں پھر انہوں نے آنسو پونچھے اور اس سے مخاطب ہوئیں۔ ”محسن‘ تجھے بڑی اماں تو یاد ہوں گی؟“

”بالکل یاد ہیں۔“

”جب گلی سے ہندوؤں کی کوئی برات نکلتی تھی تو تو دیکھنے کے لیے دوڑتا تھا اور بڑی اماں چلایا کرتی تھیں کہ بیٹے مت جا‘ دجال کی سواری نکل رہی ہے۔

میں کہتی کہ بڑی اماں یہ تو ہندوؤں کی برات ہے۔ کہتیں کہ بہو دجال بس کسی دن ایسے ہی آئے گا۔ ساتھ تاشا باجا ہوگا اور خود گدھے پر سوار ہوگا۔ تاشے باجے کی آوازوں پر لوگ ایسے باؤلے ہوں گے کہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں گے۔ میں کہتی کہ اے نا بڑی اماں، کوئی عقل میں آنے والی بات ہے، کہیں تاشے باجے کی آواز پہ کوئی ایسا باؤلا ہووے ہے۔ کہتیں کہ بہو لالچ کے سامان اس کے ساتھ بہت سے ہوں گے۔ اس سال ایسا قحط پڑے گا، ایسا کال پڑے گا کہ خلقت تراہ تراہ بول جاوے گی اور دجال کے گدھے کے پیچھے منوں روٹیاں لدی ہوں گی۔ روٹی نکالے گا۔ اس پر اپنے کان سے میل نکال کے رکھے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ حلوا ہے۔ بس حلوے روٹی کی چاٹ میں اس کے پیچھے لگ جائیں گے۔''

یہ بیان سنتے سنتے وہ ہنس پڑا۔ اماں جی کو اس کا ہنسنا اچھا نہیں لگا، کہنے لگیں۔ ''بیٹے' یہ میں تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔ میری بات تو تُو نے ہمیشہ ہنسی میں اڑائی۔ یہ تو تیری دادی کہا کرتی تھیں۔ وہ بھی قبر میں سوچتی ہوں گی کہ کیا سعادت مند پوتا ہے کہ مری ہوئی دادی پر ہنستا ہے۔''

وہ تھوڑا کھسیانا ہوا اور کہنے لگا۔ ''اماں جی' میں تو اور بات پر ہنس رہا ہوں۔ لوگ کان کی میل کو حلوا سمجھیں گے، عجیب سی بات لگتی ہے۔''

ابا جان اب تک خاموشی سے حقہ پیے جا رہے تھے محسن کی یہ بات سن کر انہوں نے حقے کی نے کو ایک طرف سرکایا اور بہت ثقہ لہجے میں بولے: ''بیٹے تم نئی روشنی والوں کے لیے یہ ہنسی کی باتیں ہیں مگر غور کرو تو اس میں عبرت کی باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ہمارے رسولؐ اور آئمہ کو سب کچھ معلوم تھا کہ آگے چل کر کیا، کیا ہوگا اور میں تو یہی سوچ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ کل تک کتنی افراط تھی اور اب رزق کتنا کم ہو گیا ہے۔ محسن کی ماں تمہیں یاد ہے جب بڑے ابا زندہ تھے تو گیہوں کا کیا بھاؤ تھا۔''

اماں جی ترنت بولیں: ''اجی! میں تو یہ جانوں ہوں کہ بڑے ابا مہینے کی پہلی تاریخ کو ڈھائی روپے لے کر منڈی جاتے تھے اور گیہوں کی بوری مزدور کے سر پر اٹھوا کے لاتے تھے۔''

پھر ابا جان بولے: ''بیٹے' یہ ابھی کل کی بات ہے۔ اب ڈھائی روپے کا گیہوں خدا جھوٹ نہ بلوائے' میری مٹھی میں آ جاتا ہے۔ اب جب تک امریکہ سے گیہوں نہ آئے ہمارے پورے نہیں پڑتی اور امریکہ ہمیں دیتا کیا ہے؟ جو دیتا ہے' وہ تو اس کے کان کا میل ہے۔''

ابا جان کے لہجے میں کچھ تلخی سی آ گئی تھی بس اسی لیے اسے بولنے کی ہمت نہیں ہوئی ورنہ اسے یہ بات بہت اکھل رہی تھی کہ ابا جان نے کہاں کا رشتہ کہاں جا ملایا۔ بات کانے دجال کی تھی' تان انہوں نے توڑی امریکی امداد پر مگر وہ کیسے بولتا کہ ابا جان اس وقت برہم تھے۔ پھر اچانک ان کے لہجے میں رقت آ گئی۔ ''مسلمانوں پر بہت برا وقت ہے۔'' رکے' پھر کہنے لگے۔ ''روایتوں میں یہ آیا ہے کہ کانا دجال جب آئے گا تو مسلمان چن چن کر مارے جائیں گے۔ آخر میں تین سو تیرہ مسلمان رہ جائیں گے۔''

''تین سو تیرہ؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

بولے۔ ''ہاں تین سو تیرہ بہت سے مارے جائیں گے۔ بہت سے دجال کے گدھے کے پیچھے لگ جائیں گے۔ صرف تین سو تیرہ رہ جائیں گے۔''

ابا جان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''خدا مسلمانوں پر رحم کرے۔'' اور پھر حقہ پینے لگے' وہ تھوڑی دیر ایسے بیٹھا رہا جیسے بندھا بیٹھا ہے۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر برآمدے کی طرف چلا۔

اماں جی نے پیچھے سے آواز دی۔ ''بیٹا' ذرا پھر

اخبار کے دفتر میں ٹیلی فون کرو۔"
اس نے ٹیلی فون پر جا کر ڈائل گھمایا۔ ہیلو ڈھائی تین منٹ بات کی۔ پھر واپس خاموش کرسی پر آبیٹھا۔
ابا جان نے اس کی صورت غور سے دیکھی پوچھا۔ "کوئی خبر ملی؟"
"جی' سیز فائر ہو گیا۔"
"مسلمانوں نے ہتھیار ڈال دیے؟"
"بس یہی سمجھیے۔"
ابا جان کا سر جھک گیا۔ وہ ان کا جھکا ہوا سفید سر دیکھتا رہا۔ پھر انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ بولے۔
"جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے وہاں ہم پست ہو گئے۔" پھر چپ ہو گئے پھر انہوں نے چلم پر تو اڈھک دیا۔ حقے کو اٹھا کر الگ رکھا اور برابر بچھے ہوئے پلنگ پر بستر تھوڑا درست کیا اور دراز ہو گئے۔
اماں جی یکساں رفتار سے سروتا چلا رہی تھیں اور چھالیاں کتر رہی تھیں اور اسے تعجب ہوا کہ اس مرتبہ وہ روئیں بھی نہیں اور بولیں بھی نہیں پھر انہوں نے سروتا تھالی میں رکھا، تھالی پاندان میں رکھ کر اسے بند کیا۔ پھر اٹھ کر انہوں نے پاندان برآمدے میں جا کر اس چوکی پر جہاں جانماز لپیٹی رکھی تھی ایک طرف رکھ دیا۔ پھر انہوں نے بیچ صحن میں کھڑے ہو کر چپکے چپکے کچھ پڑھا۔ پڑھ کر پھونک ماری اور تین بار تالی بجائی' پھر اپنے پلنگ پر آئیں اور کروٹ لے کر پڑ گئیں۔
اس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ وہ یوں بیٹھا تھا جیسے ڈھیر ہوا پڑا ہے' ذرا اٹھا تو بکھر جائے گا۔ سامنے میز پر رکھے ہوئے ریڈیو سیٹ کا سوئچ گھمانے لگا۔ گھماتا رہا۔ سوئی ایک اسٹیشن پر رک گئی' کچھ آوازیں آئیں' وہ بغیر سنے اور بغیر سمجھے پھر سوئچ گھماتا اور کسی اور اسٹیشن کو لگا لیتا۔ شاید کوئی اسٹیشن اس کے پیش نظر نہیں تھا۔ پھر سوئچ گھماتے گھماتے وہ بیزار ہو گیا۔ ریڈیو آف کیا اور اپنے پلنگ پر جا لیٹا۔
نیند اب بھی اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ اس نے کئی بار آنکھیں بند کیں۔ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ پھر بور ہو کر آنکھیں کھول لیں اور تاروں بھرے آسمان کو تکتا رہا۔ تاروں بھرے آسمان کو تکتے تکتے اسے لگا جیسے ایک پگڈنڈی ہے جو دور تک چلی گئی ہے اور پگڈنڈی پر تارے پسے ہوئے پڑے ہیں۔ یہ کہکشاں ہے اور کہکشاں کے خیال سے اسے بڑی اماں کا خیال آیا۔ جب بڑی اماں زندہ تھیں اور وہ بچہ تھا۔ "بیٹے! یہ ہمارے حضورؐ کے گھوڑے شریف کے سموں کی دھول ہے۔"
"آسمان پر گھوڑا گیا تھا؟"
"ہاں بیٹا معراج شریف تو ساتویں آسمان پر ہے۔ حضورؐ گھوڑے پر بیٹھ کر آسمانوں سے گزرے تھے۔"
"جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے وہاں ہم پست ہو گئے۔" اسے ابا جان کا فقرہ یاد آ گیا۔ پھر وہ بڑی اماں کو بھول گیا اور ابا جان کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ کانا دجال' کان کا میل' گدھا' گیہوں' امریکہ' سڑک کی اینٹ' گلی کا روڑا۔ ابا جان بھی بھان متی کا کنبہ جوڑتے ہیں' کہاں کا سرا کہاں جا کر ملاتے ہیں۔ بات اس زمانے کی ہوتی ہے اور اسے کسی پچھلے زمانے کے ساتھ گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ ویسے اس احساس کے باوجود ابا جان کا سایہ اس پر منڈلا رہا تھا اور ماضی اور حاضر اس کے تصور میں گڈمڈ تھے۔
ماضی اور حاضر اس نے بڑی مشکل سے الگ الگ کیا اور طے کیا کہ یہ جنگ زمانہء حاضر کی جنگ ہے۔ میں انبیائے کرام کے درمیان میں نہیں آج کے لوگوں کے درمیان سانس لے رہا ہوں۔ میں حاضر میں ہوں' ابا جان اور اماں جی ماضی میں ہیں۔ کانا دجال اس ماضی کا بھیانک مستقبل ہے جس میں ابا جان اور اماں جی سانس لے رہے ہیں اور میرے زمانے کا مستقبل؟ اس پر وہ الجھا مگر پھر اس نے طے

کیا کہ چونکہ حال الجھا ہوا تھا' اس لیے مستقبل بھی الجھا ہوا ہے۔ اتنے قطعی انداز میں سوچنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ رات اچھی خاصی گزر گئی ہے۔ اسے اب سوجانا چاہیے اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

آنکھیں بند کیے وہ اچھی خاصی دیر لیٹا رہا اور اس گمان میں رہا کہ اب وہ سونے لگا ہے۔ ابا جان آہستہ سے کھنکھارے' پھر انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اس نے حیرت سے سوچا کہ ابا جان کیا ابھی تک سوئے نہیں ہیں۔ دراز تو وہ ایسے ہوئے تھے جیسے لیٹتے ہی سو گئے ہیں اور اماں جی؟ اس نے محسوس کیا کہ انہوں نے کئی بار کروٹ بدلی ہے۔ باتیں اور یادیں اس کے تصور میں پھر ابھرنے لگیں۔ ابا جان عجب طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ کہاں کا رشتہ کہاں جوڑتے ہیں۔ کان کا میل' کانا دجال' گدھا' گیہوں' امریکہ اس کے تصور میں زمانے پھر گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ محسن تجھے بڑی اماں تو یاد ہوں گی اور اس نے حیرت سے سوچا کہ کتنے برس بیت گئے مگر اسے بڑی اماں اور بڑے ابا اور اپنا بچہ ہونا سب یاد ہے۔ ایک ایک بات یاد ہے۔ ہندوؤں میں باراتیں ان دنوں کتنی چڑھتی تھیں۔ ادھر بارات کے تاشے باجے کی آواز آئی اور ادھر وہ سٹکا اور ادھر بڑی اماں گھبرا کر اٹھیں' پھر دروازے سے نکلتے نکلتے اسے پکڑا۔ دروازہ بند کر کے اسے اندر لائیں۔ ''ڈوبے بخت مارے' تو دجال کا لشکری بنے گا؟''

سفید داڑھی اور بھاری بدن کے ساتھ چوکی پر بیٹھے ہوئے بڑے ابا نے اسے پیار سے پاس بٹھایا' پھر دجال کی ایک ایک نشانی اسے سمجھائی۔ ''اور پھر ہمارے امام......'' اور یہ کہتے کہتے ان کا سر جھکا۔ بڑی اماں نے جھک کر سلام کیا اور وہ اتنا جھکا کہ دہرا ہو گیا۔ ''تو پھر آپ ظہور فرمائیں گے۔'' پھر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''آپ حق کا اعلان کریں گے اور مسلمان حق کی گواہی نہیں دیں گے۔ بس گنتی کے لوگ ہوں گے۔ روایت میں آیا ہے کہ وہ تین سو تیرہ ہوں گے۔''

بڑی اماں بولیں۔ ''اجی! آخر اتنے لاکھوں کروڑوں مسلمان ہیں وہ امام کی آواز نہیں سنیں گے۔''

''سب سنیں گے ان کی آواز' ساری دنیا میں سنی جائے گی مگر مسلمان کہاں ہوں گے۔ بہت سے مسلمان شہید ہو چکے ہوں گے' بہت سے دجال کے گدھے کے پیچھے ہوں گے بس تین سو تیرہ گواہی دینے والوں میں رہ جائیں گے' بس ان ہی کو لے کر آپ نکلیں گے۔''

اس نے کروٹ لی اور سوچا۔ میں ماضی میں ہوں یا مستقبل میں ہوں۔ ماضی' حال مستقبل' بیداری' خواب سب کچھ گڈمڈ تھا۔ جیسے وہ جاگ بھی رہا تھا اور سو بھی رہا تھا۔ جیسے وہ ماضی' حال اور مستقبل ہے؟ جو آغاز تھا وہی انجام بھی ہے۔ جہاں ہم بلند ہوئے تھے' وہاں ہم پست ہو گئے۔ کانا دجال تاشے باجے کے ساتھ آئے گا' کانا دجال' کان کا میل' گدھا' گیہوں' امریکہ...... میں ماضی میں ہوں یا حال میں ہوں۔ وہ سو بھی رہا تھا اور جاگ بھی رہا تھا اور جب وہ جاگا تو وہ سوچنے لگا کہ کیا وہ سو رہا تھا۔ اس نے آسمان کو دیکھا۔ آسمان اب اجلا ہو چلا تھا۔ تارے بہت سے معدوم ہو گئے مگر تھوڑے اب بھی جہاں تہاں جھلملا رہے تھے اور پگڈنڈی جس پر ستاروں کی دھول بکھری ہوئی تھی؟ اس نے سوچا کہ شاید کہکشاں رات کو منور ہوتی ہے اور صبح ہوتے ہوتے بجھ جاتی ہے تو کیا اذان ہو چکی ہے۔ پتا نہیں اذان ہو چکی تھی یا ابھی نہیں ہوئی تھی مگر دور کے کسی گھر سے مرغ کی اذان سنائی دے رہی تھی اور جب اس نے کروٹ لی تو دیکھا کہ ابا جی چوکی پر جانماز بچھائے سجدے میں جھکے ہوئے ہیں۔ اماں جی کا پلنگ الٹا پڑا ہے اور وہ زمین پر جانماز بچھائے تسبیح ہاتھ میں لیے آنکھیں موندے بیٹھی ہیں۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ میگزین

- رنگِ کائنات
- دوشیزہ گلستاں
- نئے لہجے، نئی آوازیں
- یہ ہوئی نا بات
- لولی وُڈ، بولی وُڈ
- نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل
- کچن کارنر
- حکیم جی!
- بیوٹی گائیڈ

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

فرمان الٰہی

وہی (اللہ تعالیٰ) تو ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع رکھا تا کہ تم اس کے راستوں پر چلو پھرو، اور اللہ کا (دیا ہوا) رزق کھاؤ، اسی کے پاس (تمہیں دوبارہ) زندہ ہو کر جانا ہے۔ کیا تم لوگ اس (اللہ) سے بے خوف ہو گئے ہو جو کہ آسمان میں دھنسا دے اور پھر زمین جھکولے کھانے لگے؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی (تند و تیز) ہوا بھیج دے؟ پھر عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری (یعنی اللہ کی) تنبیہ کیسی (صحیح) ہوتی ہے۔

(سورۃ الملک 67 ترجمہ، آیات 15 تا 17)

حدیث نبوی

حضرت ابو ہریرہ رضی عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''جب زمانہ یکساں ہو (یعنی دن رات برابر ہوں یا قیامت قریب آ جائے گی) تو مسلمان کا خواب جھوٹا نہ ہوگا اور تم میں سے سب سے سچا خواب اسی کا ہوگا جو باتوں میں سب سے سچا ہے۔ اور مسلمان کا خواب نبوت کے پینتالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ اور خواب تین طرح کا ہے۔

ایک تو نیک خواب، جو خوش خبری ہے اللہ کی طرف سے۔ دوسرا رنج کا خواب جو شیطان کی طرف سے ہے۔ تیسرا وہ خواب جو اپنے دل کا خیال ہو پھر جب تم میں سے کوئی برا خواب دیکھے تو کھڑا ہو اور نماز پڑھے اور لوگوں سے بیان نہ کرے اور خواب میں بیڑیاں پڑی دیکھنا اچھا سمجھتا ہوں اور گلے میں طوق برا سمجھتا ہوں۔''

(مسلم شریف: باب اذا اقترب الزمان لم تکد رویا المسلم تکذب)

حمد

جب بھی پڑی ہے مشکل ہم نے تجھے پکارا
تیرے سوا جہاں میں کوئی نہیں ہمارا
تُو نے ہی دی ہیں ہم کو یہ جہاں کی نعمتیں سب
اِک دینے والا سب کو تُو ہی تو ہے مرے رب
مایوسیوں نے آ کے جب بھی ہے مجھ کو گھیرا
تُو نے ہی ہے دکھایا امید کا سویرا
تیرے کرم سے نکلی کشتی بھنور سے میری
میں تو بہت ہی بے بس عاجز ہوں بندی تیری
تُو نے مجھے اگر ہے گمراہی سے نکالا
مری زندگی میں کر دے ایمان کا اجالا
مجھ پہ تو رحم کر دے اب اے میرے خدارا
گناہوں میں ہوں ملوث دے دے مجھے کنارا
اپنے کرم کی چادر پھیلا دے مجھ پہ یا رب
توبہ قبول کر لے میری مرے خدا اَب

شاعرہ: رضوانہ کوثر

فرمانِ قائد

پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم لوگ دس سال سے شدید جدوجہد کررہے تھے، خدا کے فضل سے آج ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن اپنی مملکت کی یہ تخلیق وسیلہ ہے مقصود کے حصول کا۔ یہ بذات خود مقصود نہیں ہے۔تصور یہ تھا کہ ہماری اپنی ایک اسٹیٹ ہو، جس کے اندر ہم آزاد انسانوں کی طرح زندگی بسر کرسکیں اور آزادی کا سانس لے سکیں اور اس کی نشوونما ہم خود اپنی روشنی اور اپنی تہذیب کے مطابق کرسکیں، جہاں اسلامک سوشل جسٹس (اسلامی عدل اجتماعی) اصولوں کے روبہ عمل میں آنے کے لیے کھلی فضا پائیں۔

(کراچی: سرکاری افسران سے خطاب...... 11 اکتوبر 1947ء)

جیسی کرنی ویسی بھرنی

کہتے ہیں ایک آدمی نے موسیقی کو ذریعۂ روزگار بنایا ہوا تھا۔اس کی ترنم ریزیاں خشک ہڈیوں میں خون دوڑاتیں ایک عالم کیف پیدا ہوتا۔ سننے والوں پر عالم وارفتگی طاری ہوجاتا مگر وہ تھا پرلے درجے کا بخیل، لوگوں نے ہزار جتن کیے مگر اس نے کسی کی بات نہ مانی، آخر کار وہ مرگیا۔اس کی روح ایک بہت گھنے اور اونچے درخت پر رکھی گئی اور اس درخت کے نیچے ایک کریہہ الصورت علم موسیقی ابجد سے ناواقف ایک شخص آموجود ہوا۔ وہ ہروقت گاتا رہتا اور سمع خراشی کرتا۔اس سے اس کی روح کو ایذا اور تکلیف پہنچنے لگی ،اس پر یک گونہ عذاب نازل ہوا۔

اس کی روح نے خدا سے التجا کی یا تو اس کریہہ شخص کی صورت کو یہاں سے ہٹا دیا جائے یا اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے۔

اسے بتایا گیا کہ اگر تُو بعد کی زندگی سکھ اور لطف سے گزارنے کا متمنی ہوتا تو اپنے فن کا راز داں کسی کو بنا کے آتا اور آج بیٹھے بیٹھے راگ سنتا مگر اس دنیا میں اس دار العمل میں تُو نے ایسا نہ کیا۔اب جیسی کرنی ویسی بھرنی۔''

مرسلہ: سلمیٰ سیّد۔دادو

وقت کے ساتھ ساتھ

ایک نیا شادی شدہ جوڑا ہنی مون منانے گیا۔ اچانک اس کا گزر ایک ایسی جگہ سے ہوا جہاں بہت گہرا گڑھا تھا، جسے دیکھ کر شوہر جلدی سے بیوی کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔

''ڈارلنگ! ذرا دھیان سے چلیے گا۔ سامنے ایک گڑھا ہے۔''

''ان کی شادی کو پانچ سال گزر گئے تھے اور کسی وجہ سے دونوں میاں بیوی کا گزر پھر اسی گڑھے کے قریب سے ہوا۔میاں بیوی سے بولا۔

''اندھی ہوگئی ہو کیا۔اتنا بڑا گڑھا دکھائی نہیں دیتا تمہیں۔''

سال گزرتے گئے اور شادی کو آٹھ نو سال بیت گئے کہ اتفاق سے میاں بیوی اس گڑھے کے پاس سے پھر گزرنے لگے تو میاں کا دل چاہا۔

''کیوں نا اپنی بیوی کو اس میں دھکا دے دوں۔''

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح جبکہ سب سے آسان کام دوسروں پر نکتہ چینی کرنا ہے۔(البیرونی)

☆ اپنے آپ کو بہتر سمجھ لینا جہالت ہے۔ ہر ایک کو اپنے سے بہتر سمجھنا چاہیے۔(امام غزالیؒ)

☆ دنیا میں وہی لوگ سربلند رہتے ہیں، جو تکبر کے تاج کو دور پھینک دیتے ہیں۔(شیخ سعدیؒ)

☆ یتیم وہ نہیں جو والدین کے سائے سے محروم ہوگیا ہو بلکہ یتیم وہ ہے جو اخلاق سے محروم ہو۔ (حضرت علیؓ)

☆ دل ایک آئینہ ہے۔ اگر وہ بدی سے پاک ہوتو اس میں خدا بھی نظر آ سکتا ہے۔(مولانا رومؒ)

☆ بڑے گھروں میں عموماً چھوٹے اور چھوٹے گھروں میں بڑے لوگ ہوتے ہیں۔(رازی)

☆ محض اندازے اور قیاس پر کوئی بات مت کہو۔ ایسا کرنے سے انسان غلط فہمی، نفرت اور جھوٹ پھیلانے کا باعث بنتا ہے ۔(بابا فرید الدینؒ)

☆ جب لوگوں سے بات کرو روز بان کی حفاظت کرو۔(لقمانؒ)

مرسلہ: انگبین شہزاد۔ کراچی

جیب کترا

دہلی میں، ایک جیب کرتا تھا، جس کا انگوٹھا قینچی کے پھل کی طرح دودھارا تھا۔ اس نے کلمے کی انگلی بھی پتھر پر گھس گھس کر شیشے کی مانند سخت کرلی تھی۔

باہر کے ایک صاحب جو، خواجہ حسن نظامی کے ہاں آئے اور شکایت کی کہ'' دہلی کے جیب کتروں کی بڑی سنی تھی۔ آج ہمیں دہلی کے بازاروں میں پھرتے چار دن ہوگئے۔ لیکن کسی کو مجال نہیں ہوئی کہ کوئی ہماری جیب کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لے۔''

خواجہ صاحب نے اس چٹکی باز کو بلوایا اور اِن صاحب سے اس چٹکی باز کا آمنا سامنا کرایا۔ اس ہنر مند نے مسکرا کر کہا'' خواجہ صاحب! میرے شاگردوں نے ان صاحب کا حلیہ بتایا تھا۔ چار دن سے انگرکھے کے اندر کی جیب میں پیتل کے آٹھ ماشے وزن کے سکے ڈالے گھوم رہے ہیں اور وہ بھی گنتی کے چار۔ آپ ہی بتایئے کون جعلی سکوں پر اپنی نیت خراب کرے گا۔''

اخلاق احمد دہلوی کی کتاب'' پھر وہ اپنا بیان'' سے غوثیہ نسیم، کراچی کا انتخاب

محبت

محبت کی ابتدا بڑی حسین، رنگین اور دلکش ہوتی ہے۔ لیکن اس کا انجام بعض اوقات اتنا بھیانک اور کرب ناک ہوتا ہے کہ انسان زندگی کی قبر میں جلتا ،سلگتا رہتا ہے۔

محبت ایسا پھول بھی ہے جو اپنی نشونما کے لیے کسی خطے اور موسم کا محتاج نہیں ہوتا، اگر محبت نہ ہوتو رشتوں کا تقدس ہی ختم ہوجائے، محبت تو ایسا پاکیزہ جذبہ ہے جو ہر انسان کے دل میں موجود ہوتا ہے ،محبت انسان کو وہ سب کچھ دیتی ہے جو اسے چاہیے اور کبھی کبھی چھین بھی لیتی ہے جن کے بغیر انسان ادھورا رہتا ہے۔ محبت ایسا سکھ ہے کہ اگر زندگی سے چلا جائے تو سانسیں تک دکھی ہو جاتی ہیں۔ محبت بانٹیے اور پایئے۔ ہوسکتا ہے ہماری سچی محبت کا کوئی نہ کوئی منتظر ہو۔

مرسلہ: احسن عمرانی۔ ٹھٹہ سٹی

بندھے ہوئے بڑے لوگ

جہاز میں امجد اسلام امجد کے پاس بیٹھنے کا یہ فائدہ ہوا کہ فضائی میزبان اتنا قریب آجاتی کہ امجد صاحب کو بھی اسے دیکھنے کے لیے عینک اتارنا پڑتی۔ ہم نے عطاالحق قاسمی صاحب سے کہا۔

'' ایئر ہوسٹس امجد اسلام کے ساتھ اس قدر احترام سے پیش آرہی ہے، اس نے ضرور امجد صاحب کی کتابیں پڑھی ہیں۔''

عطاء صاحب بولے'' جتنی وہ عزت کررہی ہے اس سے تو لگتا ہے کہ نہیں پڑھی ہیں۔''

فضائی میزبان نے بتایا کہ وہ اس شعبے میں آئی ہی اس لیے ہے کہ بڑے بڑے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ ہم نے کہا یہ تو اور بھی کئی محکموں میں ممکن ہے۔ آپ نے ایئر ہوسٹس ہی بننا کیوں پسند کیا؟"
وہ بولی "ہو سکتا ہے اور محکموں میں بھی بڑے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا ہو مگر وہ وہاں بندھے ہوئے نہیں ہوتے۔"
ڈاکٹر یونس بٹ کی تحریر سے شازیہ رضوی، کراچی کا اقتباس

باتوں سے خوشبو آئے

☆ ایک تنہا باپ سات بیٹوں کی پرورش کر سکتا ہے لیکن سات بیٹے مل کر بھی ایک باپ کی خدمت نہیں کر سکتے۔
☆ ماں واحد ہستی ہے، جو کسی صلے کے بغیر اولاد کی پرورش کرتی ہے۔
☆ جو کچھ مانگنا ہے اپنے سوہنے رب سے مانگ، جو واپسی کا تقاضا بھی نہیں کرتا۔
☆ سلام میں پہل کرو اور ہر کسی کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔
☆ ہمیشہ وہ انسان خزاں کی قدر کرتا ہے جس نے بہار میں زخم کھائے ہوں۔
☆ عقل مند آدمی اس وقت تک نہیں بولتا جب تک خاموشی نہیں ہو جاتی۔
☆ زندگی محض جینے کا نام نہیں بلکہ اس کو اچھے اعمالوں سے کارآمد بنایا جاتا ہے۔
مرسلہ: مہک مجید۔ ٹنڈو الٰہ یار

غزل

نہ دل سے آہ نہ دل سے صدا نکلتی ہے
مگر یہ بات بڑی دور جا نکلتی ہے
ستم تو یہ ہے کہ عہدِ ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے
وصالِ بحر کی حسرت میں جُوئے کم مایہ
کبھی کبھی کسی صحرا میں جا نکلتی ہے
میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے
وہ زندگی ہو کہ دنیا فراز کیا کیجیے
کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے
شاعر: احمد فراز

چھوٹی چھوٹی باتیں

دادی جان نے ٹھنڈی سانس لے کر پوتی سے کہا۔
"آج کل کی لڑکیاں تو کسی بات پر نہیں شرماتیں۔ ہمارا زمانہ اور تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑکیوں کے چہرے شرم سے سُرخ ہو جاتے تھے۔"
"کیا آپ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے بتانا پسند کریں گی؟" پوتی نے سنجیدگی سے فرمائش کی۔
مرسلہ: مریم لطیف، بُورے والا

سچائی سے بچو

افلاطون سچائی کی فضیلت بیان کر رہا تھا۔
"سچائی اور سچ کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن ایک ایسی سچی بات بھی ہے جس سے انسان کو بچنا چاہیے۔"
ایک شاگرد نے سوال کیا۔ "سچی بات سے پرہیز کیا معنی؟"
افلاطون نے کہا۔ "ہاں، وہ سچی بات ہی ہے لیکن لائق پرہیز اور وہ ہے اپنی تعریف اور ستائش۔ گو کہ تم میں وہ تمام خوبیاں اور اوصاف موجود ہی کیوں نہ ہوں جن کا تم اظہار کر رہے ہو۔"
مرسلہ: ارحم سجاد۔ کھاریاں

☆☆☆

دوشیزہ موبائل

دوشیزہ کو رکھنا سنبھال کے Balance کی طرح
کرنا تم اس کا انتظار، کسی Call کی طرح
سبھی خطوط کو پڑھنا، SMS کی طرح
مدیرِ اعلیٰ کو سب چاہنا Ring Tone کی طرح
مدیر کی باتیں سننا، کال سینٹر سروس کی طرح
دوشیزہ کی محفل میں یوں آنا کمپنی کے Msg کی طرح
لکھنا باقاعدگی سے ہر ماہ خط Esay Load کی طرح
پہنچانا اس کو دوسروں تک زونگ کی طرح
کرنا تم اس کی آفرز ٹیلی نار کی طرح
کسی اور پرچے میں نہ ہوجانا بزی نیٹ ورک کی طرح
دوشیزہ سب کہہ دو

سدرہ انور علی۔ جھنگ، صدر

سانحۂ پشاور

جانے والے چلے گئے ملنے کی حسرت باقی رہی
دل میں اِک خلش پلنے لگی تشنگی باقی رہی
برھا کی چنگاری سلگنے لگی سینے میں دھن ہوتی رہی
آنسوؤں میں رات بھیگنے لگی، صبح تک اوس روتی رہی
دل میں بسیرا کرنے والے اچانک بچھڑ جائیں اگر
زخم محبت ناسور بن جاتا ہے، زندگی بوجھ کی طرح گزرتی رہی
گلاب چہرے قلم وکتاب لیے اپنے ہی لہو میں ڈوب گئے
ظلم کی انتہا میں بھی علم کی شمعِ جلتی رہی

جیجل میتلو۔ کراچی

غزل

یہ کیسا شور اُٹھا ہے اس مہینے میں
خلوص، صبر و وفا کچھ نہیں خزینے میں
ہر ایک اور سے تڑپتی صدائیں آتی ہیں
کیا ہے چھید یہ کس نے میرے سفینے میں
بہت قربانیوں کے بعد ملک پایا تھا
یہ ملک ہم نے جسے رکھا نہیں نگینے میں
کوئی تو آئے، اس کو سنبھال لے آکر
نہیں ہے لطف ہر روز مرنے جینے میں
ہمیں اے گُل خود ہی سنوارنی ہوگی
یہ زندگی جو کب سے نہیں قرینے میں

سُباس گل۔ رحیم یار خان

یہ رشتے...

کیوں کرتی ہو غم، جلتے کڑھتے اِن رشتوں کا
سانس کی ڈوری ٹوٹی، سب کھیل ختم اِن رشتوں کا
یہ رشتے دنیا کے، دنیا ہی میں رہ جائیں گے
وہاں نہ ہوگا کوئی اپنا نہ پرایا اِن رشتوں کا
پیار محبت، دُکھ سُکھ سانجھے ہیں جن کے
کاٹ میں پھر بھی رہتے ہیں کیا بھروسا اِن رشتوں کا
بہو بنے چاہے خالہ، پھوپی، چاچی مامی یا تائی کی
ہوگا پھر بھی وہی تماشا، ساس بہو کے اِن رشتوں کا
منہ کے میٹھے، دل کے میلے، یہ جلتے بجھتے رشتے
ہے قائم جہاں میں رنگ پھر بھی ان رشتوں کا
سُکھ کی بنسی بجاؤ، لمبی تانو اور سو جاؤ تم ثمینہ
یہ کھٹے میٹھے رشتے ہیں، نہ روگ لگاؤ اِن رشتوں کا

ثمینہ عرفان، کراچی

ویلنٹائن ڈے

اِس ویلنٹائن ڈے پر
تیری جانب سے بھیجے گئے سرخ مہکتے گلابوں نے

میرے چاروں اُور دھنک رنگ سے بکھرا دیے ہیں
دل کا ویران نگر کھل اُٹھا ہے
ہر سمت چھا گئی ہے مست گھٹا
خدا رکھے سلامت پیار کو اپنے ہمیشہ
ہونٹوں سے میرے نکلتی ہے بس یہ صدا......
یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ لاہور

سوال

وہی بھیگی سردیاں، وہی گھٹائیں، وہی سرد ہوائیں
شاہراہِ زیست پر، اَدھ کھلے گلابوں کے موسم میں
آج بھی رقص کرتی ہیں تیری میری صدائیں
بھر کے دل کی جھولی میں، تیری یادوں کے کنول
آنکھ میں درد کے جگنو جھلملاتے ہیں
دسمبر کی کہر میں ڈوبی شام میں
اپنی سرد ہتھیلی کو دیکھ کے تنہا سوچتی ہوں
تُو کہاں ہوگا؟ تُو کہاں ہوگا
فصیحہ آصف خان، ملتان

میں اور میرا نوسٹلیجیا

اُف!......
نرم گرم سے دن ہیں، خنک خنک سی شامیں، سرد لمبی راتیں
میں دھوپ میں بیٹھی ہوں
بچوں کی باتوں پہ کھلکھلا کے ہنستی ہوں
مگر یہ میرا نوسٹلیجیا!!
اُف یہ دِل ناداں، گئے وقتوں میں کھویا ہے
وہ خزاں کے پتوں کی بارش، وہ نرم نرم سی دھوپ
وہ اسکول کالج کے قصے، سکھیوں کی یادیں، استادوں کی باتیں
بہت ہی یاد آتا ہے
دوپٹا بھیگ جاتا ہے
میں اکثر سوچتی ہوں، شکر خدا کا بھی کرتی ہوں ادا
خوبصورت شامیں ہیں، مطمئن سے دن ہیں
خدا کی ہر نعمت ہے
مگر یہ میرا نوسٹلیجیا
گئے وقتوں کی یادیں
شاذیہ ستار نایاب۔ لاہور

سفر

بہت تھک چکی ہوں سفر کرتے کرتے
خفا زندگی کو بسر کرتے کرتے
ابھی بچ رہی ہے میری زندگانی
بہت کر چکی ہوں بسر کرتے کرتے
حوالے محبت کے تم کو ملیں گے
کسی دِل میں شام و سحر کرتے کرتے
محبت میں مجھ کو بھلا کیا ملا ہے
تمہاری طرف یہ نظر کرتے کرتے
فریدہ جاوید فری۔ لاہور

وہ اِک لمحہ

تری نظروں کی تپش سے میرا وجود پگھل رہا تھا
چہرہ زرد، ہتھیلیاں آگ، دل مسلسل دھڑک رہا تھا
مجھے یاد ہے تو بس وہ اِک لمحہ جب تُو میرا ہوا تھا
میری پچھلی ساری زندگی کو رائیگاں کر رہا تھا
عنبرین نعیم۔ کراچی

محبت کے دن، میری دعا

محبت کا دن اِس برس پھر سے آگیا ہے
اِس برس بھی میری خدا سے یہی دعا ہے
اے خدا تُو میرے بے وفا کو
اس برس، کچھ دے نا دے
بس اک وفا عطا کر دے
اُس کے دل میں پھر سے
محبتوں کے چراغ روشن کر دے
شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

یہ ہوئی نا بات

سوال آپ کے.....
جواب زین العابدین کے!!

اِس ماہ لاریب۔ گھوٹکی کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جا رہا ہے (ادارہ)

ذیشان ظہور۔ کراچی

☺ زین بھائی! آج کل میں بہت اداس ہوں کیا کروں؟

✎ بھائی فوری طور پر ٹی وی اور اخبار سے پرہیز شروع کر دو۔

شبانہ زمان۔ سکھر

☺ بھیا جی! اگر کپڑے دھوتے وقت شوہر کی جیب سے محبوبہ کی کوئی تصویر مل جائے، تو کیا کیا جائے؟

✎ اچھی شبانہ! تصویر کو اسی دن فریم کروا کے اپنی ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھ دو۔ تصویر خود غائب ہو جائے گی۔

نرگس بانو۔ سیالکوٹ

☺ زین جی! عمر یا بیتی جائے، کوئی رشتہ نہ آئے۔ بتایئے کیا کروں؟

✎ کچھ نہ کریں بس وظائف پر توجہ دیں۔

ظفر ظہور۔ کراچی

☺ زین بھائی! لڑکوں کو کس عمر میں شادی کرنا چاہیے؟

✎ ظفر بھائی! جب لڑکوں میں عقل آ جائے اور وہ بیوی کے اشارۂ ابرو پر چلنا سیکھ لیں تو فوری طور پر انہیں شادی کر لینی چاہیے۔

شہزادی نور بانو۔ پاکپتن شریف

☺ زین جی! شادی کے بعد نئی دلہن سسرالی متحد پارٹی کا سامنا کس طرح کر سکتی ہے؟

✎ ارے شہزادی صاحبہ! آپ کے آگے تو سب رعایا کی طرح جھک جائیں گے۔ بس ذرا صبر کے ساتھ سب کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

سائرہ علی نور جہاں۔ میاں چنوں

☺ زین بھائی! یہ اکثر گھوڑے بیچ کر سونے والے گدھوں کی فکر کیوں نہیں کرتے؟

✎ نور جہاں صاحبہ! آپ کو نہیں پتا، سویا مرا برابر ہوتا ہے۔ فکر کیسے کر سکتے ہیں۔

مسز عندلیب چوہدری۔ کتووال

☺ بھائی زین! ذرا مجھے یہ تو بتا دیں کہ میاں جانی کا گھر کا خرچہ دیتے وقت رنگ کیوں بدل جاتا ہے؟

✎ چوہدرائن جی! مجھے لگتا ہے کہ چوہدری جی کو دوسری والی کو بھی خرچہ دینا پڑتا ہے۔

جل پری۔ نیلم، کشمیر

☺ میں بھی خریدار ہوں
میں بھی خریدوں گا
جلدی سے بتایئے کیا؟

✍ پری صاحبہ! دال دلیا اور کیا۔

لاریب۔ گھوکی

☺ زین بھائی! کیا صرف دل والے ہی دلہنیا لے کر جاتے ہیں؟

✍ نہیں پیاری بہن! ایسا نہیں ہے۔ ماں بہنوں والے بھی دلہنیا لے جاتے ہیں۔

شہروز شیری خان۔ کراچی

☺ زین! شادی میں جوتا چھپائی کیوں ہوتی ہے؟

✍ بہن طاہرہ! بارش زوروں پر ہو تو گھر کی گھنٹی میں کرنٹ چھوڑ دیا کریں۔

عالمہ شاہ۔ ملتان

☺ زین بھائی! میرے وہ (منگیتر) سہمے سہمے سے کیوں نظر آتے ہیں؟

✍ اچھی عالمہ! ایک تو آپ کے نام کا اثر ہے۔ دوسرے وہ مالی اور تعلیمی دونوں جگہ آپ سے بہت ابتر نظر آتے ہیں۔

✍ شیری صاحب آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ یہ سب لوٹ مار کے باعزت طریقے ہیں۔

شکیلا۔ بابے دی کوٹلی

☺ زین جی! خالص محبت کہاں ملتی ہے؟

✍ بابے دی کوٹلی میں۔

طاہرہ ندیم۔ دھرم پورہ۔ لاہور

☺ بھائی جان! مجھے جلدی سے بارش میں مہمان بھگانے کا سب سے آسان طریقہ بتادیں؟

شاہدہ طلعت۔ خانیوال

☺ زین بھائی!، مجھے سمجھ نہیں آتا کہ وہ میری ایک نہیں سنتے؟

✍ بہنا! ایک ہی نہیں سنتے نا، باقی تو سب سن لیتے ہیں۔

شاہانہ خان۔ کراچی

☺ زین جی! ایک بات تو بتائیں۔ وہ مجھے ناخن کیوں نہیں بڑھانے دیتے؟

✎ آخر وہ بھی کیا کریں۔ اپنی مرہم پٹی کروا کروا کر تھک جو چکے ہیں۔

تسنیم جہاں۔ جہانیاں

☺ محبت کا سب سے خوبصورت تحفہ کیا ہونا چاہیے؟

✎ صرف پھول۔

سدرہ انور علی۔ جھنگ، صدر

☺ زین بھائی! لوگ اکثر فیل ہو جاتے ہیں۔ جلدی سے بتائیں، کس امتحان میں؟

✎ بی اے (کامرس) کے امتحان میں یا اکاؤنٹنگ کے پرچے میں بھی اکثر فیل ہو جاتے ہیں۔

حسن آراء۔ پھول نگر

☺ بھیا! یہ تو بتا دیں کہ وہ اکثر گھر کا رستہ کیوں بھول جاتے ہیں؟

✎ اُن کی عینک چینج کرا دیں۔ دس سال سے نمبر بدلنے کے باوجود بھی وہی چشمہ لگائے گھومتے ہیں۔

ماہ نور خان زادہ۔ کراچی

☺ زین صاحب! جہاں جہاں میں جاتی ہوں 'چاند' میرے پیچھے پیچھے کیوں چلا آتا ہے۔ آپ اسے سمجھا دیں گے؟

✎ ارے ہم تو ایسا سمجھائیں گے کہ وہ بھی کیا یاد کرے گا۔ ابھی جاتے ہیں اس کی اماں سے شکایت کرنے۔

حسنین علی تابش۔ چیچہ وطنی

☺ زین بھائی! سندیسے آتے ہیں۔ کیوں؟

✎ اگر مالک مکان کو کرایہ دینے میں تنگ کرو گے تو سندیسے ہی آئیں گے پھول تو آنے سے رہے۔

حسینہ، زرینہ۔ ٹنڈو آدم

☺ بھیا جی! دل کے داغ دھونے کے لیے کون سا صابن استعمال کرنا چاہیے؟

✎ دل کے داغ دھونے کے لیے ہمیشہ برین سوپ استعمال کرنا چاہیے۔

سبرینہ کیف۔ اسلام آباد

☺ زین جی! وہ وقت کب آئے گا جب لڑکیاں لڑکوں کو بیاہ کر لائیں گی؟

✎ محترمہ! لگتا ہے آپ اپنے اردگرد کے ماحول پر دھیان نہیں دیتیں۔ اس طرح کے کیس تو اب عام ہو چکے ہیں۔

افسری خانم۔ گولی مار، کراچی

☺ چندا! مجھے بس اتنا بتا دو کہ میری سہیلی کا میاں چور ہے۔ یہ میرے 'اُن' کو کیسے پتا چل گیا؟

✎ افسری جی! کہیں سہیلی کے زیورات آپ کے ''اُن'' کے محلے میں تو نہیں بیچ آیا اُن کا شوہر۔

پرنسز عائمہ اشتیاق۔ مرید کے

☺ زین جی! میری سالگرہ والے دن سارے گھر والے ایک دوسرے سے جھگڑنے کیوں لگتے ہیں؟

✎ پرنسز صاحبہ! اس کی وجہ آپ کی وہ بڑی بڑی خواہشات ہیں۔ جو آپ سالگرہ والے دن دھونس دے کر سب سے پوری کرانا چاہتی ہیں۔ ☆☆

'یہ ہوئی نا بات'

کوپن برائے

مارچ 2015ء

نام: ____________

پتا: ____________

صبیح محسن

مکان خالی ہے

ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ موصوف صرف ہمیں ہی کرائے کی چوٹ دے گئے ہیں، لیکن جب صبح دودھ والے نے اوپر تالا لگا دیکھ کر ہم سے پوچھا کہ اوپر والے کہاں گئے تو یہ انکشاف ہوا کہ اس کے روپے بھی ڈوبے ہیں۔ ابھی ہم اسے صبر کی تلقین ہی......

ایک شخص کی حکایت پُر لطف، وہ اپنا مکان کرائے پر دینا چاہتا تھا

مشہور ہے کہ ابدا اچھا بد نام برا کچھ یہی حال مالکان مکان کا ہے۔ افسانہ نگاروں نے کرایہ داروں کا خون چوس کر محل کھڑے کرنے کے افسانے لکھے اور مالک مکان کو سرمایہ دارانہ نظام کا نمائندہ بنا تا فلم بنانے والوں نے۔ بے سہارا بیوہ کو کرایہ نہ دینے پر اپنے یتیم بچوں کے ساتھ بے گھر کر دیے جانے کے پُرسوز مناظر سے اپنی فلموں کو مزین کیا اور شائقین کو آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔

پھر زمانہ بدلا، حالات بدلے، انداز بدلے اب نہ مالک مکان ہیں نہ وہ پہلا سا طنطنہ باقی ہے، اور نہ دبدبہ۔ ہم نے کراچی میں بہتوں کو دیکھا ہے کہ وہ اچھے خاصے تندرست نوجوان تھے کہ آن کی آن میں چہرے پر جھریاں ابھر آئیں، کمر جھک گئی، آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ مکان بنوالیا ہے سو اب کسی ٹیکسیشن ڈپارٹمنٹ میں چکر لگاتے ہیں اور کبھی عدالت کے یہ نادہندہ کرایہ دار کے نام حکم نامہ اخراج نکلواتے ہیں تو فوراً اسٹے آرڈر لے بیٹھتا ہے۔ یہ ڈال ڈال تو وہ پات پات پہ، اسی سے یہ حال زار ہوا ہے۔

یہ سب کچھ لیکن ان افسانوں اور فلموں کی بدولت اب بھی مالک مکان کا لفظ زبان پر آتے ہی ذہن میں خود غرضی اور بے دردی کی تصویر ابھر آتی ہے۔ آیئے آج اس تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیے۔

ایک عرصے تک کراچی میں رنگ برنگی رہائش گاہوں میں جن میں سرونٹ کوارٹر سے لے کر ڈیڑھ کمرے کے فلیٹ اور مہاجر کالونی کے ''سوئمنگ پول'' والے مکان سب ہی شامل تھے۔ کرائے دار کی حیثیت سے رہنے کے بعد کچھ رقم گاڑھے پسینے کی کمائی سے پس انداز کر کے اور باقی بڑی بھاگ دوڑ اور کوشش سے ہاؤس بلڈنگ اور فنانس کارپوریشن سے قرض لے کر ایک چھوٹا سا مکان ہم نے بھی بنوا ڈالا۔

مکان مختصر مگر دو منزلہ اسی ارادے سے بنایا تھا نچلے حصے میں تو ہم خود رہیں گے اوپر کی منزل کرائے پر اٹھا دیں گے۔

ایک منزل کو کرائے پر لگاتا اس لیے ضروری تھا کہ جب ہم نے اس رقم کا حساب لگایا جو ہمیں کارپوریشن کے قرض کی قسطوں، پراپرٹی ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، واٹر ٹیکس اور الم غلم ٹیکس کے طور پر ادا کرنی تھی تو معلوم ہوا غالب کی تنخواہ میں سے تو ساہوکار صرف تنہائی کا شریک ہوا تھا، ہماری تو پوری تنخواہ کے حق دار ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن، ڈپارٹمنٹ آف ٹیکنیشن، میونسپل کارپوریشن اور کے ڈی اے بن چکے ہیں۔ مشاعرہ تو ان میں بٹ جاتا، اپنا گزارا پھر کس طرح ہوتا؟

اس مسئلے کا حل ہمیں صرف یہی نظر آیا کہ اوپر کا حصہ کرائے پر چڑھا دیں چونکہ ہم خود عرصے تک کرایہ دار رہ چکے تھے اس لیے کرایہ بہت ہی مناسب اور جائز رکھا۔ گتے کے ایک ٹکڑے پر نہایت ہی خوش خط اردو میں ''مکان کرائے کے لیے خالی ہے'' اور انگریزی میں ''TOLET'' لکھوا کر نمایاں جگہ پر آویزاں کر دیا۔

مکانوں کی شدید قلت کے متعلق جو کچھ اب تک سنتے آئے تھے اس کے پیش نظر ہمیں یقین تھا کہ اس کے بورڈ لگتے ہی مکان کرائے پر لینے کے لیے امیدوار قطار در قطار آنا شروع ہو جائیں گے اور پھر ہم کے ڈی اے کی طرح اعلان کریں گے کہ آپ حضرات اپنی درخواستیں جمع کروا دیں۔ فلاں تاریخ کو جملہ امیدواران کی موجودگی میں بذریعہ قرعہ اندازی یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ مکان کس خوش قسمت کو کرائے پر دیا جائے۔ ہمارا خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں نکلا دوسرے دن سے مکان دیکھنے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

ایک صاحب آئے، مکان کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا۔ ہر کمرے میں گئے۔ دروازے اور کھڑکیوں کے پٹ کھول کر اور لگا کر دیکھے، لائٹ جلا بجھا کر اپنی تشفی کی۔ نل کھول کر پانی دیکھا اور پانی کی دھار دیکھی۔ جب ہر چیز درست نکلی تو وہ مسکرائے اور بولے۔

''خوب بنایا ہے صاحب آپ نے یہ مکان۔''

ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ ابھی کہیں گے کہ میں ابھی جا کر اپنا اسباب لے آتا ہوں لیکن یوں ہوا اس طویل معائنے کے بعد انہوں نے کرایہ پوچھا ہم نے بتایا۔ ان کے چہرے کا رنگ کچھ بدلہ پیشانی پر سلوٹیں ابھریں، پھر بولے کہ کچھ کم نہیں ہو سکتا؟ ہم نے معذوری ظاہر کی آس پاس کے مکانوں کی مثالیں دیں جن میں گنجائش ہمارے مکان سے کم لیکن کرایہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔

یہ بھی واضح ظاہر کر دیا کہ ایڈوانس یا ڈپازٹ اس لیے طلب نہیں کریں گے کہ جب ہم خود کرایہ دار تھے تو ان مطالبوں کو مالک مکان کا بہت بڑا ظلم گردانتے تھے۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولے ''آپ نے فرش پر ٹائل نہیں لگوائے، سیدھا سادہ سیمنٹ کا فرش تو بہت ہی برا لگتا ہے۔ ابھی ہم کچھ کہہ ہی نہ پائے تھے وہ پھر بول اٹھے ''اور یہ غسل خانہ ہے اتنا چھوٹا! اس میں تو آدمی کا دم ہی گھٹ جائے۔''

لیجیے ایک گردش میں تری چشم سیاہ سب خراب!

......☆☆☆......

رات کے کوئی دس بجے ہوں گے ہم کپڑے تبدیل کر کے سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم باہر نکلے تو ایک صاحب اور ایک خاتون اور ڈھائی تین سال کی ایک بچی کے ساتھ کھڑے تھے اوپر کی منزل کی طرف اشارہ کر کے مسکرا کر بولے۔ ''ذرا مکان دیکھنا تھا۔''

اس بے وقت کی آمد پر ہمیں کوفت تو بہت ہوئی مگر چہرے پر زبردستی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے انہیں مکان دکھایا۔ حسبِ معمول انہیں بھی ہر چیز بڑی پسند آئی۔ دیواروں، کھڑکیوں اور دروازوں کے رنگوں

کے امتزاج کو دیکھ کر انہوں نے ہمارے ستھرے ذوق کی بڑی تعریف کی۔

پھر موضوع ''مقطعِ والی بات'' یعنی کرائے کی طرف آیا تھا۔ یہ مرحلہ بھی بڑی عافیت کے ساتھ طے ہو گیا بلکہ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس خوش سلیقگی کے ساتھ بنائے گئے مکان کے لیے تو یہ کرایہ بہت کم ہے۔

ہم نے یہ سُن کر خدا کا شکر ادا کیا اور دل میں سوچا کہ آج رات کو دیر تک جاگنا بیکار نہیں جائے گا، مگر......

جی ہاں، ایک ''مگر'' یہاں بھی نکل آیا اور وہ کہنے لگے کہ مکان تو آپ کا بہت خوب ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اوپر کی منزل پر ہے اور آپ نے ایک کمرے کے آگے بالکونی بھی دے رکھی ہے۔

پھر انہوں نے وضاحت کی اور بولے۔ ''دیکھیے نا! یہ ہماری بچّی جو ہے، یہ بڑی شریر ہے، ڈر ہے کہیں شرارت میں اس بالکونی سے نہ گر پڑے۔ ویسے مکان ہمیں بہت پسند ہے، کرایہ بھی مناسب ہے۔ اگر گراؤنڈ فلور پر ہوتا تو ہم ضرور لے لیتے۔''

لیجیے صاحب، بات ختم، لیکن ایک عقدہ آج تک ہم سے نہیں کھل سکا، آپ ہی کچھ روشنی ڈالیں۔ یہ تو انہیں پہلے ہی نظر آ گیا ہو گا کہ مکان اوپر کی منزل کا ہے اور بالکونی بھی باہر سڑک سے ہی نظر آ جاتی ہے تو پھر ان حضرت کو اگر واقعی مکان صرف اس لیے ناپسند ہوا کہ وہ اوپر کی منزل پر ہے اور اس میں بالکونی بھی ہے تو پھر انہوں نے رلت گئے ہمارے یہاں آنے کی، بیسیوں سیڑھیاں طے کر کے اوپر جانے کی اور آدھ گھنٹے تک مکان کا تفصیلی جائزہ لینے کی زحمت ہی کیوں کی آخر؟ ہمیں تو یقین ہے کہ وہ اپنی زبان سے کچھ ہی کہیں، دراصل انہیں بھی مقطع والی بات ہی بُری لگی تھی۔

ایک دن ایک فیشن ایبل جوڑا گھر دیکھنے آیا۔ بڑی دیر تک دونوں بحث کرتے رہے کہ کون سا کمرا ڈرائنگ روم کے لیے مناسب رہے گا اور کون سا کمرا ڈائننگ روم کے لیے۔ ہم خاموشی سے الگ کھڑے ان کی باتیں سُنتے رہے۔ آخر وہ ہماری جانب متوجہ ہوئے اور بولے۔

''جناب مکان تو سمجھیے ہم نے لے لیا۔ کرایہ ورایہ سب ٹھیک ہے۔'' ''صرف دو چیزوں کی کمی ہے، ایک تو گیزر لگوا دیں، دوسرے یہ کہ اس برآمدے میں بھی ایک واش بیسن ہونا چاہیے۔''

''TOLET'' کا بورڈ لگائے کئی ہفتے ہو چکے تھے اور نتیجہ صفر ہی رہا تھا، اس لیے ہم نے ان صاحب بہادر کی ان دونوں فرمائشوں کو مالی طور پر دیوالیہ ہونے کے باوجود پورا کرنے کی ہامی بھر لی۔

وہ بولے۔ ''دیکھیے آج اٹھائیس تاریخ ہے، ہم پہلی کو یہاں منتقل ہونا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے یہ دونوں کام کرا دیں۔'' پھر وہ اپنا فون نمبر دے کر چلے گئے۔

ان کے رخصت ہوتے ہی ہم نے ایک دوست سے قرض لیا اور کہا کہ کرایہ ملتے ہی ادا کر دیں گے، پھر ہم گیزر خرید کر لائے، پلمبر کے پاس گئے اور اسے کچھ ایڈوانس دیا تا کہ وہ واش بیسن اور گیزر لگانے کا کام شروع کرے۔

ہماری دانست میں تو مسئلہ طے پا چکا تھا، اس لیے دماغ کو بڑا سکون ملا، لیکن اس پُرسکون دَور کی مدت بڑی ہی مختصر نکلی۔

پہلی کو جب وہ حضرت نہیں آئے تو ہم سمجھے کہ شاید اچانک کوئی ایسی مجبوری آ گئی ہو گی جس کی بنا پر انہیں آج منتقل ہونے کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا، مگر جب ایک ہفتہ گزر گیا اور انہوں نے کوئی خبر نہ لی تو پھر ہمارے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ ہم نے انہیں فون کیا تو معلوم ہوا کہ جس دن وہ ہمارا مکان دیکھ کر گئے تھے، اسی شام انہیں ایک اور مکان مل گیا جو اُن کی ضرورتوں کے اعتبار سے زیادہ

موزوں تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ اب پلمبر کا بقیہ بل ادا کرنے کے لیے کسی سے قرضہ لیں تو کس برتے پر!

اب ہماری طبیعت اُوب گئی تھی۔ روزانہ آٹھ دس خواتین و حضرات مکان دیکھنے آتے، ہم مکان کی خوبیاں رَٹے ہوئے سبق کی طرح دُہراتے، وہ اس میں کوئی نہ کوئی عیب یا کمی نکال کر چلے جاتے اور ہم جل بھن کر کباب ہوجاتے۔

دوستوں نے مشورہ دیا کہ اخبار میں اشتہار دو اور کسی اسٹیٹ ایجنٹ سے بھی ملو، یوں صرف بورڈ لگا دیکھ کر جو لوگ چلے آتے ہیں ان میں سے اکثر محض تفریحاً یا اس خیال سے آتے ہیں کہ کرایہ بہت کم ہوا تو لے لیں گے۔ وہ ضرورت مند نہیں ہوتے۔

ہم نے یہ نسخہ بھی آزمایا۔ فوری طور پر تو نہیں، لیکن بالآخر یہ ترکیب کارگر رہی۔ ایک صاحب واقعی مکان میں منتقل ہوگئے اور انہوں نے ایک ماہ کا کرایہ بھی دے دیا جو ہم نے بطور کمیشن، اسٹیٹ ایجنٹ کی نذر کردیا۔ دوسرے مہینے ہمارے کرائے دار خود ہی بلا مانگے پہلی تاریخ کو کرایہ دے گئے۔ ہم بڑے خوش ہوئے کہ دیر آید درست آید۔ اتنے انتظار اور پریشانی کے بعد کرائے دار تو شریف مل گئے۔

تیسرے مہینے جب دس تاریخ تک کرایہ نہیں ملا تو ہم نے دبی زبان میں تقاضہ کیا تو کہنے لگے۔ ''صاحب میں خود شرمندہ ہوں، بات یہ ہے کہ میں تجارت پیشہ آدمی ہوں، ابھی مال کی ایک کھیپ وصول ہوئی ہے۔ اس کی قیمت ادا کرنے کے سبب کچھ تنگی ہوگئی ہے۔ آپ فکر نہ کریں، بس دو چار دن میں چند مستقل گاہک اپنے بل ادا کرنے والے ہیں۔ رقم ملتے ہی آپ کا کرایہ لے کر خود حاضر ہوجاؤں گا۔ آپ زحمت نہ کریں۔''

اسی طرح دو چار دن، دو چار دن ہوتے ہوتے پورا مہینہ نکل گیا۔ قسمت کی بات ایک عزیز کی تقریب شادی میں ہم سب مدعو تھے، لوٹے تو اوپر کی منزل خالی پڑی تھی۔ کرائے دار صاحب مع اپنے ساز و سامان کے غائب تھے۔

ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ موصوف صرف ہمیں ہی کرائے کی چوٹ دے گئے ہیں، لیکن جب صبح دودھ والے نے اوپر تالا لگا دیکھ کر ہم سے پوچھا کہ اوپر والے کہاں گئے تو یہ انکشاف ہوا کہ اس کے روپے بھی ڈوبے ہیں۔ ابھی ہم اسے صبر کی تلقین ہی کررہے تھے کہ اخبار والا اور ساتھ ہی جمعدار بھی آپہنچا۔ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ

''تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل!''

دوستوں سے جب تذکرہ کیا تو بجائے ہمدردی کے اُلٹا سب نے مذاق اُڑایا۔ ''اور نہ لوڈ پاڑث! بڑے انسانیت کے علم بردار بنے پھرتے ہو، آیا مزہ اب؟''

ہم میں اب اتنی شکست باقی نہ تھی کہ ایک بار پھر اس صبر آزما مہم کو شروع کریں جسے کرائے دار کی تلاش میں کہا جاتا ہے اس لیے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پورے مکان میں خود ہی رہیں۔

اب ہمارے گھر میں دو ڈرائنگ روم ہیں، ایک نیچے دوسرا بالائی منزل پر، دو کھانے کے کمرے ہیں، ایک نچلی منزل میں دوسرا بالائی منزل پر اور اوپر نیچے سب ملا کر چھ بیڈ روم ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے فراغت ہی فراغت ہے، لیکن جب اخبار میں پراپرٹی ٹیکس کی وصولیابی کی مہم یا واٹر ٹیکس کی عدم ادائیگی کی صورت میں پانی کے کنکشن کاٹ دیے جانے کی کوئی خبر نظر آجاتی ہے تو اچانک ذہن سُن ہوجاتا ہے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے اور اوپر کی منزل کے بیڈ روم میں لیٹے لیٹے ہمیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ہم فضا میں تیرتے ہوئے نچلی منزل کے بیڈ روم سے بھی نیچے کہیں تاریکیوں میں ڈوبتے چلے جارہے ہوں۔

......☆☆☆......

لولی وڈ بولی وڈ

ڈی۔ خان

فواد خان، ایشوریہ کے ساتھ

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق لولی وڈ چاکلیٹ ہیرو فواد خان کو بہترین دریافت 2014ء کا فلم فیئر ایوارڈ ملنے کے بعد اُن کی مانگ میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے۔ فواد خان، کرن جوہر کی آنے والی فلم ''اے دل ہے مشکل'' میں بولی وڈ کوئن ایشوریا رائے بچن کے ساتھ کام کررہے ہیں۔ اس میگا فلم کی کاسٹ میں رنبیر کپور اور انوشکا شرما پہلے سے موجود ہیں۔ گڈ لک 'بہاول پور ایکسپریس' لگے رہو۔

علی ظفر کا APS کے لیے Tribute

آرمی پبلک اسکول پشاور میں ہونے والے سانحے پر علی ظفر نے اُن شہید بچوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے نیا سونگ تیار کرلیا ہے۔ ''اڑیں گے'' جو کہ بہت جلد پیش کردیا جائے گا۔ اس Tribute سونگ کی خاص بات یہ ہے کہ اس سونگ میں لگ بھگ پچاس کے قریب سیلیبریٹیز نظر آئیں گے۔

BABY میں کام کرنے والے پاکستانی BANNED

بولی وڈ نیو ریلیز BABY کو حال ہی میں لولی وڈ سنسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس فلم میں پاکستان کے نامور اداکار میکال ذوالفقار اور پشاور ٹی وی کے رشید ناز نے بھی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس فلم میں پاکستان کے خلاف کہانی کا تانا بانا بنایا گیا ہے۔ اس لیے رشید ناز اور میکال ذوالفقار،

دونوں کو پاکستان میں شوبز سرگرمیوں کے لیے BANNED کردیا گیا ہے جبکہ اس فلم کے ڈائریکٹر نیرج پانڈے کا کہنا ہے کہ یہ فلم ایک منفرد کہانی پر مشتمل فلم ہے جو کہ پاکستان کے خلاف قطعاً نہیں ہے۔

تینوں خان، گولڈن ہو گئے

ارے گھبرائیے نہیں۔ 1965ء میں پیدا ہونے والے بولی وڈ کنگز اس سال اپنی زندگی کی 50 بہاریں دیکھ چکے اور گولڈن جوبلی منا رہے ہیں۔ تینوں خانوں نے مسلسل کام کیا اور اب بھی بولی وڈ، دنیا کی دوسری سب سے بڑی فلم انڈسٹری پر راج کر رہے ہیں۔ کک، سلمان خان، ہیپی نیو ایئر شاہ رخ خان اور عامر خان کی P.K نے 2014ء میں بزنس کے نئے ریکارڈ بنائے اور تینوں نے اپنی برتری برقرار رکھی۔

فتور: ایک لو اسٹوری

راہول بھٹ جو ان دنوں اپنی آنے والی فلم فتور کی کشمیر میں تیزی سے عکس بندی میں مصروف ہیں۔ انہوں نے اِس فلم کے حوالے سے اُڑنے والی اِن افواہوں کی سختی سے تردید کی ہے کہ فلم دہشت گردی کے موضوع پر بن رہی ہے۔ راہول نے کھلے لفظوں میں کہا کہ یہ ایک رومانوی، ایکشن فلم ہے، اس لیے اس کے موضوع کو بے جا تنقید کر کے منفی پروپیگنڈے سے پرہیز کیا جائے۔
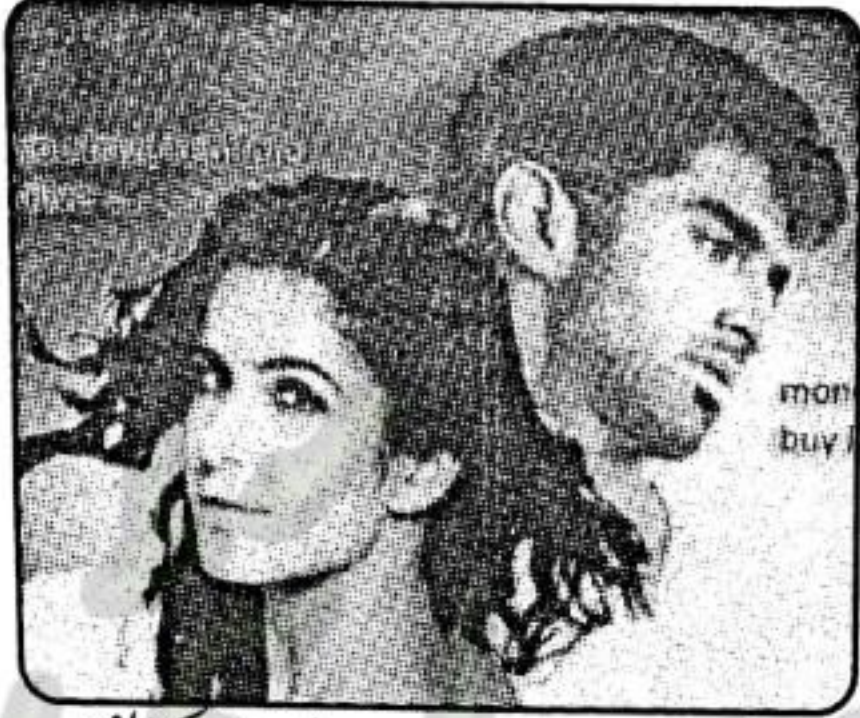
ودیا بالن بے نظیر بھٹو کے کردار میں

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق، بولی وڈ کی بہترین اداکارہ ودیا بالن کو سابق وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کا کردار ادا کرنے کی پیشکش کی گئی ہے۔ امید ہے چیلنجنگ کرداروں میں بخوبی ڈھل جانے والی ودیا اس کردار کو قبول کرنے کی حامی بھر لیں گی۔ ودیا اس سے

پہلے عشقیا، بھول بھلیاں، ڈرٹی پکچر اور کہانی میں بہترین کردارنگاری کا مظاہرہ پیش کرچکی ہیں۔

مائی سیکنڈ ہینڈ ہزبینڈ

بولی وڈ کی آنے والی فلم مائی سیکنڈ ہینڈ ہزبینڈ میں ہیروئن کارول پلے کرنے والی ہیروئن گیتا بسرا نے بتایا ہے کہ اُن کی اِس فلم میں اُن کا رول اُسی طرح کا لکھا گیا ہے جو 1997ء میں سری دیوی نے فلم ''جدائی'' میں ادا کیا تھا۔ کہاں سری دیوی، نمبرون ہیروئن، صرف نام ہی کی نہیں۔ بلکہ آج بھی لوگ اُنہیں فلم میں دیکھنے میں انٹرسٹڈ ہیں اور کہاں گیتا بسترا۔ خیر، خدا خیر کرے۔ گیتا کے ہزبینڈ سوری سیکنڈ ہینڈ ہزبینڈ کارول گپی گریوال عمدگی سے نبھارہے ہیں جبکہ اس فلم کو سمیپ کانگ نے ڈائریکٹ کیا۔

قصہ 20 فروری سے

عرفان خان اور ٹیشا چوپڑا اسٹارر فلم قصہ 20 فروری کو نمائش کے لیے پیش کردی جائے گی۔ اس فلم کو نیف ڈیک (NFDC) نے بنایا ہے۔ انوپ سنگھ کی ڈائریکشن میں بننے والی یہ فلم انڈیا کے مخصوص شہروں میں ہی ریلیز ہوگی، جن میں دلّی، ممبئی، چنائی، کول کتہ اور چندی گڑھ شامل ہیں۔

امیتابھ بچن کا نیا روپ

لیجیے ساتھیو! اپنے امیتابھ بچن کے کرنے کے لائق بس ایک ہی کام رہ گیا تھا وہ بھی اس برس ہونے والے ورلڈکپ 2015ء میں مکمل ہوجائے گا۔ امیت جی ورلڈکپ 2015ء کی کمنٹری کریں گے۔ پوری امید ہے کہ امیت جی اس نئے کام میں بھی پبلک کو محظوظ کرنے میں کامیاب رہیں گے۔
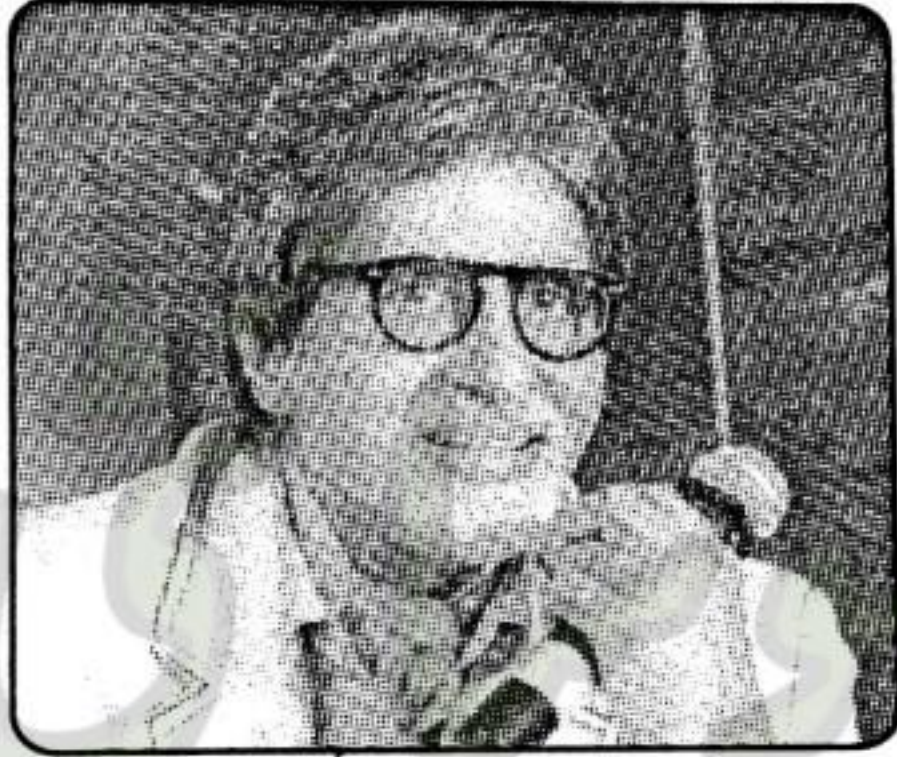
منیشا کی واپسی

بولی وڈ کی نمبرون ہیروئن منیشا کوئرالہ نے ایک عرصے بعد کسی فلمی تقریب میں شرکت کی۔ کینسر کے خلاف

جنگ میں فتح پانے والی 44 سالہ منیشا کوئرالہ نے گزشتہ ماہ انڈیا کے سب سے بڑے ایوارڈ 'فلم فیئر' میں شرکت کر کے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا کہ اس تقریب میں آ کر مجھے لگا میں پھر سے بولی وڈ کا حصہ بن گئی ہوں اور میرا پھر سے اس انڈسٹری کے ساتھ بورن بیک، کم بیک ہو رہا ہے۔'' یاد رہے منیشا کوئرالہ اپنی شاندار اداکاری سے نجی فلم بمبئی اور خاموشی پر بہترین اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔

سنی لیون کا نیا آئٹم سونگ

بولی وڈ بے بی ڈول فیم سنی لیون آنے والی فلم 'لیلا' میں بولی وڈ بلاک بسٹر فلم ہم دل دے چکے صنم میں سلمان اور ایشوریہ پر فلمایا، چارٹ بسٹر سونگ ڈھولی تارو ڈھول باجے پر پرفارم کر رہی ہیں۔ سنی اس سے پہلے بے بی ڈول پر پوری دنیا کو نچا چکی ہیں۔ امید ہے سنی اِس بار بھی سب کو نچانے میں کامیاب رہیں گی۔

ماہِ فروری میں ریلیز ہونے والی فلمیں

6 فروری کو امیتابھ بچن، دھنوش اور اکشرا حسن کی 'شمیتابھ' اور جتن گھرانا، اوم پوری، پریم چوپڑا اور رتی اگنی ہوتری کی 'جے جوان جے کسان' ریلیز ہوں گی۔ 13 فروری کو ملکہ شراوت، نصیر الدین شاہ، جیکی شروف، سشانت سنگھ، راج پال یادو اور اوم پوری اسٹارر ڈرٹی پولیٹکس، MSG، دا میسنجر آف گاڈ!

رنبیر کپور، ارجن رام پال اور جیکولین فرنینڈس کی ROY اور سنجے چھل کی پاٹل کی پنجابی شادی ریلیز ہوں گی۔ 20 فروری کو ورون دھون، نواز الدین صدیقی، دیویا دتہ اور ہما قریشی کی سرم رگھوان

ڈائریکٹڈ بادل پور اور بائیوگرافیکل مووی پر یتھپال سنگھ A Story ریلیز ہوں گی۔ فروری کے آخری ہفتے 27 فروری کو ارشد وارثی کی کامیڈی ڈرامہ، گڈو رنگیلا اور گوندا کی Hey Bro کا مقابلہ ہوگا۔
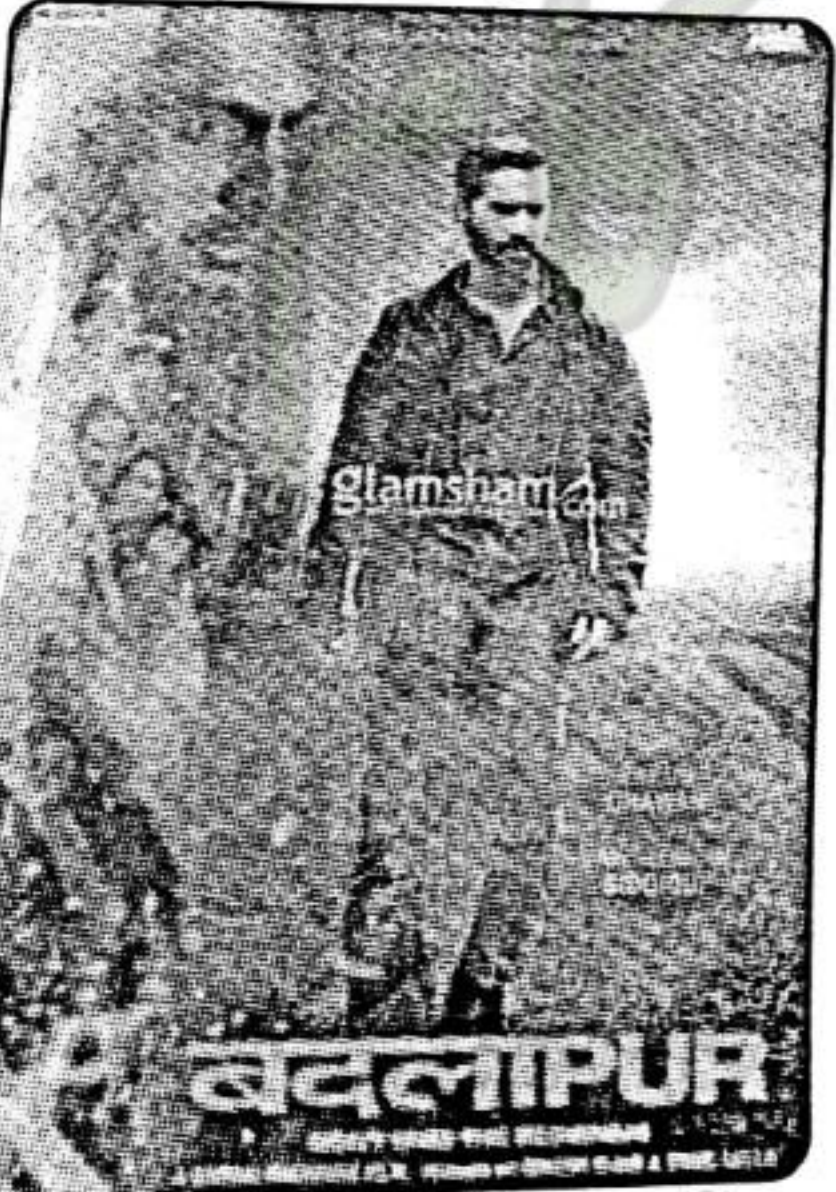
نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ان میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔اپنے مسائل لکھ بھیجیں' ہماری کوشش ہو گی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

انجم اظہار۔لالہ موسیٰ

✿ پیاری باجی! میری تین بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا ہے۔دو بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے، تیسری کی فکر ہے۔ بیٹا بھی شادی شدہ ہے۔اس کی شادی کر کے مجھے بہت دکھ پہنچا کیوں کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ خوش ہوتا ہے تو ہمیں بھول جاتا ہے حالانکہ جب وہ میکے چلی جاتی ہے تو اس کا ذکر تک نہیں کرتا۔ بہنوں کو گھر بلاتا ہے، ان سے گھنٹوں تک فون پہ باتیں کرتا ہے۔ چھوٹی بہن کو خریداری کروانے لے جاتا ہے۔میرے پاس بیٹھا رہتا ہے۔بیوی کے گھر آتے ہی بدل جاتا ہے۔جب سے مجھے معلوم ہوا ہے اس کی بیوی پہلے نفسیاتی مریضہ تھی، میں ڈر گئی ہوں، کہیں میرے بیٹے کو بھی پاگل نہ کر دے۔

☆ ہر ماں اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتی ہے۔اس محبت میں بیٹے کی خوشی بھی عزیز ہوتی ہے۔شادی کے بعد بیٹا بیوی کے ساتھ خوش ہے تو یہ فطری بات ہے۔ اگر ناخوش ہے تو ماں اور دیگر اہل خانہ کے لیے دکھ ہے ۔آپ کے بیٹے کا رویہ تو اچھا ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ خوش رہتے ہوئے آپ لوگوں کو بھی وقت دیتا ہے۔ وہ وقت جو بیوی کے میکے جانے کے بعد دے یا ساتھ رہتے ہوئے اس سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔رہی نفسیاتی مریضہ ہونے کی بات، تو بہت سے امراض ٹھیک ہو جاتے ہیں اور یہ یقین بھی نہیں آتا کہ ان کا شکار لوگ مشکلات میں تھے۔ بہو کے ساتھ اپنائیت محسوس کریں گی تو وہ بھی بیٹی جیسی معلوم ہو گی۔اس کے ساتھ ہی بیٹے کے بدل جانے کا احساس بھی جاتا رہے گا۔

سویرا۔کراچی

✿ باجی میں اکثر احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہوں۔کالج میں لڑکیاں بہت اچھے گھروں سے آتی ہیں میں ہی ہوں جس کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔کوئی شکایت نہیں کر سکتی، ورنہ تعلیم چھوڑنے کی بات ہوتی ہے۔آخر میرے والدین کے پاس وہ سب کچھ کیوں میسر نہیں جو دوسروں کو میسر ہے۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں جس پر فخر کر سکوں۔قیمتی تحائف سہیلیوں کو دوں اور میرے پاس ایسے موبائل فون ہوں جو متاثر کریں۔ میں اکثر خود سے سوال کرتی ہوں کہ میں غریب کیوں ہوں؟

☆ آپ کے خیال میں اچھے گھر کون سے ہوتے ہیں؟ کیا وہ جہاں قیمتی سامان ہو، بہت رقم خرچ کر کے بنائے گئے ہوں۔آپ کو کیا معلوم وہاں سکون اور خوشی ہے یا نہیں؟ اگر چھوٹے گھر میں سکون اور خوشی ہے تو وہ بڑے گھر سے زیادہ قیمتی ہو گا۔لہٰذا اب اپنے ذہن سے

بڑے چھوٹے گھر کا فرق نکال دیں۔ جہاں تک غربت کی بات ہے تو آپ کی عمر میں انسان کے پاس کچھ بھی نہ ہو، تب ہی سب کچھ ہوتا ہے دل و دماغ صحت مند ہے تو یہ تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ اگر آپ ان کا بھرپور اور اچھا استعمال کریں تو وہ سب کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے جن کی خواہش ہے۔ دراصل جو کچھ آپ محسوس کر رہی ہیں۔ وہ احساس کمتری نہیں بلکہ برتری حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ اچھی تعلیم، اچھی تربیت، اچھا اخلاق، حسن سلوک، یہ وہ باتیں ہیں جن پر آپ اور آپ کے اہل خانہ سب ہی فخر کر سکتے ہیں۔

اصغر احمد۔اوکاڑہ

باجی پہلے تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ معذوری کے باعث سرکاری ملازمت مل گئی۔ وہیل چیئر کی مدد سے اِدھر اُدھر حرکت کرتا ہوں۔ دفتر تک چھوٹا بھائی اپنی گاڑی سے چھوڑتا ہے۔ یہاں پر لوگ کام آتے ہیں۔ مجھے کمپیوٹر کی کافی معلومات ہیں۔ میرے دفتر آتے ہی لوگ باری باری اپنا کام میرے پاس لانے لگتے ہیں۔ میں اپنے کاموں کو دن کے آغاز پر ہی صرف دو گھنٹے میں ختم کر لیتا ہوں۔ سوچتا ہوں لوگ میری معذوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے کام دے جاتے ہیں۔ کیوں کہ میں انکار نہیں کر سکتا۔

☆ اپنی سوچ کو اس طرح بدل لیں کہ لوگ آپ کی قابلیت سے متاثر ہوتے ہوئے اپنا کام دے کر چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک انکار کی بات ہے تو آپ کام سے انکار نہ کریں بلکہ ان کو کام سکھائیں۔ جو بھی اپنا کام لے کر آئے اس سے کہیں کہ میں تمہیں یہ کام کرنا سکھا دیتا ہوں۔ سب نہیں تو صرف چند لوگ ضرور سیکھنے پر آمادہ ہوں گے۔ بعد میں وہ لوگ بھی سیکھنے کی خواہش کر سکتے ہیں جنہوں نے پہلے سیکھنے سے انکار کیا ہوگا۔ اس طرح وہ معلومات جو آج آپ اپنے لیے زحمت سمجھ رہے ہیں، نعمت معلوم ہوں گی۔

محمد منیر۔لاہور

میرے بیٹے کی عمر 4 سال ہے۔ اتنی سی عمر میں غیر اخلاقی اور بُری باتیں سیکھ رہا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ بچہ اس دوران گھر پر میری امی اور بھابی کے پاس ہوتا ہے۔ ایک شادی شدہ بہن بھی ساتھ رہتی ہے مجھ پر کچھ قرضہ ہے، اس لیے علیحدہ گھر نہیں لے پا رہا ہوں۔ والدہ کا اصرار ہے کہ یہ گھر تنگ ہے، الگ ہو جاؤ۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ گھر کا ماحول بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی وجہ بھائی اور بہن کے بچے ہیں۔ جو سارا دن گلیوں میں کھیلتے ہیں۔ بہن کو صفائی کا جنون ہے۔ وہ بھی چاہتی ہے کہ بچے گھر سے باہر رہیں۔ بچے کی فکر ہے، اس کو دیکھ کر اس قدر پریشان ہوں کہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ میری بیوی کا بھی خیال ہے کہ ابھی یہ چھوٹا ہے، سب کچھ بھول جائے گا، بڑا ہوگا تو ہم اچھی تربیت کریں گے۔

☆ ماہر نفسیات کے مطابق شخصی خرابیوں کی ابتداء بچپن کے ابتدائی چھ برسوں میں ہوتی ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ذہن اچھائی اور برائی کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ اس عمر کے بچوں کو اپنی مرضی پر چلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ جس طرح اور دیگر اخراجات ہو رہے ہیں، اسی طرح بچے کی تعلیم پر بھی توجہ دیتے ہوئے اچھے اسکول میں داخلہ کروائیں۔ آپ دونوں کا تعلق بھی تدریس سے ہے، اس لیے یہ کام آسانی سے کر سکتے ہیں۔ اسکول سے آنے کے بعد بچہ ماں کے ساتھ رہے۔ اس کا معمول ہو آرام کھیل اور ہوم ورک...... والدہ کی بات کو مثبت انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں تا کہ پُرسکون ماحول میں بچے کی پرورش ہو سکے۔ بھائی اور بہن کے بچوں کا خیال بھی رکھنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ بگڑنے نہ پائیں۔ بہن کے رویے پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی صفائی جس کے بعد بچوں کو گھر میں نہ آنے د[illegible] جائے، کسی حد تک مریضانہ ہے۔

☆☆☆

کچن کارنر

نادیہ طارق
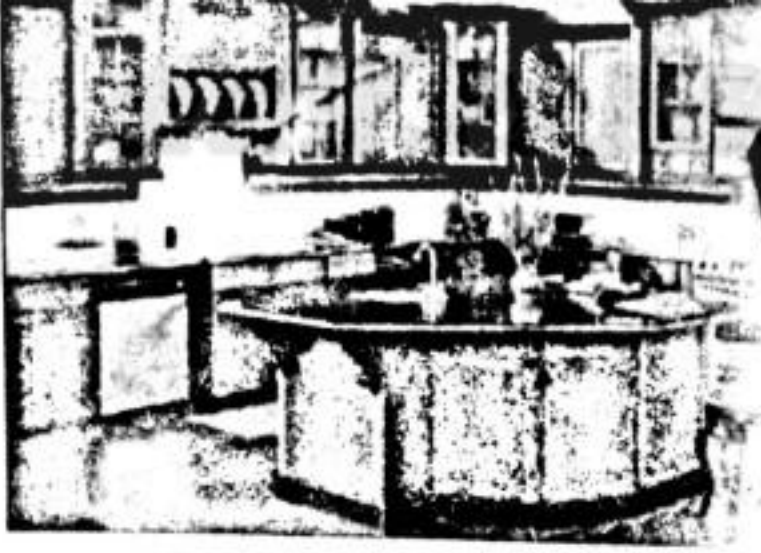
قارئین! اس ماہ موسم اپنی ٹھنڈک سے احساس دلا رہا ہے کہ اس موسم میں کچھ خاص ڈشز ڈائننگ ٹیبل کا حصہ بنائی جائیں۔ موسم کے لحاظ سے اس ماہ بھی آپ کے لیے کچھ ایسے منفرد اور لذیز کھانوں کی ریسیپیز کچن کارنر میں حاضر ہیں۔ اس ماہ کا کچن کارنر آپ کو کیسا لگا، آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اب ان ڈشز کو بنایئے اور اہلِ خانہ سے داد پایئے۔

اسپائسی مٹن پلاؤ

اجزاء

بکرے کا گوشت	ایک پیالی
پیاز	دو عدد
ہری مرچیں	چھ سے آٹھ عدد
سیاہ مرچ	حسب ضرورت
ہلدی	آدھی پیالی
سویا سوس	دو کھانے کے چمچ
ٹماٹر پیسٹ	دو چمچ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچ

ترکیب:

چاول ابال کر رکھ دیں۔ ایک فرائنگ پین میں تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز فرائی کریں۔ ساتھ میں ادرک، لہسن پیسٹ، سیاہ مرچ، ہلدی اور ہری مرچیں ڈال کر ہلکا سا فرائی کریں۔ (تقریباً ایک منٹ تک)۔

اب اس آمیزے میں بکرے کا گوشت شامل کر کے تھوڑا سا بھون لیں۔

ایک دیگچی میں گوشت اور چاول ساتھ شامل کر کے آدھا پیالی پانی ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ اسپائسی مٹن پلاؤ تیار ہے۔

گاجر کا حلوہ

اجزاء

گاجر (کدوکش کرلیں)	ڈیڑھ کلو
بادام (باریک کٹے ہوئے	حسب ضرورت
اخروٹ (چھلے ہوئے اور باریک کٹے ہوئے)	آدھی پیالی
چھوٹی الائچی (باریک کچل لیں)	آٹھ عدد
گھی	ایک پیالی
کھویا	ایک یا ڈیڑھ پاؤ
چینی	ڈیڑھ پیالی
دودھ	ڈیڑھ کلو

ترکیب:

ایک پتیلے میں گاجر اور دودھ ڈال کر پکائیں۔ جب دودھ خشک ہوجائے تو گاجروں کو الگ پیالے میں نکال لیں اور اسی پتیلے میں گھی گرم کرلیں۔ جب گھی گرم ہو جائے تو الائچی ڈال لیں۔ خوشبو آنے لگے تو گاجریں ڈال دیں۔ چمچ ہلاتے ہوئے بھونیں۔ جب گھی الگ ہونے لگے تو چینی اور کھویا ڈال کر بھونیں جب پانی خشک ہوجائے تو حلوہ تیار ہے۔ اسے الگ برتن میں نکال لیں اور اوپر سے اخروٹ اور بادام سجادیں۔

پنیر کے کٹلٹس

اجزاء

پنیر	ایک کپ

ثابت زیرہ (بھنا ہوا) — ایک چائے کا چچ
نمک — حسب ذائقہ
سبزیوں کا تیل — تین کھانے کے چچ
ہری پیاز (چوپ کی ہوئی) — ایک چوتھائی کپ
مونگ پھلی یا کاجو (بھنے ہوئے) — ایک چوتھائی کپ

ترکیب:

پنیر کو میش کرلیں اس میں آلو، بریڈ کرمبز، لیموں کا رس، زیرہ، نمک اور ایک کھانے کا چچ تیل مکس کر دیں۔ اچھی طرح مکس کر کے اس میں ہری پیاز، کاجو یا مونگ پھلی اور ہرا دھنیا شامل کرلیں اور کٹلٹس بنا لیں۔ کٹلٹس کو اچھی طرح فرائی کر لیں۔ دونوں طرف سے براؤن ہو جائے تو ٹشو پیپر پر نکال کر اضافی تیل نچار لیں اور ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

ہاٹ چاکلیٹ کریم کوفی

اجزاء

دودھ — ایک گلاس
کوفی — ایک چائے کا چچ
کوکو پاؤڈر — ایک چائے کا چچ
چاکلیٹ — ایک کھانے کا چچ
چینی — دو چائے کے چچ
کریم — چار کھانے کے چچ

ترکیب:

دودھ کو اچھی طرح گرم کرلیں۔ ایک پیالے میں کوفی، چینی چاکلیٹ اور کریم کے ساتھ کوکو پاؤڈر ڈال کر الیکٹرک بیٹر سے پھینٹ دیں۔ جب جھاگ بن جائے تو مگ میں نکال کر اوپر سے گرم دودھ ڈال کر سرو کریں۔ مزیدار چاکلیٹ کوفی تیار ہے۔

کھجور اور شہد کا شیک

اجزاء

کھجور — آدھا پاؤ
شہد — چار سے پانچ چچ
دودھ — ایک پاؤ
چینی — ایک چمچہ
بادام — چھ یا سات عدد
پستے — چھ یا سات عدد

ترکیب:

سب سے پہلے کھجور سے گٹھلیاں الگ کر دیں۔ پھر گرینڈر میں تھوڑا سا دودھ ڈال کر تمام کھجوروں کو اچھی طرح گرینڈ کریں یا مکس کریں۔ پھر اس میں تھوڑا تھوڑا دودھ شامل کرتے جائیں اور گرینڈ کرتے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ دودھ شامل کرتے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں شہد کو بھی شامل کرتے رہیں۔

یاد رہے چینی کی مقدار کم رکھنی ہے کیوں کہ شہد اور کھجور دونوں بے حد میٹھی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد تمام چیزوں کو شامل کر کے اچھی طرح گرائنڈ کر کے کسی بھی گلاس یا جگ میں نکال لیں اور اوپر سے سجاوٹ کے لیے بادام پستے ڈال کر پیش کریں۔

بھنے بینگن کی چٹنی

اجزاء

بینگن (درمیانے) — تین عدد
پیاز — ایک عدد
پودینہ — آدھا گڈی
ہری مرچیں — 5-6 عدد
نمک — حسب ذائقہ
املی کا گودا — آدھی پیالی
لہسن — 2-3 عدد
زیرہ — ایک چمچہ
کٹی مرچ — ایک چمچہ

ترکیب:

سب سے پہلے بینگن کو اچھی طرح ہلکی آنچ پر بھون لیں اور اتنا بھونیں کہ اس کا چھلکا اتر جائے۔ پھر جب چھلکا اترنے لگے تو اچھی طرح بیگنوں کو مسل لیں۔ پیاز کو باریک کاٹ کر ان میں بینگن مکس کرلیں۔ اور پھر املی، زیرہ، کٹی مرچ، لہسن کو پیس کر اس میں شامل کر لیں۔ اور مزیدار بینگن کی چٹنی تیار ہے۔

سندھی مسالا گوشت

اجزاء

گوشت	آدھا کلو
ادرک لہسن	ایک سے دو چائے کے چمچے
پسا دھنیا	آدھا چمچہ
پسی مرچیں	ایک چمچہ
کچا پپیتا (پسا ہوا)	ایک چمچہ
دہی	آدھا کلو
ٹماٹر	دو عدد درمیانے
پیاز	ایک عدد
کڑی پتا	چھ سات عدد

ترکیب:

ایک دیگچی میں پیاز کو براؤن کر کے نکال لیں۔ پھر اُسے کسی اخبار پر پھیلا کر رکھ دیں۔ اب دیگچی میں ادرک لہسن کا پیسٹ ڈالیں اور اس کے ساتھ ساتھ گوشت، نمک اور تمام مسالے شامل کر دیں۔ پسا ہوا کچا پپیتا بھی گوشت میں ڈال کر اچھی طرح بھونیں۔ پھر اس میں دہی اور ٹماٹر فرائی کی ہوئی پیاز کو شامل کر کے مزید گوشت کو فرائی کرتے جائیں اور پھر پندرہ منٹ یا زیادہ سے زیادہ بیس منٹ کے لیے دو کپ پانی ڈال کر ڈھک کر رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے تو اس کو دوبارہ سے بھون کر اس میں کڑی پتے کا بھگار لگائیں اور دیگچی کو فوراً بند کر دیں۔ پھر چولہے سے اُتار کر پیش کریں۔

چکن پیزا

اجزاء

میدہ	دو کپ
خمیر	ایک سے ڈیڑھ چائے کے چمچے
نمک	حسب ضرورت
چینی	ایک چائے کا چمچہ
خشک دودھ	دو سے تین کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
پیزا سوس	آدھا چمچہ
موزریلا چیز	3-4 سلائس
چیڈر چیز	3-4 سلائس
چکن (بغیر ہڈی کے)	آدھا کلو
زیتون	حسب پسند
شملہ مرچ	2 عدد (کٹی ہوئی)
تیل	صرف چکنائی کے لیے

ترکیب:

ایک بڑے پیالے میں میدہ، نمک، خمیر، چینی، انڈا، خشک دودھ اور تیل ڈال کر نیم گرم پانی میں گوندھ لیں اور پھر تقریباً 35-30 منٹ تک کے لیے چھوڑ دیں۔ تیس منٹ کے بعد اس کو روٹی کی طرح گولائی میں بیل لیں۔ پھر اسے پیزا پین میں پھیلا لیں۔ روٹی ڈالنے سے پہلے پیزا پین کو تیل سے چکنا کر لیں۔

دوسری طرف چکن کو میرینیٹ کر کے فرائی کر لیں۔

اب روٹی کے اوپر پیزا سوس ڈال لیں۔ سوس کو پوری روٹی پر اچھی طرح پھیلائیں اور اس کی موٹی تہہ جمالیں۔ اب شملہ مرچ، زیتون اور بون لیس چکن پورے پیزا پر پھیلا دیں۔ پیزا کو پہلے سے گرم اوون میں رکھ کر 150 ڈگری پر رکھیں۔ پیزا تیار ہونے میں تقریباً 25-20 منٹ لے گا مگر اس کے بیچ میں آپ اسے چیک ضرور کریں کیونکہ مختلف اوون کے درجہ حرارت بھی مختلف ہوتے ہیں۔

چکن پکوڑے

اجزاء

چکن (لمبائی میں کٹی ہوئی)	آدھا کلو
کارن فلور	ایک کپ
میدہ	ڈیڑھ کپ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

کارن فلور، میدہ، نمک، کالی مرچ اور انڈا......سب کو گرائنڈر میں ڈال کر تھوڑا پانی ملا کر گرائنڈ کر کے پیسٹ بنالیں۔ آخر میں سویا سوس بھی ڈال دیں۔ چکن کے ٹکڑے اس آمیزے میں ڈبو کر گرم تیل میں ڈیپ فرائی کریں اور گارلک مایونیز کے ساتھ گرما گرم پیش کریں۔

☆☆☆

حکیم جی!

محمد رضوان حکیم

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر...... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اُس نے شفاء بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقہء علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

جوڑوں کا درد گٹھیا اور عرق النساء کے لیے

جیسے جیسے انسان بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے مختلف تکالیف اور کمزوریاں اسے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔ ان تکالیف میں جوڑوں کی تکالیف سب سے عام ہیں۔ جوڑوں کی تکالیف (جنہیں Arthritis بھی کہتے ہیں) کی تین اہم اقسام ہیں۔

1 - ہڈیوں کا آرتھرائٹس Osteo Arthritis میں ہڈیوں کے بافتے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتے ہیں جس کے نتیجے میں ہڈیوں میں

کھنچاؤ، درد، حرکت میں دشواری اور انگلیوں کے اطراف میں سختی پیدا ہوتی ہے اور یہ علامات آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہیں۔

2- جوڑوں کی سوزش Rheumatoid Arthritis میں جوڑ سرخ، گرم اور سوج جاتے ہیں اور شدید کمزوری، کھنچاؤ، درد، نیند اور بھوک کی کمی جیسی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔

3- گاؤٹ Gout میں جوڑوں میں شدید درد، کھنچاؤ اور سوزش یورک ایسڈ کے بڑھ جانے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔

بڑھاپے کا ایک اور تکلیف دہ مرض عرق النساء ہے۔ جس میں کمر سے لے کر کولہے اور ٹانگ تک شدید ناقابلِ برداشت درد ہوتا ہے۔ یہ نسخہ جوڑوں سے متعلق تکالیف کا مؤثر علاج ہے۔ ہر قسم کے گٹھیا اور آرتھرائٹس میں انتہائی مفید ہے۔ درد، سوجن، کھنچاؤ کو دور کرتا اور جوڑوں کے اطراف کے بافتوں کو صحت مند بناتا ہے۔ عرق النساء کے شدید دردوں میں آرام کے لیے یہ نسخہ اپنا گہرا اثر دکھاتا ہے۔ یورک ایسڈ کی زیادتی دور کر کے سوجن اور درد کو دور کرتا ہے اور بڑھاپے میں ایک آرام دہ زندگی کا ضامن ثابت ہوتا ہے۔

نسخہ

اسگند	10 گرام
سورنجان شیریں	10 گرام
چوب چینی	10 گرام
قسطِ شیریں	10 گرام
زنجبیل	10 گرام
مغز بنولہ	10 گرام
تربد	10 گرام
ستاور	10 گرام
تخم حلبہ	10 گرام
چیتا لکڑی	10 گرام
ماہی زہرج	10 گرام
اذراقی مدبر	10 گرام

ترکیب: ان تمام اجزاء کا سفوف بنا کر صبح و شام ایک چائے کا چمچہ دودھ کے ساتھ کھائیں۔

☆☆☆

گلے کی خراش کے لیے

ٹھنڈی یا ترش اشیاء کے استعمال سے اکثر گلے میں خراش کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق گلے کی خراش دور کرنے کے لیے چکن یا فیل مرغ (ٹرکی) کا سوپ پینا ایک مجرب نسخہ ہے۔ یوں بھی سردی کا موسم ہے جس میں چکن کارن سوپ اور دیگر اقسام کے سوپ کا استعمال بڑھ جاتا ہے۔ خواتین کی صحت سے متعلق ایک مشہور برطانوی جریدے میں خواتین کو طبی مشورے دینے والے مشہور ڈاکٹر کرسٹیان جیسن کے مطابق چکن سوپ میں دافع سوزش خوبیاں ہوتی ہیں اور اس سے خون کے ان سفید خلیات کی نقل و حرکت کم کرنے میں مدد ملتی ہے جو گلے کی خراش کا سبب بنتے ہیں۔

متلی کے لیے

بعض لوگوں کو مختلف سواریوں مثلاً کار، بس یا ٹرین کے سفر سے ہول محسوس ہوتا ہے کیونکہ سواری کے چلنے سے ان کو چکر اور الٹی (Motion Sickness) آنے لگتی ہے۔ جو خواتین امید سے ہوتی ہیں، ان کو بھی صبح کے وقت متلی محسوس ہوتی ہے جسے Morning Sickness کہتے ہیں۔ اس قسم کی متلی کی شکایتوں کے ازالے کے لیے ادرک بہت مفید چیز ہے۔ ڈاکٹر کرسٹیان جیسن کا کہنا ہے کہ آپ ادرک کا ایک چھوٹا ٹکڑا چبا سکتے ہیں یا ادرک سے تیار شدہ بسکٹ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ جو لوگ بہت زیادہ کھانا کھانے کے بعد بے چینی یا متلی محسوس کریں وہ ادرک کے بجائے پودینے کو سادہ پانی یا سادی چائے کے ساتھ جوش دے کر پی لیں۔ اس سے ان کو افاقہ ہوگا۔

بیوٹی گائیڈ

آپ کے جانے پہچانے اسکن اسپیشلسٹ **ڈاکٹر خرم مشیر**

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

بہت پیارے قارئین! لیجیے موسم سرما رخصت ہونے کا زمانہ آ گیا۔ واہ کیا موسم ہے یہ بھی۔ مجھے تو سردیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ سردیوں میں جہاں ہمیں بہت پیارا موسم انجوائے کرنے کا موقع ملتا ہے وہیں ہماری اسکن پر بھی فوری طور پر اس موسم کے آنے اور جانے پر سے اثر پڑتا ہے۔

موسم سرما کی آمد اور رخصتی میں جلد کے مسائل کا سب سے زیادہ سامنا خواتین کو ہی کرنا پڑتا ہے، جن کی جلد سرد ہواؤں سے الرجی کا شکار ہو جاتی ہے اور یہ الرجی خشک جلد کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ خشک جلد قدرتی نمی سے محروم ہوتی ہے۔ سرد موسم سے مزید بے رونق، خشک اور سکڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان حالات میں چکنائی سے بھرپور کریم کا استعمال ہی فائدہ مند نہیں بلکہ اس ضمن میں علاج کے لیے مفید معلومات کا حصول بہت ضروری ہے تا کہ جلد کی نمی محفوظ رکھی جا سکے۔ موسم سرما میں خشک جلد پر سرخی مائل دانے نمودار ہونے لگتے ہیں۔ یہ دانے جلد کی گرد و غبار، نظام ہضم کی خرابی اور ہارمونز کی پیچیدگیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ موسم کے تبدیلی کے ساتھ غذائی عادت اور جلد کی صفائی کے طریقہ کار میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ مسائل سے نمٹنے کے لیے خشک جلد کی حامل خواتین کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

خشک جلد میں نہ صرف چکنائی بلکہ اہم جز "کولا جن" کی کمی بھی ہے، جلد کی اوپری سطح پر ظاہر ہونے والے دانے اسی قلت کی علامت بھی ہیں۔ یوں تو بازار میں کولا جن پر مشتمل کریمیں عام دستیاب ہیں۔ تاہم ان کے انتخاب میں یہ احتیاط بھی ضرور ذہن میں رکھیں کہ اس نوعیت کی کریم صرف خشک یا الرجی کی شکار جلد کے لیے ہی تیار کی گئی ہو۔ بصورت دیگر فائدے کے برعکس مختلف نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ ردعمل میں جلد پر جمنے والی خشک تہہ مسامات کو بند کر سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جلد کے ماہرین، موسم سرما میں بھاپ لینے کے عمل کو سب سے بہتر ٹوٹکا گردانتے ہیں۔ بھاپ کے بعد جلد نرم پڑ جاتی ہے۔ مسامات کھل جاتے ہیں جلد کی تہہ در تہہ صفائی نہایت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ گھریلو نسخے بھی جلد کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

خشک جلد کی صفائی کے لیے ایک چمچہ شہد، آٹھ قطرے حیاتین "ای"، ایک چمچہ خوبانی کی گری کا تیل ملا کر چہرے پر لگائیں تو قدرتی طور پر کچھ روز بعد جلد میں تبدیلی آتی ہے۔ یعنی جلد کے پرانے خلیات مردہ ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیات لے لیتے ہیں۔ اس لیے خشک جلد کے لیے مندرجہ بالا نسخہ

ہر دو سے تین ہفتے میں ایک بار ضرور آزمائیں۔
موسم سرما کی ٹھنڈی دھوپ ہماری صحت کے لیے بہت مفید ہے لیکن کیا یہ خشک جلد کے لیے بھی مفید ہے؟ ماہرین جلد کے مطابق دھوپ خشک جلد پر سیاہ نشانات کا سبب بنتی ہے۔ دھوپ کے مضر اثرات خشک جلد کو جھلسا دیتے ہیں اور جلد پر چھائیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایسی خواتین کا تناسب بہت زیادہ ہے جو صحت و صفائی کے حوالے سے معمولی تدابیر کو بھی اہمیت نہیں دیتیں۔ ویسے تو چھائیاں بننے کا یہ عمل خشک جلد میں مزید تیز ہو جاتا ہے۔ اگر جلد براہِ راست دھوپ سے متاثر ہوتی رہے، چاہے یہ موسم سرما کی دھوپ ہی کیوں نہ ہو۔

سن اسکرین

خشک جلد کے لیے سن اسکرین ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے الٹرا وائلٹ شعاعوں کی کچھ حدت زمین تک پہنچتی رہتی ہے جو جلد کے لیے زیادہ نقصان دہ نہیں لیکن اگر آپ کی جلد خشک ہے تو اس سے جھرّیاں پڑنے کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔
خشک جلد کے لیے ایسے سن اسکرین کا انتخاب کیجیے جن کی تیاری میں مائیکرو فائن زنک آکسائیڈ شامل کیا گیا ہو۔
یہ سن اسکرین جلد اور بیرونی ماحول کے درمیان ایک ڈھال کا کردار ادا کرتے ہیں۔ خشک ہوائیں، دھوپ اور گرد و غبار سے جلد کی نمی محفوظ رہتی ہے۔ بہت کم خواتین یہ جانتی ہیں کہ سورج کی شعاعیں جلد پر انتہائی آہستگی سے اثر انداز ہو کر داغ دھبے کی شکل میں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ یہ شعاعیں نمی سے محروم جلد کی نچلی تہہ میں باآسانی سرایت کر جاتی ہیں۔ عمر کے ساتھ ہی مضر شعاعوں کے اثرات نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔
خشک جلد کی حامل خواتین سن بلاک کے حوالے سے یہ معلومات بھی ذہن میں رکھیں کہ بعض سن بلاک میں زیادہ کیمیائی اجزاء شامل کیے جاتے ہیں جس سے جلد سوزش زدہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے وہی سن اسکرین آزمائیں جو قدرتی اجزاء سے تیار شدہ ہوں جن میں حیاتین ''اے'' جلد کی خلیاتی نظام کی نشوونما کے لیے نہایت ضروری ہے۔

اسکرب

اسکرب جلد کو گہرائی سے صاف اور ملائم رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ خشک جلد کے لیے اسکرب کا روزانہ استعمال ضروری نہیں، تاہم ہر ہفتے اسکرب کے ذریعے صفائی کرنے کا فائدہ مند پہلو یہ ہے کہ اس سے جلد کی چکنائی پیدا کرنے والے مادے فعال ہو جاتے ہیں۔ اسکرب نقطوں کی شکل میں چہرے پر لگائیں اور ہلکے ہاتھوں سے دس منٹ تک مساج کریں۔ ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔
اگر آپ بازار میں دستیاب اسکرب کے بجائے قدرتی خالص اجزاء کا اسکرب استعمال کرنا چاہتی ہیں تو یہ گھر پر تیار کیا جاسکتا ہے۔ آپ کو صرف باورچی خانہ میں ایسی غذائی اجناس کے مفید اجزاء سے فائدہ اٹھانا ہے جو جلد کو گہرائی سے تازگی عطا کرتے ہیں۔
مٹر کے کچھ دانے لے کر انہیں دھوئیں۔ عرق گلاب، گلیسرین اور تھوڑی مقدار میں ہلدی شامل کر کے پیسٹ تیار کرلیں۔ یہ اسکرب خشک جلد کو انفیکشن سے محفوظ رکھے گا اور جلد نرم و ملائم رہے گی۔
ملتانی مٹی میں خالص زیتون کا تیل ملائیں۔ چند چمچے پودینے کا عرق شامل کیجیے۔ یہ ملتانی مٹی اسکرب دس منٹ تک جلد پر لگائیں رکھیں اور پھر نرمی سے چہرہ دھولیں۔

☆☆☆